فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت قرار پایا تو پھر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لکھنؤ کے انتخاب کے خاص اسباب آگے چل کر ہم وضاحت سے بیان کریں گے۔

فرخ آباد فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رندؔ جو نواب احمد خاں بنگش کے ایک معزز رکن دربار تھے خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی داں تھے، شعر وسخن میں انھوں نے میر سوزؔ سے اور جب مرزا سوداؔ دلی سے فرخ آباد آئے تھے تو ان سے بھی اصلاح لی تھی سوداؔ نے ان کی تعریف میں کچھ قصیدے بھی کہے ہیں کچھ دنوں بعد جب نواب موصوف کا خاندان برسر اقتدار نہ رہا تو شعر وشاعری کا چرچا بھی وہاں کم ہوگیا۔

عظیم آباد مہاراجہ شتاب رائے جو اس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے، شاعروں کے قدر دان اور خود بھی شاعر یکتا تھے ان کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیاؔ معاصر سوداؔ کے شاگرد تھے اور وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے اسی طرح اشرف علیخاں فغاںؔ بھی مہاراجہ موصوف کے دربار میں پہونچ گئے تھے اور ان کی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے میر باقر حزیںؔ شاگرد مرزا مظہر جانِ جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا اس سے معلوم ہوا کہ بہار میں شعرائے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر وسخن کا چرچا یہاں خوب تھا۔

مرشد آباد نواباں مرشد آباد نے بھی اسی طرح شعرائے دہلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اُن کی قدر دانی اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ قدرتؔ معاصر میر وسوداؔ مرشد آباد گئے اور آخرالذکر وہاں ۱۲۰۵ھ میں پیوند خاک ہوئے۔ مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلانے سے بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی مرشد آباد آئے تھے۔ یہ اس زمانہ کے مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے۔

ٹانڈہ ٹانڈہ جو آنولہ ضلع بریلی اور رام پور کے قریب واقع ہے، نواب محمد یار خاں متخلص بہ امیر کا قیام گاہ تھا۔ نواب صاحب نواب فیض اللہ خاں والی رام پور کے حقیقی چھوٹے بھائی

تھے اور خود بھی شاعر اور شعرا نواز تھے۔ انھوں نے پہلے میر سوز اور سودا کو بلوایا مگر جب وہ نہیں آئے تو قائم چاندپوری کو جو خواجہ میر درد و سودا کے شاگرد تھے طلب کیا اور ان کو دو سو روپیہ ماہوار دیتے تھے اور انھیں کے شاگرد بھی تھے۔ مصحفی۔ فدوی لاہوری۔ میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی اس دربار کے زلہ خوار رہ چکے ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال بمقام رام پور ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔

حیدر آباد پہلی مرتبہ شعرا اس ملک کی جانب کم متوجہ ہوئے اس وجہ سے کہ دُور و دراز کا سفر اور راستہ مرہٹوں اور پنڈاریوں کی غارت گری کی وجہ سے پُرخطر تھا مگر اس پر بھی کچھ باہمت لوگ پہونچ ہی گئے چنانچہ خواجہ احسن اللہ بیان شاگرد مظہر آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدرآباد پہونچے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں رحلت کی۔ ان کے ایک شاگرد راجے گلاب چند ہمدم نے "استاد از جہاں رفت" تاریخ کہی شاہ نصیر بھی متعدد بار حیدرآباد گئے تھے

فیض آباد و لکھنو انتخاب فیض آباد کے وجوہ:۔

(۱) دلی سے فیض آباد بہ نسبت دیگر مقامات مذکورہ کے قریب تر تھا۔

(۲) شعرا کی قدر وہاں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ ہوتی تھی۔

(۳) امۃ الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ شجاع الدولہ کی بیوی اور آصف الدولہ کی ماں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی لے پالک بیٹی تھیں ان کا وطن اصلی دہلی تھا اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دلی والوں سے کمال محبت اور ہمدردی تھی اور ان کے ساتھ علیٰ قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔

(۴) نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خانخاناں کی بیٹی منسوب تھیں اس وجہ سے لکھنو کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرا پیوند محبت نصیب ہو گیا تھا کچھ شعرا پر موقوف نہیں، دہلی کے تجار، ارباب حرفہ و پیشہ، ارباب نشاط، غرضکہ ہر جماعت اور پیشہ کے لوگ فیض آباد میں بکثرت موجود تھے مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی داد و دہش کا

شہرہ سن کر آدھی دہلی ادھر کھینچ کر آ گئی تھی۔ برخلاف اس کے ریاستہائے نظام وٹیپو سلطان اور کرناٹک اور مرشد آباد دلّی سے بہت دور تھے پس کوئی تعجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا مجمع ہو گیا ہو۔ پھر جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اسکو اپنا مستقل دارالحکومت بنا لیا تو یہ ساری محفل وہاں سے اٹھ کر لکھنؤ چلی آئی چنانچہ اسی زمانہ میں یا اس کے قریب قریب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ پہونچ گئے تھے یعنی مرزا سودا، میر تقی میر، جعفر مرزا محمد تقی خاں ترقی شاگرد میر سوز، طالب علی خاں عیشی شاگرد قتیل، جعفر علی حسرت بقاء اللہ خاں بقا۔ میر حسن۔ میر ولی اللہ محب شاگرد سودا۔ میر حیدر علی حیراں شاگرد سرب سنگھ دیوانہ میر ضاحک، میرزا فاخر مکین، میرزا غلام حسین برشتہ شاگرد میر ضیار، فغاں، قائم مصحفی، انشا، جرأت، رنگین، قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر (جو ہوگلی کے رہنے والے تھے) ان کے علاوہ دیگر شعرا بھی مختلف اوقات میں دہلی سے لکھنؤ آتے اور لکھنؤ کی صحبت شعر و سخن کو گرماتے رہے نیز مرزا جوان بخت ولیعہد شاہ عالم جو تھوڑے دنوں لکھنؤ رہ کر بنارس چلے گئے اور مرزا سلیمان شکوہ، مرزا جوان بخت کے چھوٹے بھائی جو بعد کو آئے اور بڑے تزک و احتشام سے لکھنؤ میں رہتے تھے ان کی وجہ سے بھی شعر و شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ عنادل خوش الحان سخن کے دلکش ترانوں اور پرلطف نوا سنجیوں سے معمور اور مست ہو رہا ہے

شعرائے دہلی و لکھنؤ کا دوسرے مقامات پر منتشر ہو جانا

طرز لکھنؤ کو نقصان پہونچانے والی پہلی ضرب انتزاع سلطنت اودھ کو سمجھنا چاہیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ اسی کے ساتھ دوسری ضرب کاری جس نے ہماری اردو شاعری کو سخت نقصان پہونچایا۔ غدر ۱۸۵۷ء اور دہلی اور لکھنؤ کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوئی اس وجہ سے کہ یہی دونوں شہر بغاوت اور نیز انتقام بغاوت دونوں چیزوں کے بڑے مرکز تھے۔ بہادر شاہ کو مجرم ٹھہرا کر اور قید کر کے ہندوستان سے باہر بھیج دیا۔ قلعہ معلی کے رہنے والے جو اب تک

شعراء دہلی کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گئے۔ شعر و سخن کا کیا خاک خیال آتا جب جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ انھیں اسباب سے اور اسی حالت میں لکھنو اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اکثروں نے رام پور کا رخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنو سے قریب تھا پھر وہاں کے والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدردان اور مربّی تھے کچھ لوگ حیدرآباد پہونچے کچھ اطراف و جوانب کی ہندوستانی ریاستوں۔ مثلاً الور، جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے اسلامی ریاستوں یعنی ٹونک، بھوپال، منگرول (کاٹھیاوار) مالیر کوٹلہ اور بھاولپور نے بھی اکثر خانماں برباد شاعروں کو اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ کچھ تو یہاں کے درباروں میں نوکر ہو گئے کچھ ان ریاستوں میں رہ کر وہاں کے والیان ملک کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہونے لگے مختصر یہ کہ رام پور اور حیدرآباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے جنھوں نے ان خستہ اور دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ لہذا ان دو مقامات کے شعرا کا کچھ حال ہم اسی باب آگے کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ الور نے بھی جہاں کے حکمران مہاراجہ شیو دھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے ظہیر، تصویر، تشنہ شاگردان ذوق اور میر مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی مہاراجہ موصوف نے مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانہ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلایا تھا اسیطرح ظہیر اور ان کے لنکے چھوٹے بھائی انور جے پور چلے گئے اور آخرالذکر کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ ارشد گورگانی مالیر کوٹلہ اور بھاولپور میں رہے۔ ٹونک منگرول اور بھوپال کا علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔

ٹونک | والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے اور اپنے پدر بزرگوار نواب محمد علی خان کی معزولی کے بعد ۱۸۹۶ء میں مسند آرائے حکومت ہوئے یہ شاعر ہیں اور خلیل تخلص فرماتے ہیں۔ پہلے بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی کے شاگرد تھے ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مضطر خیرآبادی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ ان کے دربار میں اور بھی

بہت سے شاعر تھے جن میں ظہیر اور نواب سلیمان خاں متخلص بہ اسد زیادہ مشہور ہیں اسد میر ظفر علی اسیر کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے ان کو خاص طور پر ٹونک طلب کیا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد وہاں موجود ہیں۔ مثلاً اصغر علی خاں آبرو حبیب اللہ ضبط عبدالرحیم خان شرف۔ خواجہ سید کرامت علی خلش داغ کے شاگرد تھے انھوں نے اپنے بعد ایک غیر مطبوع دیوان اور بہت سے شاگرد چھوڑے اور ۱۹۰۶ سنہ عیسوی میں انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی شاعر ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کے قدم بقدم چلتے ہیں۔

منگرول کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے اور دور و دراز مقام میں بھی اُردو شاعری کا خوب چرچا ہوا۔ جس کی وجہ والی ریاست نواب حسین میاں بہادر کی توجہ اور قدردانی کہی جاسکتی ہے۔ ان بزرگوار نے لکھنؤ اور دلی کے اس وقت کے اکثر نامور شاعروں کو اپنی ریاست میں یکے بعد دیگرے طلب کیا تھا چنانچہ داغ تسلیم۔ جلال اور شمشاد جو ناسخ کے مشہور شاگرد اور لکھنؤ میں استاد مانے جاتے تھے اس قدر دان سخن کی فیاضیوں سے وقتاً فوقتاً بہرہ یاب ہوتے رہے۔ مقام کی دوری اور آب و ہوا کی ناسازگاری کی وجہ سے ان لوگوں نے وہاں قیام تو زیادہ نہیں کیا مگر اکثر ان میں کے ریاست سے ماہانہ تنخواہ پاتے رہے جو ان کو ان کے مکان پر برابر بھیج دی جاتی تھی۔

بھوپال فرماں روائے ریاست[1] ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ بالقابہا اپنی ریاست کیا تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بے حد دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ مسلم یونیورسٹی اور اسی طرح کی دیگر تعلیم گاہوں کے قیام میں انھوں نے ہمیشہ بہت بڑی فراخدلی سے حصہ لیا ہے اور شاہانہ عطیے ان کو عنایت کئے ہیں۔ خود بھوپال میں صدہا اسکول اور مدارس ان کے عہد مبارک میں اور ریاست ہی کے

---

[1] موجودہ فرماں روائے ریاست ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ ہیں ۱۲۔

روپیہ سے قائم ہوئے جو ہمیشہ ان کی علم دوستی اور ہنرپروری کی یادگار رہیں گے۔
آپ مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنف ہیں بہت سے قابل ابنائے وطن کو جو نا سازگاری زمانہ کی وجہ سے اپنے علمی کارناموں کو شائع نہ کر سکے آپ کی ذات سے بہت بڑی مدد پہونچی ہے۔ سیرت نبوی کی تکمیل کے واسطے جس کا بہت بڑا حصہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تیار کر دیا تھا اب تک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اُردو میں شیریں اور بعد کو تاجور اور فارسی میں شاہجہاں تخلص کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنا عقد ثانی نواب صدیق حسن خاں صاحب سے کر لیا تھا نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل اور اپنے زمانہ کے ایک مشہور محدث اور مفسر سمجھے جاتے تھے۔ مفتی آزردہ کے شاگرد تھے اور تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابوں کے مصنف تھے شعرا اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے اُردو میں توفیق اور فارسی اور عربی میں نواب تخلص کرتے تھے نواب شاہجہاں بیگم کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولت تخلص کرتے تھے انکا دیوان چھپ گیا ہے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوش گو شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔

چونکہ ترقی شاعری کے آخری عہد میں رام پور و حیدرآباد نے شعرا کے اجتماع اور قدردانی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے لہذا ان کا حال اختصار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

رام پور ہمارے نزدیک اس امر کی کہ رام پور میں بہ مقابلہ اور شہروں کے شعرا کا مجمع خاص طور پر زیادہ ہوا تین وجہیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ وہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان اور ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے دوسرے یہ کہ فرمانروایان ریاست

نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکان والی رامپور

جناب نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیان

خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعرا کے قدردان تھے اور شعراء کی محنت و جگر کاوی کے بدلے ہمیشہ ان کو بیش بہا انعامات و وظائف سے سرفراز کرتے رہتے تھے تیسرے یہ کہ وہ علماء و ادباء اور شعراء کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان سے مساویانہ برتاؤ کرتے اور اکثر ان کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے۔ ان کا دربار اسی قسم کے اہل علم و فضل کا مجمع تھا اور نواب صاحب خود ان کی دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے اسی وجہ سے وہ لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی اوّل تو رامپور سے نکلنا ہی نہیں چاہتے اور اگر جاتے بھی تو ہمیشہ رامپور کو یاد کرتے رہتے تھے۔

نواب یوسف علی خاں

نواب یوسف علی خاں خلف نواب محمد سعید خاں بڑے علم دوست ہنر پرور اور شعراء کے مربّی رئیس تھے خود بھی شاعر تھے اور اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے اردو میں ناظم تخلّص کرتے تھے صاحب دیوان تھے ابتدا میں حکیم مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد مرزا نوشہ غالب پھر میر مظفر علی اسیر کو کلام دکھلانے لگے دلّی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد جو شاعر وہاں سے نکلے اُن کو رامپور ہی میں جگہ ملی تھی مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مرزا غالب۔ میر حسین تسکین۔ میر مظفر علی اسیر اور بہت سے علماء و شعرا ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کرکے اُردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ان کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علیخاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی

نواب کلب علی خاں سنہ ۱۲۵۰ھ تا سنہ ۱۳۰۴ھ

نواب کلب علی خاں کے عہد میں جو سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق سنہ ۱۸۶۵ء میں اپنے والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مسند نشیں ہوئے اُردو شاعری نے رامپور میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ برخلاف فریڈرک اعظم بادشاہ جرمنی کے جو اپنے زمانہ میں کل بادشاہان یورپ میں علم و ہنر کا بڑا مُربّی اور قدردان سمجھا جاتا تھا نواب صاحب

موصوف بڑے سخی اور فیاض تھے اور ہمیشہ انعام و اکرام سے شعرا کی قدر افزائی کرتے تھے
انکا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے انھوں نے اپنی
دانشمندی قدردانی اور مردم شناسی سے اپنی چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل کمال اور
ارباب فن کو جمع کر لیا تھا جس کی نظیر ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں ملتی تھی اس
ریاست میں اس وقت کے بہتر سے بہتر حکماء کامل نثار، شعراء، خوشنویس یہاں تک کہ ہر ایک
حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال مثلاً چوبدار، باورچی، رکابدار وغیرہ سب موجود تھے
علماء کے گروہ میں علامہ عبد الحق خیر آبادی، علامۂ عبد الحق مہندس، مولانا ارشاد حسین
سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ وغیرہ، حکما اور اطبا کے طبقہ میں حکیم محمد ابراہیم اور
ان کے صاحبزادے حکیم عبد العلی حکیم علی حسین اور حکیم احمد رضا و حکیم حسین رضا وغیرہ تھے
شعرا کی جماعت بہت زبردست تھی۔ یوں تو اور بہت سے تھے مگر مشہور لوگوں میں یہ
حضرات زیادہ نامور ہیں۔ میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر۔ امیر۔ داغ۔ جلال۔ تسلیم
منیر۔ قلق۔ عروج۔ حیا۔ جان صاحب۔ آغا جو شرف شاگرد آتش۔ انس شاگرد ناسخ۔ شاغل
شاداں۔ غنی۔ ضیا۔ خواجہ محمد بشیر۔ منصور۔ رضا وغیرہ۔ ان مشاہیر کے علاوہ اور سیکڑوں
قابل اور لائق شخص پڑے ہوئے تھے جن کی پرورش اور قدردانی ریاست کرتی تھی مقرب
لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مکان مخصوص تھا۔ جو مصاحب منزل کے نام سے
مشہور تھا مگر باوجود ان اخراجات شاہانہ کے اسراف کا الزام ریاست پر عائد نہیں ہوتا تھا
کیونکہ یہ جتنے لوگ تھے۔ سوائے مولانا ارشاد حسین۔ مولوی عبد الحق اور منشی امیر احمد مینائی
کے کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی۔ علاوہ اس کے کسی کو مفت اور فضول تنخواہ
نہیں ملتی تھی اور یہ سب لوگ ریاست کے مختلف کاموں پر باعتبار اپنی قابلیت اور سن کے
مقرر تھے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب اپنے تمام ملازمین سے قطع نظر انعام و اکرام
کے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ عید بقر عید اور اکثر خوشی کے موقعوں پر

تمام معزز اور مقرب لوگوں کو خلعت اور انعام سے سرفراز فرماتے اور جن سے زیادہ خصوصیت ہوتی ان کی خبر گیری خاص طور پر فرماتے ۔ قرض داروں کا قرض ادا کر دیتے اور مختلف طریقوں سے ان کو رہین منّت کرتے تھے ۔

نواب کلب علی خاں نے درسیات معقول و منقول مولانا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی تھیں پہلے انھوں نے اُردو فارسی نثر لکھنے کی مزاولت کی ۔ اور اکثر کتابیں تصنیف کیں منجملہ جن کے بلبل نغمہ سنج ۔ ترانۂ غم ۔ قندیل حرم اور شگوفہ خسروی زیادہ مشہور ہیں ۔ فارسی میں ان کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے ۔ اردو میں اپنا کلام امیر مینائی کو دکھاتے اور اور انھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور چار دیواں ان کی یادگار اور ان کی اعلیٰ قابلیت کے نمونے ہیں ۔ نشید خسروانی ۔ دستنبوئے خاقانی درۃ الانتخاب ۔ اور توقیع سخن نواب صاحب نوابؔ تخلص کرتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے ۔ ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے ان کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے ۔ جن میں بحرؔ ۔ تسلیمؔ ۔ جلالؔ ۔ امیرؔ ۔ اور منیرؔ وغیرہ ، جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے ، نمایاں حصہ لیتے تھے ۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے ۔

اس اجتماع شعرا کا یہ نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ اس کی وجہ سے دلّی اور لکھنؤ کے مختلف طرز آپس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی جس کی ابتدا نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی یہ اُردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس کی طرف کافی توجہ اب تک منعطف نہیں ہوئی ہے ۔ ناسخ کا طرز ان کے شاگردوں کے زمانہ میں جو کہ اپنے استاد کی استادانہ روش کو قائم نہ رکھ سکے تھے بد سے بدتر ہو گیا تھا ان لوگوں کے کلام میں اُس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے مگر خوبیاں مفقود تھیں اس طرز کے برتنے والے رامپور میں بحرؔ منیرؔ ۔ قلقؔ اور اسیرؔ تھے برخلاف اس کے طرز دلّی کے پیرو داغؔ

و تسلیم تھے۔ داغ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر انھوں نے ایک ایسا دلکش طرز اختیار کیا تھا جس میں جرأت کا کچھ رنگ ملتا جلتا تھا۔ ان میں اور لکھنو والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کے اشعار بہت مقبول ہوئے ہر شخص ان کے رنگ کا دلدادہ تھا تسلیم گو کہ لکھنو کے تھے مگر رنگ بالکل دلّی کا اختیار کیا تھا۔ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جو مومن کے شاگرد تھے نسیم کے طرز کی کیفیت ہم ان کے حالات میں مفصل بیان کر چکے ہیں ان کے شاگرد تسلیم پر ناسخ کے رنگ کا جادو کبھی نہ چلا وہ اس کو ہمیشہ بُرا سمجھتے رہے اور جہاں کہیں رہے اپنے اُستاد اور استاد الاستاد یعنی نسیم اور مومن کی پیروی کرتے رہے۔ مومن اور غالب تھوڑے عرصہ تک رامپور میں رہے تھے اس وجہ سے انکا اثر کچھ زیادہ نہ پڑ سکا اور میر حسین تسکین کوئی ایسے بلند مرتبہ شخص نہ تھے کہ اپنا اثر اپنے وقت کی زبان اور شاعری پر ڈالتے مختصر یہ کہ یہ دونوں اسکول یعنی لکھنو اور دلی آپس میں لڑتے جھگڑتے اور مباحثہ کرتے رہے جس کا نتیجہ شاعری کے لئے عموماً اچھا ہوا یعنی ناسخ کے زمانہ سے جو ایک بے جا لفّاظی اور تصنع کا شوق داخل زبان ہو گیا تھا وہ جاتا رہا یا کم سے کم اس کو شدید نقصان پہونچا۔ اور اسی کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ مبارک نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار اور اہل دہلی کی مایۂ ناز تھیں رخصت ہو گئیں اب لوگ شاعری کے نتیجہ جذبات اور ان کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے۔ لکھنو کے طرز قدیم کے شیدائوں نے دیکھ لیا کہ اب اس جدید رنگ کے سامنے ان کا رنگ نہیں جم سکتا مجبوراً ان کو طرز دہلی کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ داغ کو مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی جیسا کہ ہم ابھی اوپر کہہ چکے ہیں۔ لہذا ان کے معاصرین کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پبلک کی پسند کا اتباع کرتے ہوئے وہی طرز اختیار کریں۔ چنانچہ امیر جو داغ کے بڑے حریف اور ہم مقابل تھے ان کو بھی اس عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اسی وجہ سے ان کا دوسرا دیوان یعنی "صنم خانۂ عشق" داغ کے رنگ میں ہے گو کہ کہیں کہیں اپنے خاص رنگ میں

بھی کہہ جاتے ہیں اسی طرح انھوں نے "جوہر انتخاب" اور "گوہر انتخاب" ایک میر اور دوسرا خواجہ میر درد کے رنگ میں کہہ کر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ دلی کے رنگ کو لکھنو پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاگردانِ امیر علی الخصوص ریاض جلیل اور حفیظ نے ایک قدم اور بڑھایا بلکہ ان کے اکثر اشعار تو ایسے ہیں جو داغ اور شاگردان داغ کے کلام سے علیحدہ نہیں کئے جاسکتے یہی حال جلال کا بھی سمجھنا چاہیئے۔ جلال، رشک اور برق کے شاگرد تھے اور انکی نشو ونما بالکل لکھنو کے طرز پر ہوئی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ انھوں نے بھی اس رنگ کو چھوڑ کر دلی کا رنگ اختیار کیا چنانچہ ان کا ایک دیوان بالکل اسی رنگ کا ہے اور اس میں انھوں نے میر کی بہت پیروی کی ہے مگر ہمارے اس لکھنے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امیر و جلال بالکل اپنے رنگ کو بھول گئے تھے البتہ ایک بڑی حد تک اس کی پیروی کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں قدیم رنگ کا خاتمہ اس وقت ہوا جبکہ انجمن معیار لکھنؤ میں قائم ہوئی جس کے ماہواری رسالے اور اس کی تحقیقات نے طرز قدیم کو لوگوں کے دل سے محو کر دیا۔

موجودہ فرمانروائے رامپور موجودہ فرمانروائے رامپور یعنی ہز ہائینس نواب سید حامد علیخاں صاحب بہادر بجمیع القابہ ایک نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مثل اپنے اسلاف کرام کے نہایت اعلی درجہ کے شاعر اور سخن فہم اور شعراء کے مربی اور سرپرست ہیں ان کے زمانہ میں بھی شعرا اور ہر قسم کے باکمالوں کا رامپور میں مجمع رہتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ ان کے جود وسخا سے بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ کی تمام قومی درس گاہیں اور مفید تحریکیں ان کے فیوض نامتناہی سے فیضیاب ہوتی رہتی ہیں۔

امیر مینائی ۱۲۴۴ھ لغایت ۱۳۱۸ھ منشی امیر احمد مینائی امیر تخلص خلف مولوی کرم محمد ۱۸۲۸ء میں بعہد نصیر الدین حیدر لکھنو میں پیدا ہوئے حضرت مخدوم شاہ مینا کے جن کا مزار لکھنو میں مرجع خاص و عام ہے، خاندان میں ہیں اسی تعلق سے مینائی کہلاتے ہیں درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہمعصر علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں اور عربی و فارسی

ہیں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ منشی صاحب اپنی ذات سے بڑے منکسر المزاج صاحب زہد و تقویٰ اور صوفی مشرب بزرگ تھے خاندان صابریہ چشتیہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے۔ طب جفر و نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ نہایت ذکی و طبّاع محنتی اور جفاکش تھے اسی وجہ سے اپنے معاصروں میں جس طرح اپنی وضعداری اور سادگی کی وجہ سے مشہور تھے اسی طرح اپنے علم و فضل اور کمال و قابلیت میں ان سے ممتاز تھے۔

شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا ان فن میں آپ کو منشی مظفر علی اسیر سے تلمذ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی اور طبیعت کی روانی سے اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے۔ ان کے وقت میں تمام فضائے لکھنؤ شاعری سے بھری ہوئی تھی شاگردان آتش و ناسخ کے منلقشے روزمرّہ کے مشاعرے جس میں شہر کے اساتذہ مثل صبا و خلیل و رند و سحر وغیرہ کے شرکت کرتے تھے، مراثی کے زور و شور اور انیس و دبیر کے معرکے غرضکہ ان تمام چیزوں نے ہونہار شاعر کی منچلی طبیعت پر بہت بڑا اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کی محنت و جانکاہی میں ایسی مشق سخن بہم پہونچائی اور اتنی شہرت حاصل کی کہ ۱۸۵۲ء میں ان کے اشعار کا تذکرہ سلطان عالم واجد علیشاہ کے دربار میں ہوا اور ان کو بلا کر اُن کا کلام سنا گیا اور حسب الحکم سلطانی دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور ہدایت السلطان" انھوں نے تصنیف کیں جن کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام عطا ہوا اسی وقت سے اُن کی شہرت کا زمانہ شروع ہوا جو برابر ترقی کرتا گیا۔ مگر الحاق اودھ اور غدر کی وجہ سے شعرائے دربار کے تمام حوصلے پست ہو گئے اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے بعد غدر امیر نے دوستوں کے کہنے سے سرکاری ملازمت کرنیکا ارادہ کیا تھا مگر جب عہدہ صدر امینی کے واسطے صاحب جج کو درخواست دینے کے متعلق ان سے کہا گیا تو اُن کو یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی اور ملازمت کا خیال ہی ترک کر دیا تھوڑے روز کی بیکاری اور خانہ نشینی کے بعد فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والی ریاست رامپور

نے اُن کو طلب کیا جو شعرا لکھنؤ و دہلی کے اس وقت بڑے سرپرست تھے نواب موصوف کے انتقال کے بعد خلد آشیاں نواب کلب علیخاں بہادر کا عہد حکومت آیا جس میں اُردو شاعری کو اور بھی فروغ ہوا ان سخن فہم اور رتبہ شناس رئیس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام ہندوستان کے نامی وگرامی شعرا اور باکمالوں کو بلا کر اپنے دامن دولت کے سایہ میں لے لیا تھا غرضکہ یہ زمانہ یعنی امیر کے قیام رامپور کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج کا زمانہ تھا اسی میں ان کو نواب کی استادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں ان کو بڑی عزت حاصل تھی اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل ستی سمجھے جاتے تھے تنخواہ بھی معقول تھی جس کی وجہ سے بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے غرضکہ ۴۳ برس رام پور میں نہایت عزت و آبرو سے بسر کر کے جس میں اکثر مرتبہ لکھنؤ بھی آنا ہوا تھا بالآخر حیدرآباد کو روانہ ہوئے وہاں جانے کی تقریب اس طرح ہوئی تھی کہ ۱۹۰۰ء میں جب نظام حیدرآباد کلکتہ سے واپس آرہے تھے تو راستہ میں بنارس میں بھی ٹھہرے، امیر نے ایک قصیدہ ان کی تعریف میں کہہ کر بمقام بنارس اُن کی حضور میں پیش کیا تھا حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا اور امیر سے حیدرآباد آنے کی فرمائش کی چنانچہ ۱۹۰۰ء میں وہ عازم حیدرآباد ہوئے یہاں تھوڑے دن قیام کیا تھا کہ بیمار ہوئے اور تہتر برس دس مہینے کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ علالت کے زمانہ میں داغ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار ان کی عیادت کو جاتے تھے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے جیسا کہ منشی صاحب کی اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے

رباعی

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدردم مرا	رشکِ دمِ عیسیٰ ہے دمِ سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری	درماں مرے حق میں ہو گیا درد مرا

داغ نے وفات کی یہ تاریخ کہی

وائے ویلا چل بسا دنیا سے وہ	جو مراہم فن تھا میرا ہم صفیر
مصطفےٰ آباد سے آیا دکن (رامپور[۱۲])	یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں	کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مبتلائے حدتِ صفرا و تپ	مورد آزار دا سہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب	درحقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ	شاعری میں خاص تلمیذ اسیر

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصر عالی پائے جنت میں امیر
۱۳۱۸ھ

تصانیف — امیر بہت پُر گو شاعر تھے اُن کی بعض نثر کی کتابیں اور ایک اُردو دیوان موسوم بہ "غیرت بہارستان" سنا جاتا ہے کہ زمانہ غدر میں تلف ہوگئے پھر دوسری آفت یہ آئی کہ ۱۸۹۵ء میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں ان کی اکثر تصانیف اور قیمتی کتابیں جل کر خاک ہوگئیں۔ موجودہ تصانیف میں جن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ان کے دو دیوان عاشقانہ۔ یعنی "مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق"، اور ایک نعتیہ اشعار میں موسوم بہ "محامد خاتم النبیین" اور نیز "امیر اللغات"، نہایت قابل قدر اور مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف ترتیب وار حسب ذیل ہیں:-

(۱) ارشاد السلطان (۲) ہدایت السلطان (۳) غیرت بہارستان اس میں وہ غزلیں ہیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں۔ نیز چند قصائد در مدح واجد علی شاہ۔ یہ کلام غدر میں تلف ہوگیا

(۴) نور تجلی (۵) ابر کرم۔ یہ دونوں مثنویاں بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی تھیں۔ (۶) ذکر شاہ انبیا بصورت مسدس مولود شریف ہے۔

(۷) صبح ازل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بیان میں۔
(۸) شام ابد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں۔
(۹) لیلۃ القدر معراج کے حال میں (۱۰) مجموعۂ واسوخت۔ چھ واسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل ہیں اور سنہ تصنیف ۱۲۰۴ھ ہے۔ یعنی "بانگ اضطرار" "واسوخت اُردو" "شکایات رنجش" "صفیر آتشبار" "حسد اغیار" "غبار طبع" اس مسدس کو ایک عمدہ دیباچہ کے ساتھ "مینائے سخن" کے نام سے دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے چھاپا ہے (۱۱) محامد خاتم النبیین۔ مؤلفہ ۱۲۸۹ھ نعتیہ دیوان ہے (۱۲) انتخاب یادگار۔ رام پور کے شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے جو نواب کلب علی خاں بہادر کے حکم سے ۱۲۹۰ھ میں لکھا تھا۔ جیساکہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے (۱۳) خیابان آفرینش نثر میں مولود شریف ہے (۱۴) مراۃ الغیب۔ اُردو غزلوں اور قصائد کا پہلا دیوان ہے (۱۵) صنم خانۂ عشق مطبوعہ ۱۳۱۳ھ (۱۶) جوہر انتخاب (۱۷) گوہر انتخاب۔ مؤلفہ ۱۳۰۱ھ یہ دونوں میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں۔ (۱۸) تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اس میں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں (۱۹) سرمۂ بصیرت۔ جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اُردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں اس میں اُن کا صحیح طریقہ استعمال مع اسناد کے بتایا ہے (۲۰) بہار ہند۔ ایک مختصر لغت اُردو محاورات و الفاظ کی جس کو امیر اللغات کا نقش اوّل کہنا چاہیئے (۲۱) امیر اللغات جس کو منشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیئے مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گئی۔ صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی اب تک تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں قابل مصنف کے تبحر اور جامعیت و نیز اُن کی بے حد کد و کاوش اور محنت و جانکاہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی دو جلدیں چھپ گئی ہیں اور تیسری بھی تیار تھی مگر شایع نہ ہو سکی۔ ابتدائً آٹھ جلدوں میں اس کے

نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اُس کے بڑے سرپرست ہز آنر سر الفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں نائب پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی رامپور نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی۔ منشی صاحب نے اپنے خطوط میں اس کتاب کا اکثر ذکر کیا ہے (۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و نثر میں۔ منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے اور منشی صاحب کو خط لکھنے کا بہت شوق تھا لہذا اُن کا مجموعۂ خطوط بہت دلچسپ ہے اس کو ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شایع کیا ہے ان خطوط سے منشی صاحب کے عادات و اطوار اور کیرکٹر پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو اُن کی سوانح عمری کا بہت عمدہ مواد اُن سے فراہم ہو سکتا ہے۔ نیز اُن میں فن نظم اور زبان کے متعلق اکثر مشکل مسائل کو حل کیا ہے" رسالہ اسرار نظم" اور "زاد الامیر" اور "مناجات" وغیرہ کو اُن کے متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیئے۔

شاگرد منشی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ناظم۔ نواب صفدر۔ جاہ۔ جلیل۔ ریاض۔ برہم۔ زاہد۔ کوثر خیر آبادی۔ وسیم۔ حیران۔ محسن کاکوروی۔ عابد۔ رضا۔ دل۔ قرار۔ ثاقب۔ اصغر۔ مضطر۔ سرشار۔ حفیظ جونپوری۔ آہ۔ اختر۔ قمر۔ ان میں ریاض۔ جلیل۔ مضطر اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

امیر کی شاعری امیر نہ صرف ایک طباع شاعر بلکہ ایک متبحر عالم بھی تھے۔ اور ادبی دُنیا میں ان کی شہرت انہیں دونوں باتوں پر مبنی ہے۔ ان کا پہلا مطبوعہ دیوان مراۃ الغیب کسی قدر ناہموار ہے۔ کیونکہ ابتدائی کلام کے ساتھ جو بھدا اور بے مزہ ہے بعد کی غزلیں جن سے مشاقی اور پختگی معلوم ہوتی ہے ملی جلی ہیں اُن کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لیے مخصوص ہیں۔ یعنی جا و بے جا رعایت لفظی ابتذال رکیک اور بدنما تشبیہیں۔ عورتوں کا لباس اور سامان زینت مثلاً انگیا کرتی۔ اور کنگھی چوٹی

وغیرہ۔ غرضکہ اس میں کوئی چیز نئی اور تخیل نہیں ہے بلکہ وہی پرانے فرسودہ مضامین ہیں جو الٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کیئے گئے ہیں۔ البتہ اُن کا دوسرا دیوان "صنمخانۂ عشق" اُن کے بڑے حریف اور معاصر داغ کے طرز پر ہے۔ اور اس میں اعلیٰ تخیل سلاست و روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔ اُن کے نعتیہ اشعار گو کہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اکثر اعلیٰ تخیل۔ فصاحت و بلاغت اور جوشِ اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں غرضکہ منشی صاحب کو مختلف اصناف سخن۔ غزل۔ قصیدہ رباعی۔ مخمس۔ مسدس وغیرہ پر عبور تام حاصل ہے اُن کا کلام اعلیٰ خیالات فصاحت بلاغت روانی و سلاست، توازن الفاظ اور ایجاز کے لیے مشہور ہے۔ حشو و زوائد اور صنائع بدائع لفظی کی کثرت سے اُن کا کلام پاک ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی، نزاکت خیال، بلند پروازی۔ شیرینی۔ زور اور قادر الکلامی بدرجہ احسن موجود ہے۔ تصوف کی چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب آموزی کی خاص پہچان ہے۔ اس قسم کے خیالات کسی ایک شاعر کی ملک خاص نہیں ہوتے بلکہ مختلف لوگوں کے کلام میں بہ تبدیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔

اخلاق و عادات منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے۔ شرم و حیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی۔ راستباز، ہمدردی سے بھرے ہوئے، نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا اور نہ کسی کی ہجو لکھی۔ سچے پاکباز۔ صوفی مشرب احکام قرآنی کے پورے عامل تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے تقدس اور بے ریائی کی شہرت لوگوں میں اُسی قدر تھی جس طرح اُن کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی۔ مزاج میں انکسار اور تواضع اس قدر تھی کہ اپنے معاصر حریفوں علی الخصوص داغ سے کبھی مسابقت کی کوشش نہیں کی بلکہ تمام اپنے ہمعصروں سے نہایت خلوص اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے

ادبی مسائل کا جو اُن سے پوچھے جاتے تھے نہایت آزادی سے جواب دیتے تھے۔ اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری کبھی نہیں کرتے تھے، اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے۔ قمر آرزو ضمیر۔ اختر جو خدمات زبان کی منشی صاحب نے انجام دیں اُس کا ذکر ہم امیر اللغات کے سلسلہ میں اوپر کر آئے ہیں۔ منشی صاحب ایک بہت قابل اور طبّاع شاعر تھے۔ اور اُن کے اکثر اشعار زبان زد خلائق ہیں۔ اُن کا مرتبہ شعرائے اُردو میں بہت بلند ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ | چند اشعار بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلے میں بطور سند کے لکھا تھا)

اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ
میلا بہت ہوا ہے اب اس پیرہن کو چھوڑ

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص
ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص

ترکش میں تیر میان میں شمشیر بے قرار
دیکھو تو بیقراریٔ نخچیر کے خواص

کہتا ہے شعر سُن کے کوئی واہ کوئی آہ
کچھ میرزا کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ
وگرنہ ربط کی اُس سے ہزار راہیں تھیں

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چُرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

ایک دل ہم دم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیرؔ
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا یہ روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

ملا جب وہ کھلا تب یہ معما
کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

جدا ہے دختِ رز کا نام ہر صحبت میں اے ساقی
پری ہے میکشوں میں حور ہے پرہیزگاروں میں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

نیم جاں کر کے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چپکے
ہاتھ اُٹھاتے بھی نہیں ہاتھ لگاتے بھی نہیں

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے
اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

آنکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں
وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

کیا تنگ ہے جلاد مری سختیٔ جاں سے
ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی

وائے قسمت جو سب کی سنتا ہے
وہ بھی عاشق کی التجا نہ سنے

باقی ہے امیر اب تو فقط جاں کا جانا
ہوش و خرد و تاب و تواں جا چکے کب کے

خودی سے بیخودی میں آ جو شوقِ حق پرستی ہو
جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل وہ ہستی ہے

بڑھ لے آہ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہنچی
بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اُٹھا رکھا ہے

ہم چلے دیر سے کعبہ کو تو وہ بت بولا
جا کے لے لیجیے کعبہ میں خدا رکھا ہے

انگور میں تھی یہ مئے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

نہ چوک وقت کو پاکر کہ ہے یہ وہ معشوق | کبھی اُمید نہیں جس سے جاکے آنے کی

داغ دہلوی ۱۸۳۱ء لغایت ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خاں داغ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ ہجری میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں، نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کے بھائی تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۲ھ میں ہوا جبکہ داغ تقریباً چھ سات برس کے ہونگے۔ دادا کا نام نواب احمد حسین خاں تھا والد کے انتقال کے بعد داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ کے ساتھ نکاح کرلیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ پہونچے جہاں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا بہت تھا، داغ کی سینچلی طبیعت پر اپنے گرد و پیش کا بڑا اثر ہوا اور یہ بھی شاعری کی مقناطیسی قوت کے اثر سے متاثر ہوگئے۔ چونکہ بادشاہ اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے یہ بھی اُستاد ذوق کے شاگرد ہو گئے اور انکے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور داد سخن لیتے رہے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم بھی کچھ حاصل کی تھی۔ چنانچہ فارسی مولوی غیاث الدین مؤلف غیاث اللغات اور مولوی احمد حسین صاحب سے پڑھتے تھے۔ خوشنویسی۔ شہسواری۔ بانک بنوٹ وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا۔ اور یہ فنون اُنھوں نے باقاعدہ اُستادوں سے حاصل کیے تھے۔ شعر کا شوق ان کو جبلّی تھا اور طبیعت چونکہ مناسب پائی تھی۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے پختہ کار شاعر ہوگئے ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو نے وفات پائی۔ مربّی باپ کا مرنا ان کے واسطے کیا کم مصیبت تھی کہ دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے نے اُن کے رہے سہے حواس اور کھو دیے اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی طرح دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوے جب کبھی قدر ہنگامہ فرو ہوا تو مع اہل خاندان کے رامپور آ گئے جہاں نواب یوسف علی خاں بہادر جو اُن کو پہلے سے جانتے تھے اُس وقت سریر آرائے حکومت تھے۔ داغ پہلی مرتبہ ولیعہد ریاست نواب کلب علی خاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوے اور داروغہ اصطبل کی خدمت

ان کے سپرد ہوئی۔ اس خدمت کو اُنھوں نے نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا تھا اور اس وقت سے اُن کو گھوڑوں سے اور شہسواری سے دلچسپی ہوگئی تھی داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال نواب کلب علی خاں بہادر کی ملازمت میں رام پور میں گزارے۔ جہاں نہایت عزت آبرو۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رام پور میں ان کو اس قدر آرام تھا کہ اُس کو آرام پور کہتے تھے۔ نواب کی ہمراہی میں حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے اُنھوں نے دلّی۔ لکھنؤ۔ پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ جہاں ان کی بڑی قدر ہوئی اور اُن کے واسطے مشاعرے منعقد کئے گئے۔ کلکتہ میں تین چار ماہ قیام کیا اور وہاں کے مشاعروں میں برابر شرکت کی اپنے قیام کلکتہ کا ذکر اُنھوں نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" میں کیا ہے ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کی بے ہنگام موت سے ان کی تمام آرزوؤں اور اُمیدوں پر پانی پھر گیا اُن کو بھی بعض اور لوگوں کی طرح جن کو اس مصیبت عظمیٰ سے نقصان پہونچا تھا۔ رام پور چھوڑنا پڑا چنانچہ وہ دلّی چلے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے نکلے اور راستے میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوے ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہنچے۔ راستے میں لاہور، امرتسر کشن کوٹ، آگرہ، علی گڈھ، متھرا، جے پور، اور ریاست منگرول واقع کاٹھیاواڑ میں ٹھہرتے ہوے اور تھوڑے تھوڑے دن قیام کرتے ہوے گئے تھے اور ان سب مقامات میں بیسیوں آدمی اُن کے شاگرد ہوے۔ پہلی مرتبہ اعلیحضرت حضور نظام سے بتوسط راجہ گردھاری پرشاد متخلص بہ باقی ملاقات ہوئی تھی مگر چونکہ کوئی صورت حسب مراد اُس وقت نہیں نکلی لہذا دلّی واپس آئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۰۸ھ میں سر آسمان جاہ بہادر کی طلبی اور حکم سے پھر حیدرآباد گئے اور اب کی مرتبہ قسمت نے یاوری کی اعلیحضرت (میر محبوب علی خاں) کے اُستاد مقرر ہوے اور بیش قرار تنخواہ اور انعام و اکرام کے علاوہ "مقرب السلطان بلبل ہندوستان جہاں اُستاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک" کا معزز خطاب عنایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عزت افزائی کے بعد داغ کی عمر حیدرآباد میں نہایت

کامیابی اور خوشی و خرمی سے گزرنے لگی۔ اُن کی تنخواہ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے مگر چند روز کے بعد ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ مقرر ہوگئے۔ جو بیش بہا صلے اور انعام واکرام تقریبوں کے موقع پر یا قصائد وغیرہ کے صلے میں ملتے تھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ حیدرآباد میں داغ کو دُنیاوی ثروت کا جس قدر عروج حاصل ہوا ہمارے خیال میں کسی اُردو شاعر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اس قدر عزت اور قدر و منزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہوگی۔ یہ ترقی ایسی نہ تھی کہ جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی چند لوگوں نے اعتراضات کرنا شروع کیے۔ ان میں ایک ڈاکٹر مائل حیدرآبادی بھی تھے۔ تھوڑے مقابلے کے بعد مخالفین کے منہ بند ہوگئے۔ داغ تقریباً اٹھارہ برس حیدرآباد میں رہے جہاں حضور نظام سے لے کر تمام امراء و رؤسا اُن کی عزت کرتے تھے اُن کی وجہ سے بازار شاعری جو شاہ نصیر کی وفات کے بعد کسی قدر سرد پڑ گیا تھا، پھر گرم ہوگیا۔ سیکڑوں شاگرد اُن کے حیدرآباد میں ہوگئے اور مشاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ داغ کے فروغ اور ترقی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست کے سیاسیات سے بالکل الگ رہے اور نہ کسی پارٹی یا جماعت کی سازشوں میں کبھی شریک ہوئے۔ اسی وجہ سے وہ وہاں بہت ہر دل عزیز اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے آخری زمانہ قیام حیدرآباد میں امیر مینائی بھی رام پور سے آگئے تھے۔ اور اُن ہی کے ساتھ رہتے تھے مگر قبل اس کے کہ حضور نظام کی حضوری حاصل ہو انتقال کر گئے۔ داغ بعارضۂ فالج ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔

عام عادات و اخلاق | نواب مرزا خاں داغ خوش طبع، رنگین مزاج، بذلہ سنج اور ہشاش بشاش تھے۔ مزاج میں خودداری تھی۔ خوشامد اور تملق سے دُور رہتے تھے۔ کثیر الاحباب تھے اور اپنے سب احباب کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اپنے معاصر شعرا مثلاً جلال، امیر، تسلیم، ظہیر وغیرہ سے اُن کے تعلقات بہت مخلصانہ اور

دوستانہ تھے۔ رقابت پیشہ کی وجہ سے کبھی دوستی اور ملاقات میں فرق نہیں آیا۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کبھی اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑے جھگڑے البتہ معاصرین سے کبھی کبھی شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ بڑے رسا اور اسرار ذرائع ترقی سے واقف تھے اور یہی بڑی وجہ دربار نظامت میں اُن کی ترقی کی تھی۔

داغ کی شاعری | داغ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے۔ اُن کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانکپن ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر، جلال، تسلیم وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اُن کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے متبعین کثرت سے ہیں۔ مشہور ہے کہ اُن کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے۔ یہی شہرت و عزت اور شاگردوں کی کثرت اُن کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے۔ داغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا جس کے کارکن بعض اُن کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بھی تھے۔ اس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔

تصانیف | چار[4] دیوان اُن سے یادگار ہیں۔ گلزار داغ[1] - آفتاب داغ[2] - مہتاب داغ[3] - یادگار داغ[4]۔ آخر الذکر یادگار داغ کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور یہ ضمیمہ اور اصل دیوان دونوں اُن کی وفات کے بعد شایع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ فریاد داغ بھی لکھی ہے۔ ان کے علاوہ چند قصائد حضور نظام اور نواب صاحب رامپور کی تعریف میں ایک پُرجوش شہر آشوب دلّی کی تباہی پر، اور چند قطعات و رباعیات بھی اُن سے یادگار ہیں "گلزار داغ" اور "آفتاب داغ" دونوں رامپور میں چھپے تھے اور ان میں زیادہ تر غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم و جلال وغیرہ کی ہم طرحی میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں اُن کی بے انتہا مشاقی اور نیز بڑی محنت و جانفشانی معلوم ہوتی ہے۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ دکن کی تصنیف ہیں ان میں

بھی کلام کی روانی اور فصاحت جو ان کا خاص انداز ہے، خاص طور پر قابلِ تعریف ہے
گلزار داغ جوانی کی تصنیف ہے۔ جب جذبات عشق و محبت محض خیالی نہ تھے بلکہ ذاتی تجربہ کا
آئینہ تھے۔ آفتاب داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جس میں واردات قلبیہ اور جذبات حقیقی
کی اصلی تصویریں شاندار الفاظ میں کھینچی گئی ہیں۔ مگر برخلاف ان کے مہتاب داغ اس زمانہ کی
تصنیف ہے جبکہ حرارت عشق و جوانی دھیمی اور ہلکی ہوکر ضیائے ماہتاب کے مانند نہایت
خوشگوار ہوگئی ہے اور شباب کی ولولہ انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں رخصت ہوکر اُن کی جگہ
کہولت کی پختہ کاری اور سکون و اطمینان نے لے لی ہے۔ مثنوی فریادِ داغ میں اپنے
عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی مُنّی بائی حجاب کے ساتھ اُن کو تھا اور جو رامپور
کا میلۂ بے نظیر دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اس
مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی اُنکی
قابل داد ہے علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں
بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے
گری ہوئی ہیں۔ قصائد میں اُن کا مرتبہ بہت کم ہے یعنی سودا اور ذوق وغیرہ سے تو کوئی
نسبت ہی نہیں ہمارے نزدیک امیر مینائی کے قصائد کو بھی وہ نہیں پہنچتے ان میں کسی طرح
کے بلند مضامین اور اعلیٰ تخئیل نہیں ہیں۔ غزل گوئی کا رنگ اُن پر غالب ہے اور اکثر
اشعار قصیدے کے نہیں بلکہ غزل کے معلوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعد قصیدہ گوئی کے
منافی ہیں۔ تشبیہ و استعارے میں بھی کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی
وہی عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے۔ اُن کی رباعیات کا بھی یہی حال ہے یعنی بجائے ادب و
اخلاق وغیرہ سکھانے کے اُن کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں البتہ تاریخیں بہت
اچھی اور اُستادانہ کہی ہیں۔

طرز کلام | داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے یعنی (۱) ان کی شہرت عام

(۲) اُن کا طرزِ خاص (۳) وہ خدمات جو اُنھوں نے زبان کے ساتھ انجام دی ہیں۔ داغ میٹھی، سریلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پیچیدہ اور کنجلک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو اُنھوں نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی اسی سے ان کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور معمولی۔ ترکیبیں سیدھی سادی اور درست۔ بندش نہایت چست۔ شعر کی ظاہری زیب و زینت یعنی صنائع بدائع کی کثرت اور دور از کار تشبیہوں اور مبالغہ اور حشو و زوائد سے بھی اُن کا کلام پاک ہے اشعار بالکل تُلے نپے زوردار اور مؤثر ہوتے ہیں کلام میں زندگی اور چونچالی پائی جاتی ہے ان کا کلام مختلف مضامین سے مملو اور غزل کے جس قدر موضوع ہیں اُن سب پر حاوی ہوتا ہے کہیں شوخ حاضر جوابی۔ کہیں ظریفانہ بذلہ سنجی، کہیں کسی واعظ پر چوٹ کی ہے کہیں کسی زاہد کی ڈاڑھی کھسوٹی ہے۔ کسی جگہ معاملہ بندی میں نیازِ عاشقانہ اور نازِ معشوقانہ کے بے مثل مرقعے کھینچے ہیں کسی مقام پر ہجر کی حرماں نصیبیوں کا ذکر ہے۔ کسی موقع پر رقیبوں کی عیّاریوں اور سازشوں کا بیان ہے غرضکہ اشعار کسی نہ کسی جذبۂ انسانی کے سچے فوٹو ہیں اور چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس اور عام فہم عبارت میں ہوتا ہے اس لئے وہ دلوں پر ہمیشہ تیر و نشتر کا کام دیتے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور رند کی صفائی ملی جُلی معلوم ہوتی ہے اور خوبی محاورہ اور لطافتِ زبان اُس پر طرّہ۔ اُن کا رنگ اُن کے زمانے میں اس قدر مقبول ہوا کہ سیکڑوں پیرو اور ناقل پیدا ہو گئے یہاں تک کہ اُن کے بڑے حریف مقابل منشی امیر احمد مینائی نے بھی اپنے دوسرے دیوان میں زیادہ تر اُن ہی کا رنگ اختیار کیا۔

کلام پر اعتراض زیادتی شہرت بعض وقت الزام و اعتراض کا باعث ہوتی ہے۔ داغ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے اشعار مہیج اور مخربِ اخلاق ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی زیادتی ہے اس وجہ سے کہ اُن کے

سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعرا ایسے نکلیں گے جن میں خیالات نہایت پاک وصاف اور بہت بلند ہیں۔ اُن کی ہر چیز کھوٹی نہیں ہے بلکہ اسی زر اندود کلام میں سونے کے ریزے بھی بہت ہیں۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے یہاں اصلیت (اور بجلی) اور متانت بہت کم ہے۔ فلسفہ اُن کے کلام میں مطلق نہیں نہ کسی اعلیٰ خیال کی شرح وبسط ہے فلسفہ حیات اور فلسفہ عشق سے وہ بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ جس عشق کا وہ بیان کرتے ہیں اس میں بھی کوئی عظمت کوئی سچائی اور حقیقی حسن کی جلوہ گری نہیں ہے۔ اُن کے معشوق اکثر معشوق بازاری ہیں جو اپنے حسن اور ناز و انداز کو سر راہ لے کر بیٹھتے ہیں۔ جن کا بوس وکنار اور اختلاط مثل اشیاء بازاری کے خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے بعض اشعار مہذب کانوں کے سننے کے لائق نہیں ہوتے اور صرف ایسی محفلوں میں گائے جاسکتے ہیں جہاں رندان قدح خوار جمع ہوں اور ارباب نشاط کے جھگھٹے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں عشق وعاشقی کے صرف سطحی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے قلب کے اندرونی پردے متاثر نہیں ہوتے اور نہ اُن کے سمجھنے میں جولانی خیال کا موقع ملتا ہے۔ داغ کے اشعار صرف ایسے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اُن میں میر کا ایسا درد واثر ہے نہ غالب کی سی معنی آفرینی ونازک خیالی۔ اُن کی تشبیہات بھی نادر اور عالی نہیں بلکہ وہی معمولی اور پامال تشبیہیں ہیں جن کو سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں۔ ان میں جدت اور ندرت مطلق نہیں۔ اُن کی مثنوی (فریاد داغ) میں تو ایک معشوق بازاری کے عشق کا حال ہے جس میں کوئی بلند "آئیڈیل" مطلق نہیں۔

مگر با ایں ہمہ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ضرور ہیں اور اُن کی زبان کے ساتھ اس خدمت کی ضرور قدر کرنا چاہیے کہ اُنھوں نے سخت اور مغلق الفاظ ترک کیے اور سیدھے سادے شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام کی بے ساختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔ یہ بھی اُن کا کمال ہے کہ طویل اور مشکل بحریں سُریلے اور میٹھے الفاظ میں لکھیں

ڈاکٹر سر محمد اقبال پی-ایچ-ڈی

چست اور برجستہ اور نہایت فصیح اور بے حشو و زوائد اشعار نکالے۔ غرض کہ ان ہی سب خوبیوں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُن کو اکثر مشہور و معروف لوگوں کی اُستادی کا فخر حاصل ہے ان کا مرتبہ شعرائے متاخرین میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں داغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بُلبُل کا ترانہ ہرگز

اقبال نے بھی ایک پُر زور مرثیہ اُن کی نسبت لکھا ہے۔ اُن کے حریف و معاصر امیر مینائی کا صحیح معنوں میں کوئی مد مقابل اگر ہے تو یہی ہیں۔

شاگرد | شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے جن میں سے چند نام جو بہت مشہور ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں:۔ اعلیٰحضرت حضور نظام حیدر آباد خلد آشیاں یعنی نواب میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ سائل دہلوی۔ بیخود دہلوی۔ احسن مارہروی۔ بیخود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نسیم بھرتپوری۔ جگر مراد آبادی۔ آغا شاعر دہلوی وغیرہم۔

امیر و داغ کا مقابلہ | یہ مقابلہ بھی اُسی قبیل سے سمجھنا چاہیئے جیسا کہ میر و مرزا کا مقابلہ اُن کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ امیر اور داغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں مسلّم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں۔ دونوں بزرگوار اپنے زمانے کے بہت بڑے غزّال تھے اور اکثر ہم طرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں نے ماشاء اللہ بکثرت شاگرد پائے اور دونوں کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے دونوں وسیع الاخلاق دوست پرست اور حلیم الطبع تھے۔ دونوں ذکی الطبع اور ذہین اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ داغ کو امیر پر اس معنی میں فوقیت ہے کہ دنیاوی جاہ و جلال اور مرفہ الحالی کے اعتبار سے اپنے آخر زمانہ میں وہ اُن سے بڑھ گئے۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کو امیر سے زیادہ شہرت بھی حاصل ہوئی داغ کا کلام مطبوع عام و پسندیدۂ انام ہے۔ جس طرح اُس سے عالم و فاضل اور شاعر محظوظ ہو سکتے ہیں اُسی طرح اُس کو پڑھ کر یا دوسرے سے سُن کر ایک عامی بھی اُس سے

لطف اُٹھاتا ہے۔ مگر صاحب ذوق جو قوت ممیزہ سے کام لیتے ہیں اور جن کو داغ کے سطحی اور معمولی اشعار پسند نہیں آتے اُن کو امیر ہی کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسمیں متانت و تہذیب کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے اور ضروریات شعریہ کو بھی پورا کرتا ہے۔ مگر اصل یہ ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ کلام کا فرق دراصل کلیم کا فرق ہے۔ خود شاعر کے مزاج ماحول اور افتاد طبیعت کو اُس کے کلام میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ داغ ایک بڑے زندہ دل رند مشرب شخص تھے اُن کا مزاج پارہ کی خاصیت رکھتا تھا پھر اُن کی نشو و نما دلی کی شاعرانہ فضا میں ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے منشی صاحب ایک مولوی منش تقدس مآب بزرگ تھے لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں عرصہ تک رہے۔ دامن سلطنت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اُس عہد کے شعرائے شاہی سے بھی گاڑھا دوستانہ رکھتے تھے۔ اسیر اُن کے اُستاد اور برق، صبا، بحر، قلق وغیرہ ان کے یار تھے۔ پس اُن لوگوں کے اثر اور نیز اُن کے طرز سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔ وہ اُس زمانہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی حالت اُن کی برابر رہی یہاں تک کہ قیام رامپور اور داغ وغیرہ کی صحبت نے اُن کا پُرانا رنگ ایک حد تک زائل کر دیا۔ منشی صاحب کا اوائلِ عمر کا جس قدر کلام ہے وہ ناسخ و شاگردان ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ چنانچہ اُن کا پہلا دیوان "مراۃ الغیب" اس دعوے کی بڑی دلیل ہے۔ اُس میں اگر کہیں کہیں عمدہ اشعار ملتے ہیں تو اُن کے ساتھ ہی ساتھ رکیک و مبتذل خیالات بھدی اور بے مزہ تشبیہیں، انگیا کرتی، کنگھی چوٹی وغیرہ نامناسب رعایت لفظی کی بھی بھرمار ہے۔ دیوان مذکور اگرچہ لائق مصنف کی اُستادی اور قدرت کلام کا پتہ دیتا ہے مگر پھر بھی ناہمواری مندرجۂ بالا سے مملو ہے۔ داغ کا رنگ اگرچہ دلی میں قائم ہوا مگر اُنھوں نے اُس میں کچھ جدت پیدا کر کے اپنا ایک خاص طرز بنا لیا۔ یعنی جرأت کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ سمو دیا اور اسی سے وہ چیز پیدا ہوگئی جو داغ کا طرز خاص کہلاتا ہے۔ یعنی روزمرہ اور زبان، محاورات کا برمحل استعمال

لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی دل نشینی، ان کے اشعار کا ظاہری یا خارجی حصہ تو
تو بہت اچھا ہوتا ہے مگر داخلی یا معنوی حصہ بہت سطحی ہے۔ اُن کا کلام لوگوں کو بہت پسند آیا
کیونکہ اُن کے مذاق کے موافق تھا اور یہی بہت بڑا راز ان کی شہرت و کامیابی کا ہے۔ منشی صاحب
نے داغ کے رنگ کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے مٹ جانے کے خیال سے اُنھیں کا رنگ اختیار
کیا اور ہر چند یہ صحیح ہے کہ اس تبدیلِ رنگ کی وجہ سے اُن کے مابعد کے کلام میں پیشتر سے
بہت زیادہ صفائی اور روانی پیدا ہوگئی مگر پھر بھی وہ داغ تک نہ پہونچ سکے بلکہ حقیقت یہ ہے
کہ اس معاملہ میں وہ اُن سے کم رہے۔ اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" "گلزارِ
داغ" سے، اگر وہ داغ کے طرز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت کم ہے۔ بہر حال یہ
اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منشی صاحب نے یہ کیا کم کمال کیا کہ اپنے طرزِ قدیم کو چھوڑ کر طرزِ جدید
میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کرلی۔

اگر ایک بلند نقطۂ نظر سے ان دونوں اُستادوں کی شاعری کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا
کہ وہ حقیقی شعریت اور آتشِ الہامی جو قدیم اُستادوں کے یہاں پائی جاتی ہے ان دونوں کے
یہاں بہت کم ہے۔ مگر باایں ہمہ اعتبار شکوہ الفاظ اور متانت اور نازک خیالی کے امیر کو داغ
پر فوقیت حاصل ہے۔ عروض اور ضروریاتِ شعری کے اعتبار سے امیر بہت بڑے اُستاد
تھے اُن کے کلام میں اس قسم کے سُقم شاذ و نادر ہی ملیں گے اور قصیدہ گوئی میں تو وہ داغ سے
یقیناً بہتر ہیں۔ داغ کو اس صنفِ خاص سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ گو کہ اُن کے معتقدین اس
بارہ میں بھی اُن کی افضلیت کے قائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک بہت بڑے غزل گو اور
ایک طرزِ خاص کے موجد تھے اور یہی اُن کی شہرت کا باعث کہا جاسکتا ہے۔ منشی صاحب
جامع الکمالات تھے۔ شاعر کے علاوہ وہ بہت بڑے نثار اور ناقد بھی تھے اور علمی قابلیت
تو داغ سے یقیناً بہت بڑھی رکھتے تھے "امیر اللغات" اور اُن کے وہ خطوط جن میں
اُنہوں نے اکثر نہایت پیچیدہ نکاتِ ادبیہ حل کیے ہیں انکی قابلیت اور تلاش کے شاہدِ عادل

قصیدہ میں وہ سودا اور ذوق کے ہم پلہ کہے جا سکتے ہیں۔ البتہ ظہیر دہلوی شاگرد ذوق اس صنف میں اُن کے قریب ہیں۔ ان دونوں میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ منشی صاحب کی شاعری ترقی کرتی رہی اور داغ کا رنگ آخر عمر میں کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ اُن کا بہترین زمانہ اُن کے قیام رامپور کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جب سے کہ وہ حیدرآباد گئے اور وہاں ثروت و عیش اُن کو نصیب ہوا شاعرانہ جگر کاوی اور محنت کے وہ عادی نہ رہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رُجحان مذاق ہے۔

داغ کا کلام اس قدر مقبول اور مشہور ہے کہ اُس کا کچھ انتخاب دینا ایک فعلِ عبث معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی چند اشعار بطور نمونہ کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اُن سے لُطف اُٹھائیں۔

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک — کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا — خانۂ عشق بے چراغ ہوا

ڈر گئے نام شفا سُن کے ترے خواہشِ مرگ — مُنھ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا — کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے — جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

کچھ آگئے داورِ محشر سے ہے اُمید مجھے — کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا

لطف فرما جو وہ رہتا تو کھٹکا ہی نہ تھا — عین حکمت تھی وہ کافر جو دل آزار رہا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ — ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

حضرت جلال لکھنوی مرحوم

منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی۔

وعدے پہ مرے اُنکے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

کل تاب فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
کیا کیا لبِ خاموش پہ قرباں ہے اثر آج

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

کیسا جواب حضرتِ دل دیکھیے ذرا
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

بظاہر رہنما ہیں اور دل میں بدگمانی ہے
ترے کوچے میں جو جاتا ہے آگے ہم بھی جاتے ہیں

جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مر جاؤ
جو غش آتا ہے مجھ پر تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مریضِ عشق کی کیا پوچھتے ہو یہ پوچھو
کہ زندہ کوئی بھی تیماردار باقی ہے

گرے ہوتے اُٹھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جلال لکھنوی
سنہ ۱۲۵۰ھ تا سنہ ۱۳۲۵ھ

حکیم سید ضامن علی جلال حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ میں سنہ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے کتب درسیہ فارسی و عربی سے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں فراغت حاصل کر کے اپنے آبائی پیشہ طبابت کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ زمانے کے رنگ کے موافق اُن کو شعر و سخن کا شوق بچپنے ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور کچھ دنوں بعد اس میں اس قدر محو ہو گئے کہ بجائے حکمت کے شاعری کو

اپنا مستقل فن قرار دیا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلال سے اصلاح لیتے تھے جب کلام میں
کچھ پختگی آگئی تو انھیں کے توسط سے اُنکے استاد رشک کے شاگرد ہو گئے۔ رشک اس زمانے
میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے وہ ناسخ کے بہت ممتاز شاگردوں میں تھے اور استاد اسقدر
ان کا خیال کرتے تھے کہ جو غزلیں اصلاح کے واسطے اُن کے پاس آتیں وہ اُنکو بہ نظر اصلاح
رشک کے حوالے کرتے۔ جب رشک سفر عراق پر روانہ ہونے لگے تو اُنھوں نے نوجوان جلال کو
نواب فتح الدولہ برق کے سپرد کیا جن کی شاعری کا اس زمانہ میں بڑا زور و شور تھا روزانہ
مشاعرے منعقد ہوتے جن میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت مثل بحر، سحر، اسیر، امیر، قلق وغیرہ
کے شریک ہوتے تھے۔ جلال بھی اِن مشاعروں میں بے تکلف جاتے اور استادوں کے کلام
کو سُنتے اور خود اپنی غزلیں سُناتے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے اِن صحبتوں کو درہم و برہم کر دیا اور
شعرا کو بجائے شعر کی تخییل کے اب اپنے پیٹ کا خیال پیدا ہوا اسی زمانہ میں اور انھیں
افکار کی بدولت جلال نے ایک دواخانہ شہر لکھنؤ میں ایک شخص بخشی نثار علی کے مکان میں
کھول لیا تھا جو ان کے والد کے دوستوں میں تھے اور شاعر بھی تھے مگر اس شغل میں بھی وہ
اپنی محبوب شاعری کو کبھی نہیں بھولے اور اس میں بھی اُس کی مشق برابر جاری رہی۔ بالآخر
نواب یوسف علی خاں والی رام پور کی قدر دانی نے اُن کو رامپور گھسیٹ بلایا جہاں اُن کے
والد داستان گویوں میں ملازم تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد جب نواب کا انتقال ہوا اور والی ریاست
نواب کلب علی خاں ہوے تو اُنھوں نے حکیم صاحب کو بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار ملازم رکھ
لیا۔ حکیم صاحب اپنی تنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کئی مرتبہ ملازمت سے کنارہ کش
ہوے مگر نواب صاحب کی قدردانیوں اور فیاضیوں نے کبھی ان کو رام پور سے ترک
تعلق نہ کرنے دیا۔ وہ تقریباً بیس سال رام پور میں رہے اور برابر مشاعروں میں شریک
ہوتے رہے جہاں اُن کے معاصر اور حریف نواب مرزا خاں داغ، منشی امیر اللہ تسلیم اور
منشی امیر احمد مینائی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے کے ان چار استادوں کی غزلیں

جو اکثر ہر طرح ہوتی تھیں خالی از لطف نہیں ہیں کیونکہ اُن سے تقابل کلام کا اور ہر ایک شاعر کا رنگ طبیعت دریافت کرنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال اور کونسل آف رجنیسی کے قائم ہونے سے یہ پُر لطف صحبتیں بھی قائم نہ رہ سکیں اور شعراء سب تتر بتر ہو گئے۔ حُسن اتفاق یہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست منگرول کاٹھیاوار کے رئیس با اختیار نواب حسین میاں نے جن کو شعر کی قدر دانی اور شعراء کی سرپرستی کا بڑا فخر حاصل ہے حکیم صاحب کو اپنے یہاں طلب کر لیا۔ مگر وہاں بوجہ دوری اور ناموافقت آب و ہوا وہ عرصہ تک نہ رہ سکے چند ہی دن میں اپنے وطن مالوف لکھنؤ میں واپس آ گئے جہاں نواب صاحب موصوف اُنکو پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار اور مبلغ ستو ۱۰۰ روپیہ ہر قصیدے کا صلہ جو وہ اُن کی خدمت میں بھیجتے تھے برابر عنایت کرتے رہے۔ آخر عمر میں حکیم صاحب کا سوائے شعر و شاعری اور اصلاح کے کوئی اور شغل نہ تھا۔ بعمر چھتر سال بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء انتقال کیا۔

| تصانیف | تصانیف حسب ذیل موجود ہیں۔

(۱) "چار دیوان"

(۲) "سرمایۂ زبان اُردو" جو محاورات و اصطلاحات زبان اُردو کی ایک مبسوط کتاب ہے

(۳) "افادۂ تاریخ" فن تاریخ گوئی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) "منتخب القواعد" اس میں اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے اور مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق کی ہے۔

(۵) و (۶) دو لغات زبان اُردو کے موسوم بہ "تنقیح اللغات" و "گلشن فیض"

(۷) "رسالہ دستور الفصحا" جو فن عروض پر ایک مختصر رسالہ ہے۔

(۸) "مفید الشعراء" ایک رسالہ در باب تحقیق تذکیر و تانیث۔

فہرست مذکورۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا اور مثل اپنے اُستاد رشک کے اُنھوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اُردو کے الفاظ و محاورات

واصطلاحات کے متعلق تصنیف کئے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کام کو رشک نے شروع کیا تھا اُس کو اُنھوں نے درجۂ تکمیل کو پہونچایا۔ ہرچند کہ اُنکی یہ تصانیف ایک ابتدائی صورت میں ہیں اور اُن کے بعد اب بڑی بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح وبسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں مگر پھر بھی جلال کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اُنکو بچپن سے حجت و تکرار اور بحث ومباحثہ کا شوق تھا چنانچہ اُس زمانے میں بھی وہ اساتذۂ وقت کے اسقام سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ بے تکلف اُن کی غلطیاں اُنکے منھ پر کہہ دیتے تھے۔ اور یہ عادت اُنکی آخر عمر تک باقی رہی اسی کی وجہ سے اُن سے اور اُن کے معاصرین سے معرکۃ الآرا مناظرے اور مباحثے اس معاملے میں ہوتے رہے۔

مزاج کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ جلال ایک مغرور و متکبّر اور ہمچومن دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ مشہور ہے کہ وہ اکثر مشاعروں میں صرف اس وجہ سے شرکت نہیں کرتے تھے کہ غرورِ سخن اُنکو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکابر شعرا تک سے ملنے میں اُنکو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی اُنھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تسلیم کے ایک شاگرد ظہیر احسن شوق نیموی نے دو کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلال کی خوب خبر لی گئی اور اُن کے کلام کی غلطیاں نکالی گئیں اور ان پر صدہا اعتراض وارد کیے گئے مگر حق یہ ہے کہ جلال اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور دوسروں کے کلام کی اصلاح بہت محنت اور محبت سے دیتے تھے۔

خصوصیات کلام جلال کو طرز لکھنؤ کا آخری متبع سمجھنا چاہیے۔ وہ قدیم اساتذۂ لکھنؤ کے قدم بقدم چلتے تھے اور اس شاہراہ عام سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے اُنکے متعدد دیوانوں میں کسی قسم کی دلآویزی اور خصوصیت اور مابہ الامتیاز کوئی شے نہیں ہے۔ البتہ زبان میں تصنع بہت کم اور بے عیب ہے چٹکتے ہوے اشعار کہیں کہیں نکلتے ہیں۔ مگر عام طور پر کلام بے نمک اور معمولی ہے

جذبات یا انعکاس کا اُس میں کہیں پتہ نہیں. خیال آفرینی کم ہے. اکثر وہی معمولی معمولی باتیں ہیں اور بعض اشعار تو اُن کی اُستادی کے درجہ سے بہت گرے ہوے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ کنگھی چوٹی اور عورتوں کی زیب و زینت کے مضامین جو قدیم طرز لکھنؤ کا مایۂ ناز تھے اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے. اس کے علاوہ صحت الفاظ کا بھی اُن کو بڑا خیال رہتا ہے اور کلام تعقید اور نامناسب الفاظ سے پاک ہوتا ہے. جلال اپنے آپ کو صحت الفاظ و محاورہ کا بادشاہ سمجھتے تھے بہت پُر گو تھے. اور شاید یہ پُر گوئی ہی بدمزگی کلام کا باعث ہو. مشہور ہے کہ بیس پچیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلوں کی تصنیف ان کا روزمرہ کا معمول تھا چنانچہ اُس زمانے کے گلدستے اُن کی اور اُن کے شاگردوں کی غزلوں سے بھرے رہتے تھے. مختصر یہ کہ وہ کلام کے بہت اچھے ناقد تھے اور اُردو کے دوسرے درجہ کے شعرا میں اُن کا پایہ بلند ہے.

شاگرد ان کے مشہور شاگردوں میں اشخاص ذیل قابل ذکر ہیں. یعنی خود ان کے بیٹے کمال جو ریاست رامپور میں ملازم تھے اور اب انتقال ہو گیا. میرزا ذاکر حسین یاس اور اُن کے صاحبزادے آرزو. احسان شاہجہان پوری اور سردار اودھم سنگھ.

آرزو سید انور حسین صاحب لکھنوی آرزو تخلص خلف سید ذاکر حسین یاس شل اپنے والد کے جلال کے شاگرد ہیں. لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں ہیں. اور کمال کے انتقال کے بعد جلال کے جانشین یہی سمجھے ہیں. پہلے اُمید تخلص کرتے تھے اب آرزو کرتے ہیں فن عروض میں ان کو پوری دستگاہ حاصل ہے اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں مرثیے بھی کہے ہیں اور اب ڈراما نویسی کا شوق ہے. گو کہ لکھنؤ کے باشندے ہیں مگر طرز دلی والوں کا ہے. آرزو کا کلام اُن کے اُستاد جلال کے رنگ کا بہت اچھا نمونہ ہے جبکہ اُنھوں نے اپنے طرز کو دلی کے رنگ میں سمو دیا تھا. ان کے کلام میں سادگی اور روانی اور حلاوت اور جذبات سب کچھ موجود ہے. موجودہ شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے ہیں

احسان | احسان علی خاں نام احسان تخلص قاسم علی خاں کے صاحبزادہ ہیں ۱۲۶۶ھ میں بمقام اوٹہ ضلع بریلی پیدا ہوئے اس کے بعد ان کے والدین شاہجہانپور چلے گئے جہاں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی سولہ برس کی عمر سے اُن کو شعر کہنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی کلام حافظ نثار احمد خاں تائب کو دکھاتے تھے ۱۸۸۰ء میں جلال کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں محکمۂ بندوبست گورکھپور میں سرکاری ملازمت پائی اور بعد کو قانون گوئی منصرمی اور پیشکاری کے عہدوں پر فائز ہوئے ۱۸۹۰ء میں ملازمت چھوڑ کر مختاری کا امتحان دیا اور شاہجہاں پور میں کام شروع کیا۔ ۱۸۹۶ء میں ایک گلدستہ موسوم بہ "گلدستہ ارمغاں" نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ ۱۸۹۳ء میں ان کا پہلا دیوان "خمکدہ خیال" چھپا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی اُن کی تصنیف سے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں منگرول اور وہاں سے حیدرآباد گئے تھے احسان ایک خوشگو شاعر ہیں مگر کوئی خصوصیت اُن کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔

تسلیم ۱۸۲۰ء تا ۱۹۱۱ء | قصر شاعری رام پور کے چوتھے رکن منشی امیر اللہ تسلیم تھے ۱۸۲۰ء میں بمقام منگلسی جو نواح فیض آباد میں ایک گانوں ہے پیدا ہوئے انکے والد مولوی عبد الصمد پہلے بدوسرائے میں جو دریا آباد کے قریب واقع ہے قیام کرتے تھے بعد کو فیض آباد چلے آئے اور وہیں توطن اختیار کیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ آ گئے اور محمد علی شاہ کے عہد میں صیغۂ فوج میں بمشاہرۂ تیس روپیہ ماہوار ملازمت کرلی۔ تسلیم بھی بچپنے میں اپنے ماں باپ کے ساتھ فوج میں داخل ہوئے تھے اور اُنکی علحدگی کے بعد اُنکے عہدے پر فائز ہوئے۔ فارسی و عربی کی تعلیم خود اپنے والد سے اور مولوی شہاب الدین اور مولوی سلامت اللہ رامپوری سے حاصل کی تھی۔ فن خوشنویسی[1] کے ایک اُستاد تھے اور مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں بمشاہرہ بیس روپیہ ماہوار ملازم تھے شعر و سخن میں وہ نسیم دہلوی

[1] راقم الحروف نے بھی فن خوشنویسی میں چند روز آپ سے استفاضہ کیا ہے ۱۲ مترجم

کے شاگرد تھے ۔ اور طرزِ دہلی کے تتبع پر بڑا فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں۔

مجھکو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض
میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیمِ دہلوی

تھوڑے عرصہ کے بعد واجد علی شاہ کے زمانہ میں جب اُن کی پلٹن توڑ دی گئی تو یہ بیکار ہو گئے
انھوں نے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر مقبول الدولہ مرزا
مہدی علی خاں قبول شاگرد ناسخ کی وساطت سے پیش کی ۔ بادشاہ نے دیکھا اور اس پر یہ حکم لکھا۔

ہر دو فن میکنی و ہر دو نکو
بشنو اے خوشنویس و اے خوش گو

بست و دہ روپیہ مقرر شد
اسم تو مندرج بہ دفتر شد

چنانچہ ان کا تیس روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اور شعرائے شاہی کے زمرہ میں یہ داخل ہو گئے
بعد انتزاع سلطنت یہ رامپور چلے گئے جہاں کچھ عرصہ تک نہ کوئی معقول ملازمت ملی اور
نہ مقبول شعراء کے حلقے میں داخل ہو سکے ۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک قصیدۂ مدحیہ نواب
کلب علی خاں کے حضور میں جو اُس وقت ولیعہد ریاست تھے پیش کرنے کا موقع ملا ۔ غدر کا
ہنگامہ فرو ہونے کے بعد تسلیم رامپور سے لکھنؤ واپس آئے اور یہاں اپنے بچھڑے ہوئے
اعزا سے ملے ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ منشی نولکشور کے مشہور مطبع میں جس کو قائم ہوئے
اُس وقت تھوڑا عرصہ گزرا تھا مصحح میں ملازم ہو گئے جہاں اُن کے اُستاد نسیم نے بھی کچھ
دنوں ملازمت کی تھی ۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں کی سرکار سے بھی دس روپیہ ماہوار
ان کو ملتے تھے اور نواب صاحب اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کو دکھاتے تھے ۔ جب ۱۸۷۵ء
میں نواب کلب علی خاں سریر آرائے ریاست تھے تو ان کے طلب فرمانے سے پھر رامپور گئے
اور اب کی مرتبہ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی جو بعد کو پچاس روپیہ تک بڑھا دی گئی اور
عہدۂ نظارت دیہکاری سے ترقی کر کے وہاں کے مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے ۔ نواب
صاحب موصوف کی رحلت کے بعد یہ پھر رامپور سے نکلے اور ٹونک ہوتے ہوئے منگرول پہنچے
جہاں کچھ دنوں قیام کر کے نواب عالی شان نواب سید حامد علی خاں بہادر والی رام پور

گئے طلب فرمانے سے پھر رام پور آگئے اس مرتبہ نواب صاحب نے ازراہ قدر دانی چالیس روپیہ ماہوار بطور پنشن مقرر کر دیے جو اُن کو آخر وقت تک ملتے رہے۔ تسلیم نے اکانوے برس اس دُنیائے ناپائدار کی سیر کر کے ۱۹۱۱ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

تصانیف | کہا جاتا ہے کہ اُن کا پہلا دیوان زمانۂ غدر میں ضائع ہو گیا۔ مطبوعہ دیوان ان کے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "نظم ارجمند" یہ لکھنؤ میں چھپا ہے اور اس میں قبل غدر کا بھی کچھ کلام اور اُنکی دو مثنویاں بھی ہیں (۲) "نظم دل افروز" مطبوعہ رامپور (۳) "دفتر خیال" ایضاً چوتھا دیوان ناتمام سُنا جاتا ہے کہ اُن کے کسی شاگرد کے پاس رام پور میں موجود ہے ان کے علاوہ مثنویاں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نالۂ تسلیم (۲) شام غریباں (۳) صبح خنداں (۴) دل و جان (۵) نغمۂ بلبل (۶) شوکت شاہجہانی (۷) گوہر انتخاب (۸) تاریخ رامپور ان کے علاوہ اُنھوں نے نواب صاحب رام پور بالقابہ کا سفرنامۂ یورپ منظوم لکھا ہے جسمیں تقریباً بیس پچیس ہزار شعر ہیں۔

انداز کلام | کلام نہایت سلیس بے تکلف ٹھوس اور زوردار ہے تمام اصناف سخن میں مثنوی سب سے اچھی ہے اور اس میں وہ اپنے ہمعصروں پر گوئے سبقت لے گئے ہیں اسی میں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ بعض قصیدے بھی بہت زوردار لکھے ہیں۔ غزلیں اکثر پُر معنی اور پُر لطف ہوتی ہیں اور ان کا پہلا دیوان "نظم ارجمند" ہماری رائے میں سب دیوانوں سے بہتر ہے۔ مگر پُر گوئی نے اُن کے ساتھ بھی وہی کیا جو دیگر شعرا کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی کلام کو پھیکا اور بے مزہ بنایا ہے۔ تسلیم تین باتوں کے واسطے مشہور ہیں۔ اپنی غزلوں اور مثنوی کے لیے دوسرے مومن کے تتبع کے واسطے۔ تیسرے اس وجہ سے کہ ہمارے زمانہ کے ذہین قابل شاعر حسرت موہانی کے وہ اُستاد ہیں۔

تسلیم نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مصیبتِ افلاس میں بسر کیا یہاں تک کہ بعض اوقات نقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اکثر اوقات اُن کے احباب اور اُن کے شاگرد اُن کی اعانت کرتے تھے اُن کی طویل عمر مصائب کی ایک طولانی داستان تھی جو آخر کار موت پر ختم ہوئی۔ مگر مفلسی اور پریشاں حالی نے اُن کے مزاج میں کسی قسم کا چڑچڑا پن اور غم و غصہ پیدا نہیں کیا تھا بلکہ برعکس اس کے وہ نہایت ملنسار اور قانع واقع ہوئے تھے۔ اور کسی مرفہ الحال ہم پیشہ شاعر پران کو رشک و حسد کبھی نہیں ہوا۔ تسلیم کے ساتھ قدیم رنگ کا خاتمہ ہوگیا۔

اُن کے شاگرد بہ کثرت ہیں جن میں مولانا حسرت موہانی مرحوم گیاوی۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صبر معروف بہ بلبل تسلیم بہت ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔ حسرت موہانی کا کچھ مختصر حال ہم آگے چل کر حصہ نثر میں لکھیں گے۔

چند چیدہ اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

ہائے کنج قفس میں گھبراؤں گا لے دستِ جنوں	اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا
نالہ کھنچا ہی، دل ہی خفا، شوق ہے اُداس	تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا
آبرو گر چاہتا ہے کنج خلوت کر قبول	قطرۂ نیساں صدف میں آکے گوہر ہوگیا
عمر بھر رشک عدو ساتھ تھا کہتا کیا حال	وہ ملا بھی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا
قطرۂ خوں بھی نہیں دل میں مرے	ہائے تم ہوگی زبان تیر کیا
کچھ کہہ دو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے	توڑو نہ آسرا دلِ اُمیدوار کا
تسلیم کس کے واسطے بیٹھے ہو گھر چلو	کیا اعتبار وعدۂ بے اعتبار کا
دل مرا تھا، گر گیا، گم ہوگیا، جاتا رہا	غم تمھیں کا ہے کا ہے جاتا رہا جاتا رہا
ڈھونڈھتا ہے روز و شب لیکر چراغ مہر و ماہ	کیا ترا اے آسمان بر جفا جاتا رہا
مرقد میں سفیدی جو کفن کی نظر آئی	سمجھا میں پسِ مرگ مرے ساتھ گئی دھوپ
اور ہیں، جن کو ہے شاگردی پہ لے تسلیم ناز	میں نسیم دہلوی کے کفش برداروں میں ہوں

واعظ خدا شناس نہ ہوگا تمام عمر
پسا ستم چرخ سے اُف تجھ سے نہ کرنا
ڈرانا ہے کیوں ہے لے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
گردش بخت دیکھ چکے اسے تسلیم
کرتے ہیں سجدے اس لیے دیر و حرم میں ہم
طفلی سے جو بُت شوخ ہو آفت کا بنا ہو
کعبے کا ارادہ کیسے نکلے تو ہیں گھر سے

اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں
یہ بات مرے دل میں ہے یا رنگ حنا میں
مرا حصّہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احساں میں
چل کے میخانہ میں اب گردش ساغر دیکھو
کیا جانیے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو
وہ فتنہ جوانی میں قیامت نہ ہو گیا ہو
آ جائے وہ بُت سامنے اس دم تو مزا ہو

عرش ضمیر الدین عرش۔ صوبہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی بندہ علی وکیل گیا کے صاحبزادہ ہیں۔ ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے کے بعد انہوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے تمنا شاگرد ناسخ کے شاگرد ہوئے مگر بعد کو تسلیم کو کلام دکھانے لگے۔ ان کے اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلے ایک دیوان موسوم بہ "فکر عرش" داغ کے رنگ میں لکھا مگر وہ شایع نہیں ہوا۔ دوسرا دیوان موسوم بہ "نظم نونگار" تسلیم کے رنگ میں اور انھیں کا اصلاح کردہ ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا دیوان بھی لکھا ہے دو مختصر رسالے زبان اور فن عروض پر اور ایک تاریخ آگرہ و دہلی موسوم بہ "بارگاہ سلطانی" بھی اُن کی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ تک بہار تریبیون کی ایڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے ہیں اور اسی رنگ میں مشہور ہیں۔

دربار حیدرآباد

حیدرآباد دکن اپنی روایات علم و ادب کے واسطے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ نظام الملک آصف جاہ اوّل جس طرح شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے ملک کے وارث قرار پائے اسی طرح اُن کے مذاق علمی اور سرپرستی سخن کے بھی وارث وہی ہوئے

حیدرآباد ہمیشہ سے علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی ہر قسم کے شعرا اور اہل کمال کا ملجا و ماوا رہا ہے۔ فرمانروایان سلطنت اور امرائے دولت کا آوازۂ سخاوت اور شہرۂ فیاضی سُن سُن کر شعرا، علما، فقہا، محدثین شمالی ہند اور نیز دور و دراز اقطاع و امصار مثلاً ایران، عربستان، بخارا، سمرقند وغیرہ سے آتے تھے اور یہاں کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ یہ باکمال لوگ افکار دُنیاوی سے فارغ ہو کر علم و ادب کی خدمت کرتے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ریاست کی بڑی زیب و زینت سمجھے جاتے تھے خود فرمانروا بھی محض شاعری کے قدردان اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کا ذوق سلیم رکھتے تھے اگرچہ بعض عہدوں میں شاعری کا بازار سرد رہا مگر یہ بھی شمع سخن جو ایک مرتبہ روشن ہو چکی تھی وہ کبھی بجھی نہیں۔ فرمانروایان سابق اُس زمانہ کے موافق فارسی زیادہ کہتے تھے مگر زمانہ حال میں اُردو کا چرچا زیادہ ہو گیا ہے جس کی تفصیل آیندہ سطور میں کی گئی ہے۔

نظام الملک آصفجاہ اوّل ۱۶۷۱ء تا ۱۷۴۸ء	بانی خاندان نظام الملک آصفجاہ اوّل کا نام میر قمر الدین خاں تھا فارسی میں شعر کہتے تھے اور دو دیوان اس زبان میں یادگار چھوڑے

ہیں۔ شاکر تخلص کرتے اور مرزا عبدالقادر بیدل سے اصلاح لیتے تھے۔ کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ مشہور ہے کہ نظم و نثر کئی زبانوں میں لکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اردو میں بھی کہا ہو مگر ان کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

میر محبوب علی خاں تخلص بہ آصف ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء عیسوی	ہز ہائینس مظفر الملک فتح جنگ نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصفجاہ ششم ۱۸ اگست ۱۸۶۶ء مطابق ۶ ربیع الثانی

۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ کم تین برس کی عمر میں ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء کو مسند آرائے ریاست ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں اصحاب ذیل کے سپرد ہوئی مولوی محمد زماں خاں شہید، مولوی مسیح الزماں خاں، مولوی انوار اللہ خاں، مولوی

اشرف حسین ، مظفر حسین خوشنویس ۔ مرزا نصر اللہ خاں ۔ مسٹر کلارک ۔ سرور جنگ ۔ افسر جنگ اور منو خاں وغیرہ ۔ آپ کو زبان عربی و فارسی ، اُردو و انگریزی سب میں عبور حاصل تھا ۔ علوم مروجہ کے علاوہ فنون سپہ گری و شہسواری کے ماہر کامل تھے ۔ نشانہ بے مثل لگاتے تھے ۔ آپ کے علم و فن اور شعر و سخن کی قدر دانی کی وجہ سے تمام علماء و فضلائے عصر اور مشہور شعرائے عہد کا مجمع دار السلطنت حیدر آباد میں ہو گیا تھا ۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں ۔ مولانا کرامت علی ۔ مولانا حیدر علی مصنف منتہی الکلام ۔ مولوی امین الدین خاں خلف علامہ رشید الدین خاں دہلوی ۔ مولوی وحید الزماں خاں ۔ مولوی مہدی علی ۔ مولوی مشتاق حسین ۔ مولوی سید حسین و سید علی بلگرامی ۔ مولوی نذیر احمد ۔ مولوی عزیز مرزا وغیرہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں باکمال تھے کہ جو لکھنؤ اور دلی اور نیز دیگر مقامات سے شہریار دکن کی فیاضیوں اور حیدر آباد میں ہُن برسنے کا شہرہ سُن سُن کر حیدر آباد چلے گئے تھے ۔ نظام مرحوم کی علمی سرپرستی اور قدردانی کی بیّن مثال مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور اُردو لغت فرہنگ آصفیہ کی طباعت و اشاعت ہے جس کے واسطے اعلیٰ حضرت نے نہ صرف زرِ کثیر مصنف کو عنایت کیا بلکہ اس کے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر کے واسطے مقرر کر دیا تھا اسی شاہانہ فیاضی اور سرورانہ قدردانی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اور مشہور کتابیں اس مبارک عہد میں تصنیف کی گئیں ۔ مثلاً تمدن عرب مرتبہ و مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی سوانحعمری نواب سر سالار جنگ بہادر ۔ تاریخ دکن وغیرہ ۔ اسی در دولت سے مولانا شبلی نعمانی ۔ مولانا حالی مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی ۔ قدر بلگرامی ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ۔ مولوی عبدالحلیم شرر پروفیسر شہباز اور میلول ایسے کاملان فن برابر فیضیاب ہوتے رہے اور عمر بھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے مشاغل علمیہ میں مصروف رہے ۔ اُستاد شاہ بلبل ہندوستان نواب مرزا خاں داغ کی شہرت و ثروت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا تھا ۔ مشہور ہے کہ آخر میں اُن کی تنخواہ پندرہ سو روپیہ

اعلیٰ حضرت نظام الملک نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ
جنت آرام گاہ

ھز اکزالٹڈ ھائنس اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلداللہ ملکہ

ماہوار ہوگئے تھے۔ علاوہ اُن بیش بہا انعامات اور خلعت وغیرہ کے جو وقتاً فوقتاً اُن کو ملتے رہتے تھے۔

ہرچند کہ امیر مینائی اس معاملہ میں ناکام رہے اس وجہ سے کہ اُنکی عمر نے وفا نہیں کی مگر اُن کے صاحبزادے اختر مینائی اور اُن کے مشہور شاگرد حافظ جلیل حسن اب تک درباری شاعر ہیں اور جلیل کو تو جو موجودہ حکمران کی اُستادی کا فخر حاصل ہے۔

میر محبوب علی خاں آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے اُستاد داغ کے تبع تھے دو دیوان آپ کی یادگار ہیں۔ کلام میں داغ کا رنگ ہے اور حُسنِ الفاظ کے ساتھ حسنِ معنی بھی بہت کچھ جلوہ گر ہے۔ نہایت سلیس فصیح اور بامحاورہ ٹھیٹ پٹا کلام ہوتا تھا اور حُسنِ ظاہری کے ساتھ حُسنِ باطنی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ہزائگز الٹڈ ہائنس اعلیحضرت میر عثمان علی خاں بہادر بجمیع القابہ شعر وسخن	موجودہ فرمانروائے دکن

میں اپنے پدر بزرگوار کے متبع ہیں۔ آپ بھی نہ صرف قدردان وعربیؔ فن بلکہ بہت بڑے ناقد اور دلدادۂ سخن ہیں۔ آپ نے بھی اپنے دربار دُربار میں ایک مجمع شعراء و ادبا اور علما و فضلا کا جمع کیا ہے۔ آپ کے مبارک عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام جس سے کہ زبان اُردو کی ترقی اور وسعت میں بہت بڑا اضافہ اور اُس کو بے انتہا استحکام حاصل ہوا اور نیز دارالترجمہ کا قیام جس سے بہت سی بیش بہا غیر زبانوں کی کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوگئیں۔ آپ کے عہد زریں کی ایسی یادگاریں ہیں جس کے احسان سے ہماری زبان اور ہمارا ادب کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ آپ عثمانؔ تخلص کرتے ہیں اور آپ کا ایک دیوان غزلوں کا چھپ گیا ہے۔ آپ حضرت جلیلؔ سے استفادۂ سخن کرتے ہیں۔ کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے زوائد سے کلام پاک ہے۔ ہزائگز الٹڈ ہائنس زبان فارسی اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں اور کبھی کبھی اُن زبانوں میں بھی طبع آزمائی فرماتے رہتے ہیں۔

مہاراجہ چندو لال شاداں سنہ ۱۷۶۶ء تا سنہ ۱۸۴۵ء

امرا و رؤسائے ریاست عہد قدیم میں بحیثیت سرپرست شعرا اور اہلِ کمال کے جو مرتبہ مہاراجہ چندو لال کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ شاداں تخلص کرتے تھے اور ایک عرصے تک پیشکار ریاست نیز وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ مہاراجہ بہادر قوم کے کھتری تھے۔ علاوہ خود اہلِ کمال ہونے کے اہلِ کمال کے بڑے مربی اور سرپرست تھے اور اس عہد میں جود و سخا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اُنکی سخاوت کی مثالیں اب تک بطور ضرب المثل حیدرآباد میں مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں اسقدر مشہور تھے کہ ریاست حیدرآباد کو اُن کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی تھی اور حیدرآباد چندو لال کا حیدرآباد کہلاتا تھا۔ اُنکی سخاوت کا شہرہ سن کر ہندوستان اور ایران کے اکثر شعرا اور اہلِ کمال وہاں جمع ہوگئے تھے اور جو مشاعرے خود انھیں کے محل سرا میں ہر رات کو ہوتے تھے اُن میں یہ صاحبانِ فن جمع ہوکر اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ انہیں مشاعروں میں نصیر دہلوی نے بھی اکثر شرکت کی ہے اور بیش بہا انعامات سے مالامال ہوکر واپس ہوئے ہیں۔ ذوق اور ناسخ بھی طلب کیے گئے۔ مگر حب وطن اور راہ کی تعب نے اُس طرف جانے سے اُن کو باز رکھا۔ مہاراجہ موصوف اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ چنانچہ دو دیوان اُردو اور ایک دیوان فارسی اُن کی یادگار ہیں۔ مشہور ہے کہ اُن کے زمانہ میں تین سو سے زیادہ شاعر حیدرآباد میں جمع تھے جن کی ماہوار تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ تک تھی۔ ایک کتاب موسوم بہ "عشرتکدہ آفاق" بھی اُن کی تصنیف ہے۔ اس میں اُنھوں نے اپنے خاندانی حالات اور خود اپنے سوانح اور خدمات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

راجہ گردھاری پرشاد باقی سنہ ۱۸۴۰ء تا سنہ ۱۹۰۰ء

راجہ گردھاری پرشاد معروف بہ محبوب نواز راجہ بنسی دھر قوم کے سکسینہ کایستھ تھے۔ فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے تھے۔ یہ بھی مشاہیر حیدرآباد سے ہیں اور انکو بھی شعر و سخن کا ذوق اور سرپرستی شعرا کا

مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد بالقابہم مدارالمہام ریاست نظام

شوق تھا۔ اُنھوں نے نواب مرزا خاں داغ کی جب وہ حیدر آباد گئے ہیں بڑی قدر
اور مدد کی۔ اکثر کتابیں اُن کی تصنیف ہیں جن میں حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں:۔ بھگوت گیتا
کا ترجمہ فارسی منظوم۔ کیشو نامہ۔ کلیات باقی۔ قصائد باقی۔ پرنس نامہ کنز التاریخ۔ بقائے باقی
سیاق باقی۔ پیرایۂ عروض۔ آئینۂ سخن۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری
کس قدر برتتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت ہے۔ فلسفہ اور مذہب سے اُن کو
بڑی دلچسپی تھی اور ایک سچے درویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کی رباعیات نہایت موثر اور
دلچسپ ہیں۔ ان کے کلام سے بڑی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شمس الدین فیض کے شاگرد تھے

مہاراجہ سرکشن پرشاد متخلص بہ شاد
سنہ ولادت ۱۸۶۴ء

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر وزیر اعظم حیدر آباد زمانۂ حال کے
بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور اسکالر ہیں سلسلۂ خاندانی ایک
نہایت قدیم اور معزز دلی کے خاندان سے ملتا ہے جن کا کوئی رکن نظام ہائے سابق میں سے
کسی کے ساتھ حیدر آباد آیا تھا۔ اُنکے دادا مہاراجہ نرندر پرشاد اُس کونسل آف ریجنسی کے ایک
رکن تھے جو جنت آشیاں میر محبوب علی خاں کے زمانۂ نابالغی میں قائم ہوئی تھی۔ مہاراجہ
چندو لال اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا نے ان کو زبان عربی و فارسی میں
بڑے قابل اُستادوں سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی تھی اس کے علاوہ اُنھوں نے انگریزی
اور تلنگی اور مرہٹی زبانوں میں بھی کافی دستگاہ بہم پہونچائی۔ مہاراجہ صاحب موصوف عربی و
فارسی و اُردو نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے ہیں علاوہ نظم کے نثر کا اسلوب بھی نہایت
دلکش ہوتا ہے۔ شاد تخلص فرماتے ہیں اور حضور نظام سابق یعنی میر محبوب علی خاں کے شاگرد
ہیں جنھوں نے اِن کو "شاگرد خاص آصفجاہ" کے معزز لقب سے ممتاز کیا تھا۔ دو اُردو
جرائد یعنی "دبدبۂ آصفیہ" اور "محبوب الکلام" کی کرسی ادارت پر بھی چند روز آپ
متمکن رہے "محبوب الکلام" میں حضور نظام سابق بھی اپنا کلام اکثر شایع ہونے کے
لیے عطا فرماتے تھے۔ مہاراجہ صاحب موصوف ایک اچھے خاصے صوفی ہیں اور اُن کا

کلام مسائل تصوف سے لبریز ہے۔ اُن کے دیوان اُردو و فارسی شائع ہو چکے ہیں ایک دیوان معروف بہ "خمکدہ رحمت" میں صرف نعتیہ اشعار ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعصبات سے مرتفع ہو کر آپ مذہب کو کس بلند نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اخوت انسانی کے کس قدر قائل ہیں۔ خاندانی روایات بذل و عطا پر بھی آپ پوری طرح عامل ہیں اور مہاراجہ چندولال کے نقش قدم پر چلنے کے لیے ساعی رہتے ہیں۔ تقریباً ۸ تصانیف آپ کی موجود ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ بزم خیال (۳ جلدوں میں) رباعیات شاد۔ ہدیۂ شاد۔ فریاد شاد۔ مطلع خورشید۔ ایمان شاد۔ خمار شاد۔ نغمۂ شاد۔ ارمغان وزارت۔ مخزن القوافی۔ مثنوی آئینۂ وجود۔ مثنوی سر وجود۔ وغیرہ۔ کلام بہت دلچسپ اور بے تکلف ہوتا ہے علی الخصوص فارسی و عربی اشعار کا اُردو شعر میں ترجمہ یا تضمین بہت دلکش اور دلفریب ہوتی ہے۔ کلام میں حسن صوری و معنوی دونوں موجود ہیں۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں اپنے خاندانی عہدۂ وزارت سے سرفراز ہوئے اور خطاب "راجۂ راجگان مہاراجہ بہادر" جو ان کے بزرگوں کا تھا ان کو عطا ہوا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے اور "یمین السلطنۃ" کا خطاب عنایت ہوا سنہ ۱۹۰۳ء میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور سنہ ۱۹۱۰ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ گورنمنٹ انگلشیہ سے ملا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہو گئے تھے مگر تھوڑے عرصہ سے پھر قلمدان وزارت آپ کے سپرد ہوا ہے۔

انجمن ترقی اُردو یہ مشہور و معروف انجمن حیدر آباد میں تیرہ چودہ برس سے قائم ہے جب سے یہ عالم وجود میں آئی اپنے قابل اور ہر دلعزیز آنریری سکریٹری مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے کی سرپرستی اور نگرانی میں یہ برابر ترقی کر رہی ہے۔ سکریٹری صاحب موصوف کی اَن تھک کوششوں اور چند لائق اور قابل اشخاص کی قلمی امداد و اعانت اور سب سے بڑھ کے اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن کی نظر کیمیا اثر کی بدولت یہ انجمن زبان اُردو کی ترقی اور اشاعت کے نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ زبان انگریزی کی اکثر مفید اور مشہور

کتابیں نہایت قابلیت اور احتیاط کے ساتھ ترجمہ ہوگئیں یا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بکل کی تاریخ تمدن ۔ ایبٹ کی سوانحعمری ۔ نپولین بوناپارٹ پلوٹارک کی سوانحعمریاں حکمائے یونان وغیرہ کی لیکی کی تاریخ اخلاق ۔ ان کے علاوہ بیسیوں مستند کتابیں سائنس فلسفہ ۔ اخلاق ۔ اقتصادیات تاریخ کی ۔ خواہ بصورت تالیف یا ترجمہ شایع ہوچکی ہیں یا پیشِ نظر ہیں ۔ اسی طرح اُردو کی اکثر پُرانی کتابیں اور تذکرے بھی نہایت صحت اور عمدگی اور مفید فاضلانہ دیباچوں کے ساتھ نکل چکے ہیں ۔ اُردو رسم الخط کی اصلاح و ترقی اور اُس کو باقاعدہ اور سہل القرأۃ بنانے کے واسطے قابل اور تجربہ کار اصحاب کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں ۔ پروفیسر براون کی تاریخ ادب ایران اور نکلسن کی تاریخ ادب عرب بھی سُنا ہے کہ ترجمہ ہوگئیں اور چھپنے کے واسطے تیار ہیں ۔ انگریزی و اُردو کے علاوہ عربی فارسی اور فرانسیسی کی بیش بہا تصانیف سے بھی انجمن غافل نہیں ہے ۔ ترجمہ کی آسانی کے واسطے سائنس اور علوم و فنون کے اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور وہ بصورت لغت یا فرہنگ کے شائع بھی ہوگیا ہے ۔ اسی طرح لغات اور محاورات اور صناعوں اور پیشہ وروں کی مخصوص اصطلاحیں بھی مرتب کی گئی ہیں ۔ آکسفورڈ کی مختصر زبان انگریزی کی لغت کے اُردو ترجمہ کا حکم ہوگیا ہے اور اس کام کے لیے تقریباً بیس پچیس آدمی مقرر ہیں ۔ جب یہ تیار ہو جائے گی تو یقیناً مفید چیز ثابت ہوگی ۔ سُنا گیا ہے کہ انجمن اُردو کا نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی فکر میں ہے جس سے کتابوں کے چھپنے اور بعد کو اُن کے پڑھنے میں بہت آسانی ہوگی ۔ مختصر یہ کہ انجمن کے اشغال متعدد اور مختلف ہیں اور سب قابل تعریف ہیں ۔ البتہ زیادہ ہمت زیادہ مستعدی اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور کام کرنے والے بھی زیادہ ہونا چاہئیں تاکہ جو کام شروع کیا جائے وہ جلد ختم ہو جائے اور پبلک کو زحمت انتظار نہ اُٹھانا پڑے ۔ انجمن کا مشہور و معروف سہ ماہی رسالہ " اردو " جو زیر ادارت سکریٹری صاحب موصوف نکلتا ہے ہندوستان کے نہایت کارآمد اور مشہور رسائل اور جرائد میں سے ہے اور اس میں زبان

اور ادب اُردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ حال میں انجمن نے ایک رسالہ موسوم بہ "سائنس" زیرادارت ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی جاری کیا ہے جس میں صرف مضامین سائنس ہوتے ہیں یہ بھی شمل "اُردو کے نہایت مفید اور کارآمد مضامین کا حامل ہوتا ہے جس سے انشاء اللہ ملک کی بہت کچھ توقعات پوری ہوں گی۔

عثمانیہ یونیورسٹی

"عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے وہ روز افزوں علمی وادبی عمیق قومی جذبات پورے ہو گئے جو اعلیٰ تعلیم کی زبان مادری میں نشر واشاعت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عرصۂ دراز سے موجزن تھے اور جن کے واسطے وہ بہت بےچینی سے انتظار کر رہے تھے" عثمانیہ یونیورسٹی کا تقرر ابتدائی مباحث ومراحل طے ہوجانے کے بعد بالآخر ہز اگز الٹڈ ہائنس حضور نظام کے فرمان خسروی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کے بموجب عمل میں آیا۔ بالفعل تمام شعبہ ہائے علوم کی تعلیم زبان اُردو میں ہوتی ہے انگریزی صرف بطور زبان ثانوی کے ایک ضروری سبجکٹ رکھی گئی ہے تاکہ طلبا اس زبان سے بھی ناآشنا اور انگریزی بولنے والی دُنیا کے حالات وخیالات سے بےخبر نہ رہیں۔ اب تک صرف ایک کالج یونیورسٹی سے متعلق ہے جس کا افتتاح ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا۔ یونیورسٹی نمایاں ترقی کر رہی ہے اور طلبا کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کرلی ہے اور اُس کے امتحانات اور ڈگریوں کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اُسی درجہ کی برٹش انڈیا کی کسی یونیورسٹی کے امتحانوں اور ڈگریوں کو حاصل ہے۔ بالفعل یونیورسٹی میں شعبہ ہائے الٰہیات (تھیالوجی) علوم وفنون (سائنس وآرٹس) اور قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالترجمہ

عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے ضروری کتابیں فراہم کرنے کی غرض سے دارالتصنیف دارالترجمہ قائم ہے جو یونیورسٹی کے زیرنگرانی نہایت عمدہ اور مفید کام انجام دے رہا ہے ابھی پانچ ہی چھ برس کی مختصر عمر میں اس کی قابل قدر کوششوں سے وہ تمام کتابیں تیار ہوگئی ہیں جو یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے درجوں کے واسطے درکار ہیں

اس میں آٹھ قابل مترجم زیر نگرانی ایک افسر اعلیٰ کے، جو ایک مشہور فاضل مصنف ہیں کام کرتے ہیں۔ دارالترجمہ کی خدمات قابل تحسین و آفریں ہیں۔ خاص کر جب ہم اُن دقتوں کا خیال کرتے ہیں جو علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ میں اور اُردو میں سائنٹفک الفاظ کے وضع کرنے یا اُن کے مرادف قائم کرنے میں مترجموں اور مصنفوں کو ہوتی ہیں۔ سُنا گیا ہے کہ اس خاص کام کے واسطے ماہرانِ فن کی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جن کے متعلق وضع الفاظ و اصطلاحات علمیہ کا کام سپرد ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر ایک مفید لغت بھی شایع ہوگئی ہے۔ دارالترجمہ کی ابتدا شروع میں بطور ایک عارضی دفتر کے ہوئی تھی مگر کام کی اہمیت کے لحاظ سے ہزاگزالٹڈ ہائنس نے اُس کی عمر میں دس برس کی اور توسیع کردی ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات میں علاوہ مکمل یونیورسٹی کورس کے علوم ذیل کی کتابوں کی تصنیف و تراجم داخل ہیں۔ تاریخ (جس میں مشرقی اور مغربی اور قدیم و جدید ہر قسم کی تاریخ داخل ہے) فلسفہ۔ اقتصادیات۔ ریاضی (خالص اور مخلوط دونوں) طبیعیات کیمیا اور قانون۔ جب فن تعلیم و انجینیری اور طب کے شعبے یونیورسٹی میں کھلیں گے تو اِن فنون کی کتابیں بھی ترجمہ کی جائیں گی۔ جس کے واسطے ابھی سے خیال رکھا گیا ہے۔ مصنفہ اور مترجم کتابوں میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تیار اور شایع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر داخل درس ہونے کے قابل ہیں۔ مختصر یہ کہ دارالترجمہ زبانِ اُردو کی اشاعت اور توسیع کے واسطے ایک نہایت مفید محکمہ ہے اور خدمات کے لحاظ سے درازیٔ عمر کا مستحق ہے۔

باب ۱۴

اُردو شاعری کا جدید رنگ

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرزِ جدید کے پیشرو

اُردو مرثیہ نگاروں اور نیز نظیر اکبر آبادی نے اُس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی جو بالآخر زمانہ مابعد میں جدید رنگ میں جلوہ گر ہونے والی تھی۔ ان لوگوں نے اس جدید رنگ کے واسطے ایک شارع عام اپنے زمانہ کے خیال کے موافق تیار کر دیا تھا جس پر راستہ چلنے والے بعد کو آئے اور شاعری میں اصلاح کا رُخ دکھا دیا تھا۔ ہماری رائے میں قدیم زمانہ کے مرثیوں میں طرز جدید کا تخم یقیناً موجود تھا جس کی آبیاری بعد کے آنیوالوں نے کی اور انھیں کے مبارک ہاتھوں سے وہ درخت پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ مناظر قدرت واقعات کے سچے فوٹو الفاظ میں انسان کے قلبی جذبات کا حسن و عمل اظہار، نصائح آموزی کیفیات قلبیہ کا اظہار الفاظ میں سلاست و روانی، تشبیہ و استعارے کا حد سے متجاوز نہ ہونا یہ سب باتیں جو زمانہ حال کی شاعری کی جان ہیں۔ پُرانے مرثیوں میں کم و بیش ضرور پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنے کلام میں آنے والے انقلاب کی خبر دے دی تھی اور ہمارے نزدیک زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت سے دی تھی اس وجہ سے کہ مراثی میں تو یہ چیزیں بطور فروغ و تمہید کے تھیں اور نظیر کے یہاں وہ ایک مستقل عنوان کی صورت میں ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس زمانہ کے لوگوں نے اس رنگ کو قدرتی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور اس کو ایک فضول چیز سمجھ سکے اختیار نہیں

گیا۔ اسی وجہ سے مرثیہ گو بڑے شاعر کہلاتے تھے اور نظیر کو تو طرز قدیم کے دلدادہ ایک عامی اور جاہل شاعر سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ اُس نے اُن کے خیال کے بموجب قواعد مقررہ کی پابندی نہیں کی اور وہ عالم و فاضل نہیں تھا اور الفاظ کی تراش خراش کی اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی یہ لوگ چونکہ شعر کے حُسن ظاہر کو دیکھتے تھے اس وجہ سے نظیر کا بے تکلف اور نیچرل کلام اُن کو پسند نہیں آیا۔ ان پُرانے خیالات کو محو کرنے کے لیے کسی زبردست قوّت کی ضرورت تھی جس کی مختصر کیفیت سطور ذیل میں بیان کی گئی ہے

انقلاب کا اثر انقلاب زمانہ اُردو شاعری کے قدیم رنگ کے موافق ثابت نہیں ہوا دلی اور لکھنؤ کی سلطنتیں مٹ جانے سے شعرا کے سرپرست اُٹھ گئے۔ اب یہ لوگ بے پشت و پناہ رہ گئے اور معمولی آدمیوں کے دست نگر ہو گئے جن کی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے دل میں شوق تو تھا مگر اتنا روپیہ اُن کے پاس کہاں تھا کہ مثل بادشاہوں یا اُمرا کے شعرا کی سرپرستی کر سکیں۔ ہرچند جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے اکثر لوگ روزی کی تلاش میں رامپور وحیدرآباد اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں چلے گئے۔ مگر وہاں بھی عرصۂ دراز تک اُنکے پاؤں نہ جم سکے اور تھوڑے عرصے کے بعد یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے یا اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ اسی کے ساتھ انقلاب زمانہ نے اُمرا کو صرف دولت کے اور بھی بہت سے مفید استعمال سکھائے جس سے شعر کی قدر اور شاعروں کی مالی نفع پر بہت کچھ اثر پڑ گیا۔ لوگ اب زیادہ مادہ پرست اور کاروباری ہو گئے تھے جن کی دُنیا میں نثر کی صاف اور سادی صبح نظم کی خوش رنگ شفق سے بہتر ہے۔ اب وہ پُرانے رنگ کے تغزل میں کوئی لطف نہیں پاتے تھے ہرچند کہ صنف غزل مقبول رہی اور اب تک مقبول ہے دہلی کی تباہی انتزاع ملک اودھ، غدر ۱۸۵۷ء اور ان ہنگاموں کے انقلابات نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اب وہ خواب غفلت سے چونکے اور افکار دنیاوی میں مبتلا ہو گئے ہندوستانی ریاستیں گو ان ہنگاموں سے محفوظ تھیں مگر رفتار زمانہ کے موافق اُن کو بھی

اپنے معاملات کی اصلاح کرنا ضرور تھی۔ اس وجہ سے وہ ریاستیں جو شعرا کی ملجا و ماوا بنی ہوئی تھیں وہ بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکیں جس کا اثر شعرا کی تنخواہوں اور منافع پر بھی بہت کچھ پڑا۔

انگریزی تعلیم کا اثر

انگریزی تعلیم سے بھی اُردو نظم و نثر دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا اور اُنکو بڑی تقویت پہونچی۔ انگریزی تعلیم نے زبانِ اُردو کے ساتھ ہندوستان میں وہی کیا جو انگلستان میں خود زبان انگریزی کے ساتھ رینا سانس[1] نے سولھویں صدی میں اور رومانس (افسانہ نگاری) کے شوق نے اٹھارویں صدی میں کیا تھا۔ ترجموں سے اس انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی ادب نے جس میں نظم، نثر اور ڈراما سب کچھ داخل ہے بہت گہرا اثر ڈالا اور ہمارے رہنماؤں کے دل میں اُردو زبان کو اسی نئے طرز پر ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدائی نقوش البتہ زیادہ گہرے نہیں تھے کیونکہ نقاش یا تو زبانِ انگریزی سے بالکل ناآشنا تھے یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے وہ اس جدید رنگ سے اُن تراجم کے ذریعہ سے واقف ہوئے تھے جو خود انگریزوں کی ایما سے کرائے گئے تھے۔ مگر باوصف اس کمی کے وہ اس جدید رنگ کی تمام خوبیوں سے بخوبی واقف تھے اور انہوں نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ طرز قدیم کو جس میں زمانہ حال کی روش کے اعتبار سے اکثر خرابیاں پائی جاتی تھیں بدل ڈالیں اور اُس میں ایک جدت کی چاشنی پیدا کریں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تغیر فوراً اور دفعۃً نہیں ہوا بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج عمل میں آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے طرز کے ساتھ پُرانا طرز بھی قائم رہا۔ برخلاف رینا سانس اور رومانس کے دلدادوں کے ہماری زبان کے راہ نماؤں نے اپنے قدیم شعرا کے ادب و احترام اور نیز اُن کے رنگ کی مدح سرائی اور قدردانی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ مولانا حالی کی "یادگار غالب" اور آزاد کا مطبوعہ "دیوان ذوق" ہمارے

[1] نشاۃ ثانیہ یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اور علی الخصوص اٹلی میں فنونِ لطیفہ اور جمیع مُروجہ علوم و فنون کا قرونِ وسطی کے اثر سے نکل جانا اور ایک نیا طرز اختیار کرنا ۱۲

اِس دعوے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ہمارے راہبر قدامت شکن نہ تھے بلکہ جدید رنگ کی تائید و تلقین کرنے کے باوجود قدامت پرست رہے۔ اُن کی غرض صرف یہ تھی کہ ادبِ اُردو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ اُس میں جدید رنگ بھی شامل ہو کر اُس سے پُرانے رنگ کا تصنع اور تکلف جاتا رہے۔ فضول مبالغے، دور از کار تشبیہیں، بے مزہ لفاظی، ان چیزوں کے وہ مخالف تھے اور اُن کی اصلاح کی بنیاد انھیں خرابیوں کے دور کرنے پر پڑی تھی۔

جدید رنگ کی خصوصیات

جو جو جدید رنگ پھیلتا گیا اور قوی ہوتا گیا اُسی قدر وہ مقبول ہوا اور اُس کے معرف اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے۔ نئی پود جو قدیم رنگ سے بالکل نا آشنا تھی اُس نے اس جدید رنگ کو بہت شوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا۔ اس رنگ کے خاص خصوصیات یہ ہیں۔ نئے سبجکٹ اور مضامین تلاش کیے گئے۔ غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لیے تنگ اور بے مناسب پایا گیا۔ مُسدس اور مثنوی کا دَور دَورہ ہوا کیونکہ اِن اصناف کے لکھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ قافیوں پر قابو ہوتا ہے اور اظہارِ خیال مسلسل کیا جا سکتا ہے جو غزل میں مشکل ہے۔ ایسے مضامین جن کی عبارت میں تکلف اور تصنع کی ضرورت تھی ترک کیے گئے۔ رباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ کی گئی۔ نیچرل مضامین جو قدیم شاعری میں پسِ پشت ڈال دیے گئے تھے اب پیش پیش ہو گئے اور اُن پر بالاستیعاب لکھا جانے لگا۔ مثلاً برکھا رُت، جاڑے اور گرمی کی بہاریں، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کے خوشنما مناظر۔ اب ہماری جدید شاعری میں داخل ہو گئے جو قدما کے یہاں خال خال نظر آتے ہیں اسی طرح خیالی نظمیں، بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں، نصیحت آمیز اور اخلاقی نظمیں، پولٹیکل نظمیں، اشعار بصورتِ سوال و جواب وغیرہ وغیرہ بھی جدید شاعری میں جگہ پانے لگے۔ غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا اب وہ پُرانے فرسودہ مضامین زلف و کاکل کنگھی چوٹی، مسی کاجل وغیرہ کے معیوب سمجھے جانے لگے، اب جذباتِ انسانی، اور کیفیاتِ قلبی کا من و عن اظہار اور بے ثباتی دُنیا وغیرہ کا نہایت پُر اثر الفاظ میں بیان کیا جاتا

داخل فیشن ہو گیا۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔

اصنافِ سخن میں جدتیں

ایجاد اور اختراع کے شوق کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوے جنہوں نے انگریزی نظموں کی بعض بحریں اُردو میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اُس قسم کی نظمیں بہ لحاظ اپنی نوعیت کے زبانِ اُردو سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی طرح بلینک ورکس (نثر مرتجز) کے بھی بہت شایق پیدا ہو گئے مگر اس کو بھی پبلک مذاق نے پسند نہیں کیا اور یہ صنف بھی اُردو میں بالکل نامقبول رہی۔ ابتدا میں بعض مشہور اور کہنہ مشق اُستادوں نے اس پر طبع آزمائی کی تھی، مثلاً مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی۔ مولانا شرر مرحوم، آزاد کاکوروی وغیرہ۔ اور اب بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں مگر اُنکو رواج عام شہرت نہیں دیتا۔ مولوی عظمت اللہ نے یہ جدت کی ہے کہ ہندی دوہروں کی پیروی اُردو نظم میں شروع کردی اور الفاظ اور مضامین وغیرہ بھی ہندی ہی رکھتے ہیں۔ اکثر ایسی نظمیں نہایت دلکش اور بامزہ ہوتی ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قدیم طرز اور معمولی اصنافِ سخن بالکل بھلا دیے گئے تھے۔ ایسا نہیں ہوا۔ مسدس یعنی چھ مصرعہ والی نظم کو جو مرثیہ کے واسطے مخصوص ہو گئی تھی۔ مولانا حالی نے اپنی مشہور کتاب "مدوجزر اسلام" معروف بہ "مسدس حالی" لکھ کے شہرت جاودانی بخشی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اس صنفِ خاص کا بہت رواج ہو گیا اور اب یہ اس قدر مقبول ہے کہ ہر قسم کی نظمیں بیجرل بیانیہ، مدحیہ، اخلاقی، سیاسی، وطنی ترانے، تاریخی نظمیں، سب اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں اور اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ اُس کی بحریں نہایت زوردار اور خوش آیند معلوم ہوتی ہیں۔ سلسلۂ بیان کا اس صنف میں بہت موقع ملتا ہے۔ چاروں مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے کی سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جس سے شعر کا لطف اور ترنم بڑھ جاتا ہے۔ مسدس علاوہ اور اصنافِ نظم میں بھی مضمون کے ساتھ مناسبت اور میل کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے نفسِ شعر میں یہ تغیر ہوا ہے کہ یا وہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کر دی گئی ہیں

اور اب سادگی صفائی اور واقعیت شعر کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے زمانۂ موجودہ کی نظمیں بہت مؤثر اور جذبات سے بھری ہوتی ہیں۔

جدید رنگ کے اثرات | انگریزی طرزِ تعلیم نے اُس عام افسردگی کو دور کر دیا جو آخر میں لکھنؤ اور دلّی کی شاعری پر چھا گئی تھی۔ اُس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا اور ایک نئی روح آزادی اور بلند خیالی کی پھونکی۔ نثر کی ترقی اور جدید فنِ تنقید اور ڈراما نویسی کے رواج کا بھی وہی باعث ہوئی۔ اُس کی وجہ سے ایک وسیع اور قیمتی ذخیرۂ الفاظ، نئے تخیلات، نئی تشبیہات، نئے نئے مضمون نئے نئے مناظر اور شعر کے نئے نئے سامان زینت فراہم ہوئے نئے نئے خیال ہاتھ آئے اور اُن خیالات کے اظہار کے لیئے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ اُس کی مدد سے اکثر جدید الفاظ زبان میں داخل ہوئے اور زبان اس قابل ہوگئی کہ معنی کا نازک نازک فرق الفاظ کے ذریعہ سے ادا کر سکے انگریزی تعلیم کے اثر نے زبانِ اُردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا کہ اُنکے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہا تھا۔ اُن کا مطمح نظر محدود ہوگیا تھا اور اُن کی ذہانت و طباعی زنگ خوردہ ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اُسکی وجہ سے گویا کایا پلٹ ہوگئی اور اب وہ ایک درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتی ہیں، اور نئے تجارب اختیار کرنے اور نئے خیالات کے اظہار میں اُن کو اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ اُس نے ان میں اتنا تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے کہ زمانۂ حال کی تصانیف اُن زبانوں میں گویا دوسری زبان کی تصنیفیں معلوم ہوتی ہیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ان خوبیوں کے باوجود بعض خرابیاں بھی اُسی کی وجہ سے پیدا ہوئیں مثلاً مقررہ قواعد عروض سے لاپروائی۔ ہر قسم کے قابل و ناقابل مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا انگریزی الفاظ کی بھرمار۔ پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے فوائد نقصانات سے زیادہ ہیں اور یہ خرابیاں بھی جو آج پیش نظر ہیں کسی وقت دفع ہو جائیں گی۔

جدید ادب اُردو کے تین طرز پہلا طبقہ | پہلا طرز اُن لوگوں کا ہے جو پس پشت دیکھنا اپنا نصب العین سمجھتے

ہیں۔ یعنی قدامت پسند فرقہ جو بجائے زمانۂ موجودہ کے گذشتہ زمانہ میں زندگی بسر کرتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کو اگلے وقت کی زبان تو پسند ہے اور خود اپنی زبان کسی طرح پسند نہیں آتی۔ اپنے کلام کو قدیم سانچے میں ڈھالتے اور جدید طرز سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولات زندگی پر غور کرنا بھی ایک گناہ کبیرہ ہے اور یہ اس کو ایک بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ ایسے مضامین جس میں کچھ فلسفہ کچھ تصوف اور کچھ عاشقانہ رنگ کی آمیزش ہو بس انھیں میں اشعار کہے جائیں۔ اگر ان کو حقیقی تصوف اور عاشقانہ رنگ سے لگاؤ ہوتا تو البتہ معذور تھے مگر بغیر کسی تعلق کے یہ یا تو قدما کے محض نقال کہے جا سکتے ہیں یا لفاظی کے شعبدہ باز۔ پرانے مضامین کے ساتھ پرانی بحریں اور الفاظ استعمال کرنے میں بھی اُنکو انہماک ہے۔ یہ لوگ اس وجہ سے شعر کہتے ہیں کہ صرف شاعری کو دلیل علم و قابلیت جانتے ہیں ایسے ہی لوگوں پر انگریزی شاعر یورپ کا وہ شعر صادق آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"وہ شعر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اُن کے باپ بھی شعر کہتے تھے۔ اور اپنی عدم ذہانت سے اپنی ناخلفی کا اظہار کرتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں البتہ شاعروں کے نقال کہے جا سکتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے کلام سے آجکل کے رسالے اور گلدستے بھرے ہوئے ہیں مگر ان کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی ہیں جو قدیم طرز کی پیروی زیادہ قابلیت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں اور قدما کی جانشینی کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے بعض طبیعت دار نوجوان ان لوگوں کے کلام کو بھی پسند نہیں کرتے غرضکہ طرز قدیم کے قابل اور ناقابل دونوں قسم کے پیرو زمانۂ موجودہ کی رفتار سے پیچھے ہٹتے جاتے ہیں اور فی الحقیقت اگر زمانۂ موجودہ کی ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو یہ کوئی مفید خدمت بھی انجام نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی کوششوں سے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔

دوسرا طبقہ	یہ طبقہ طبقۂ اوّل کی بالکل ضد ہے۔ یہ ہر مغربی چیز کا عاشق و دلدادہ ہے۔ اسے

ملک کی پرانی روایات کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے۔ مغربی شاعری کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا ہے کہ مغربی شاعری مشرقی لوگوں کے کہاں تک حسب حال اور مناسب ہو سکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ مغربی تعلیم کی شراب نے اُن لوگوں کے دماغوں کو چکرا دیا اور اتنا مدہوش کر دیا ہے کہ وہ کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اس طرز کے بانیوں نے محض نقل کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ وہ ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پرانے زمانے سے اور پرانے زمانے کی باتوں سے یا تو شرماتے ہیں یا اُن کی بے اعتنائی سے ٹال دیتے ہیں ایسے لوگوں کے نزدیک جدت اور صرف جدت شاعری کی جان ہے یہ لوگ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اُن کا کلام کسی قسم کا اثر کرتا ہے یا نہیں اور حالات ملکی کے مناسب ہے یا نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں نے کتابوں کے مارکٹ کو ترجموں سے بھر دیا ہے وہ بھی نہایت بے سلیقگی سے محض فروخت کی غرض سے کیے گئے ہیں۔ ان ترجموں میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ عمدہ اور مستند کتابوں کے بھی ترجمے نہیں ہوتے بلکہ صرف ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں جو پسندیدۂ عوام ہیں۔ مثلاً انگریزی ناولسٹ رینالڈس کے تراجم اور اس پر بھی غضب یہ ہے کہ اکثر ترجمے اصل سے نہیں کیے جاتے بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہیں جس سے اصلیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ کے شوق بلکہ ناکارہ کتابوں کے ترجمہ کے شوق کے ساتھ ایک نیا طرز تحریر بھی اختیار کیا گیا ہے جس کو انگریز جورنلیس کہتے ہیں یعنی ایک ایسی ناقص اور نا مکمل زبان جو نہ پوری طرح سے خیالات کے اظہار پر قادر ہے نہ معنی کے نازک نازک فرقوں کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کر سکتی ہے یہ حال عام طور پر اُن کرایہ کے ٹٹو ناول نویسوں کا ہے جن کے لغو اور مضر تصانیف سے بازار بھرا ہوا ہے۔ نیز جلد باز اخبار نویسوں کا بھی یہی حال ہے۔ پرانے طرز کو ترک کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طرز ادا نا مکمل ہو، رنگ فوق البھڑک ہو۔ اور عبارت طرفہ معجون بن جائے۔ ادیبوں کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ بدنمائی کو خوبصورتی پر، بھدے پن کو حسن تناسب پر، اور شور و غل کو نغمے پر ہرگز

ترجیح نہ دیں۔

تیسرا طبقہ | یہ ان اعتدال پسندوں کا اہم طبقہ ہے جو قدیم وجدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کا خیال رکھتے ہوئے دونوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ یہ گو زمانۂ موجودہ میں ہیں مگر زمانۂ گذشتہ کی عظیم الشان روایات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ یہ روایات قدیمہ کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے خیالات اپنے ہی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان میں اوریجنلٹی یعنی اصلیت ہے ان کی غرض وہی ہے جو قدیم یونانی علم الاصنام کی روایات کے مطابق جیسن کی تھی جو ایک سنہری بھیڑی کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا تھا۔ یہ لوگ بھی اُسی طرح اپنے کسی محبوب تخیل کی تلاش میں ملکوں ملکوں کے ادب وشاعری کی سیر کرتے ہیں ان کو ایک ایسا تاجر نہ سمجھنا چاہیے جو ایک ملک میں مال خریدتا اور دوسرے میں بیچ ڈالتا ہے بلکہ یہ راس المال شاعری کے صناع ہیں اور اپنے مصنوعات کے واسطے جنس خام اپنے ہی ملک سے تلاش کرتے ہیں اور ان سے نئی نئی خوبصورت چیزیں بناتے ہیں یہ اپنے شعروں سے اپنے اور نیز اپنی قوم کے دل ودماغ کے واسطے غذائے روحانی تیار کرتے ہیں۔ یہ زمانۂ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اُس سے محبت رکھتے ہیں۔ خود اپنے زمانہ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور زمانۂ آیندہ سے مقابلہ کا خوف نہیں کرتے۔ اسی طبقہ میں ذیل کے مشہور شعرا اور نثاروں کو داخل سمجھنا چاہیئے مثلاً حالی، آزاد، شرر، سرشار، سُرور، مولوی محمد اسماعیل، اکبر آبادی، ڈاکٹر محمد اقبال اور حسرت وغیرہ جن میں سے بعض کے مختصر حالات ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے دونوں طرزوں کی خوبیوں اور عمدگیوں کو اخذ کیا ہے اور انھیں پر آئندہ ترقی کی اُمید وں کا دار ومدار ہے۔

حالی ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء | شمس العلما، خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھی اور پدری سلسلہ ان کا ایک بزرگ خواجہ ملک علی تک پہونچتا ہے

جو اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم تھے اور بہ زمانۂ غیاث الدین بلبن ہرات سے
ہندوستان آئے تھے اور کچھ گاؤں پانی پت کے قریب اُن کے گزارہ کے واسطے بادشاہ نے
مقرر کر دیے تھے۔ وہ پانی پت کے قاضی بھی مقرر ہوئے تھے اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر
اور عیدین میں نماز پڑھانے کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ
ایزد بخش غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب
کی عمر نو برس کی تھی۔ اُن کے والد کو ایک مجنونانہ کیفیت رہتی تھی لہذا اُن کی تعلیم و تربیت کا بار
اُن کے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے
کے بعد اُنھوں نے رسمی تعلیم عربی و فارسی کی شروع کی۔ سید جعفر علی میر مومن دہلوی کے بھتیجے
سے فارسی پڑھی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو بعد فراغت علوم لکھنؤ سے واپس
گئے تھے عربی شروع کی۔ ابھی درسیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی اور ہنوز سترہ برس کی عمر کو
نہیں پہونچے تھے کہ ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ تحصیل علم کے شوق میں
اور نیز اس خیال سے کہ بیوی کے خبرگیراں خوش حال ہیں یہ چپکے سے گھر چھوڑ کر ۱۸۵۴ء میں
دلی چلے گئے۔ یہاں مولوی نوازش علی سے جو اس زمانہ کے ایک مشہور معلم اور واعظ تھے
سال ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے۔ اس وقت ان کو صرف و نحو۔ منطق۔ عروض وغیرہ
میں کافی دستگاہ ہو گئی تھی۔ مگر ۱۸۵۵ء میں اپنے اعزا کے اصرار سے پھر پانی پت واپس گئے
یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا شغلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کر لی
مگر غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اب کی مرتبہ منطق و فلسفہ کے ساتھ
حدیث و تفسیر کی کتابیں بھی نظر سے گذریں۔ غرض کہ تین چار برس پانی پت میں قیام کے بعد
ان سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے جو کہ جہانگیرآباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات
ہو گئی اور نیز ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا۔ نواب صاحب موصوف ایک جید فاضل اور
مشہور شاعر تھے اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ مسلہ مختلف فیہ ہے

کہ آیا حالی نے اپنا کلام شیفتہ کو دکھلایا اور اُن سے اصلاح لیتے تھے یا نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں، جیسا کہ خواجہ صاحب کو خود اعتراف ہے کہ نواب صاحب کی ملازمت اور صحبت سے ان کو بہت کچھ فائدہ پہونچا۔ ان کے اس شعر سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیفتہ سے استفاضۂ سخن کرتے تھے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں　　شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

جہانگیر آباد کی شاعرانہ فضا۔ نواب صاحب کی صحبت، وہاں کی فارغ البالی کی زندگی۔ ان سب چیزوں نے پرانا شعر و شاعری کا شوق جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا از سر نو تازہ کر دیا اور اب یہ اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس بہ نظر اصلاح دلی بھیجنے لگے وہ شیفتہ کے پاس بحیثیت اُن کے رفیق اور ان کے بیٹوں کے معلم کئے تقریباً آٹھ برس رہے۔ اس کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے لاہور آئے جو اس وقت دلی سے بعد غدر نکلے ہوئے لوگوں کا ملجا و ماوا ہو رہا تھا۔ یہاں ان کو گورنمنٹ بکڈپو میں ایک جگہ مل گئی جس میں اُنکو سررشتۂ تعلیم کی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی۔ چونکہ اس کام میں انگریزی ادب سے ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت حاصل ہو گئی اور انگریزی خیالات اور طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی لہذا مشرقی شاعری اور مشرقی انشاپردازی کی فضول باتوں کی وقعت اُنکے دل میں کم ہو گئی اور اسی کی ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اُسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ یہ اس جگہ پر تقریباً چار برس رہے ہوں گے کہ وہاں سے دلی واپس آنا پڑا جہاں اُنکو اینگلو عربک اسکول میں ٹیچری کی جگہ مل گئی۔ لاہور میں چیفس کالج میں بھی آٹھ مہینے تک وہ ٹیچر رہ چکے تھے مگر وہ جگہ اُن کو پسند نہیں آئی تھی۔ دلی میں سرسید مرحوم سے اُن سے ملاقات ہوئی جن کی خاص فرمائش سے مشہور و معروف "مسدس حالی" لکھا۔ ۱۸۸۶ء میں جب کہ وہ عربی کالج میں معلم تھے سر آسمان جاہ علی گڑھ آئے ہوئے تھے جن سے سرسید مرحوم نے اُنکا تعارف کرا دیا اور انھوں نے ازراہ قدردانی و مردم شناسی پچھتر روپیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے

ادبی خدمات کی انجام دہی کے واسطے اُن کا مقرر کرا دیا۔ بعد کو جبکہ مولانا حالی علیگڈھ کالج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدرآباد گئے تھے تو یہ تنخواہ مبلغ سو روپیہ ماہوار کر دی گئی تھی۔ ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا نے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ایک قسم کی فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب شغل تصنیف و تالیف میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں خطاب شمس العلما بجلدوے ان کی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے سرکار سے عطا ہوا۔ بالآخر ستتر برس کی طویل عمر میں ۱۴ صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو اس دار ناپائدار سے رحلت کی۔

مولانا حالی پرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم تھے۔ دنیوی جاہ و ثروت کا خیال اُنکے دل میں مطلق نہ تھا۔ ان کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔ قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے وہ بالکل علحدہ تھے۔ اُن کا مطمح نظر بہت بلند تھا اور لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ہ کے وہ پورے عامل تھے۔

حالی کی شاعری اور اُس پر غالب اور شیفتہ کا اثر

حالی کی شاعری کی ابتدا دلی میں ہوئی۔ جبکہ وہ سترہ برس کی عمر میں چھپ کر گھر سے نکل گئے تھے دلی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آتے جاتے تھے اور اُنہیں کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس اثنا میں وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے اور نکات شعریہ مرزا غالب ہی سے حل کرتے تھے۔ مرزا بھی ان سے بہت خوش تھے اور اُن کی طباعی اور سعادت کی قدر کرتے تھے دلی چھوڑنے کے بعد وہ جہانگیرآباد آئے جہاں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی صحبت میں اُن کی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی نواب صاحب کی صحبت اُنکی شعر گوئی کی محرک ہوئی تھی اور یہیں اُنھوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا اب ان کو پرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے۔ کسی چیز کا من و عن بیان سیدھے سادے الفاظ میں، جس میں حقیقی جذبات

کا بھی کچھ تمول ہوا اب اُن کو مرعوب ہونے لگا۔ مرزا غالبؔ سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور اُنھیں کا رنگ اُن پر غالب تھا۔ ہر چند کہ شیفتہؔ کا اثر اور رنگ اُن کے اس زمانہ کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر آباد سے لاہور آ گئے۔ مگر یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا اور یہاں کا قیام وہ اپنے واسطے ایک قید سمجھتے تھے چنانچہ اس زمانہ کے لاہور کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے اعتنائی کا حال جو انہوں نے قلمبند کیا ہے اس سے ان کے دلی خیالات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے مگر یہیں لاہور میں گورنمنٹ بکڈپو کی ملازمت میں اُنکو انگریزی علم و ادب سے ترجموں کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوئی۔ جس کا اثر ان پر بہت اچھا پڑا یہ زمانہ ان کی علمی زندگی کے رُخ بدل جانے کا زمانہ تھا اور ان کے اس زمانہ کی تحریروں میں ہم کو اس جدید رنگ کی ابتدا بخوبی نظر آتی ہے جو بعد کو ان کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ثابت ہوا وہ انگریزی شاعری کے بڑے مداح تھے اور اُس کی سادگی اور صفائی اور بلند نظری کو بہت پسند کرتے تھے اُن کا دل چاہتا تھا کہ کاش یہی سب چیزیں ہمارے ملک کی شاعری میں بھی داخل ہو جائیں۔ اسی زمانہ میں لاہور میں ۱۸۷۴ء میں ایک ادبی انجمن قائم تھی جس کے بانی مولانا محمد حسین آزاد اور کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اُس کے سرپرست تھے۔ اس انجمن کے جلسوں میں گو مشاعرے ہوتے تھے مگر وہ اس زمانہ کے مشاعروں کی طرح نہیں تھے۔ یعنی نہ تو کوئی مصرعہ طرح مقرر کیا جاتا نہ کسی خاص ردیف و قافیہ کی پیروی کی جاتی۔ لوگ اپنے اپنے اشعار جو کسی خاص مضمون پر لکھے جاتے، جو انجمن کی طرف سے پہلے سے مقرر ہو جاتا تھا انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ حالیؔ گو کہ اس انجمن کے بانیوں میں نہ تھے مگر اس کے ابتدائی شرکا میں ضرور تھے اور اس کے جلسوں کی شرکت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے چنانچہ ان کی چار نظمیں "برکھارت۔ نشاطِ اُمید۔ مناظرۂ رحم و انصاف اور حبِ وطن" اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں اور بہت مقبول ہوئی تھیں۔

سرسید کا اثر

غالبؔ اور شیفتہؔ کا اثر اُن کی شاعری پر سطور بالا میں بیان ہوا اب دیکھنا

چاہیئے کہ سرسید مرحوم نے ان کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ سرسید اس زمانہ میں مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے چونکانے اور ان کی اصلاح کے کام میں مشغول تھے جب انھوں نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھا تو ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھو مسدس حالی اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ نہایت کامیاب کتاب ثابت ہوئی اور چھپنے کے ساتھ ہی فوراً مقبول عام ہو گئی۔ ان کا رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بہت سے ناقل پیدا ہو گئے مگر اب تک کسی شخص کو اس صنف میں وہ کامیابی نہیں نصیب ہوئی جو مولانا حالی کو ہوئی جس کے وہ فی الواقع مستحق تھے اب وہ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مسدس کے بعد بعض اور نظمیں دہلی کی تباہی اور بربادی پر اور حکیم محمود خان صاحب کا مرثیہ جس میں مسلمانوں کی زمانہ گذشتہ کی عظمت اور زمانۂ موجودہ کی پستی کا نہایت مؤثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے اسی رنگ میں لکھا گیا۔ ان نظموں سے ان کی شہرت ایک رفارمر اور خطیب کی ہو گئی۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے پر زور اور مؤثر الفاظ کے ذریعہ سے ابھارتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمر ہمت باندھیں اور اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے میں جو کچھ ان سے ہو سکے مدد دیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کے مخاطب ان کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن یعنی اہل ہند تھے ان کے اعلیٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" کی صورت میں ظاہر ہوئے جو نہایت مؤثر اور دلکش نظمیں ہیں آخر عمر میں ان کے اشعار فلسفیانہ اور عمیق ہوتے تھے جیسا کہ ان کے ترکیب بند "تحفہ الاخوان" سے ظاہر ہے۔

تصانیف مولانا حالی کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ ان کی نثر کی تصانیف نثر کے باب میں بیان کی جائیں گی۔

(۱) مثنویاں۔ مناظرۂ تعصب و انصاف۔ رحم و انصاف۔ برکھا رُت۔ نشاط امید حب وطن (۲) مسدس حالی (۳) شکوۂ ہند (۴) کلیات حالی۔ جس میں ان کا دیوان مع مقدمۂ شعر و شاعری شائع ہوا ہے (۵) مناجات بیوہ، اور چُپ کی داد (۶) مراثی غالب و

حکیم محمود خاں و تباہی دہلی وغیرہ (۷) مجموعۂ نظم حالی جس میں اُردو کی متفرق نظمیں ہیں (۸) مجموعۂ نظم فارسی۔ جس میں فارسی کا کلام ہے

مثنویاں | ان کی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ یہانتک کہ بعض تو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی عبارت بہت صاف اور بے تکلف مشرقی مبالغے اور صنائع بدائع سے خالی ہے ان میں اخلاقی تعلیم نہایت مُوثر اور دلفریب انداز سے دی گئی ہے اور کہیں کہیں بصورت مکالمہ ہے جس میں ہر فریق کی اچھائیاں اور برائیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ واقعات تاریخی کے حوالوں سے بیان کی گئی ہیں مثلاً مثنوی رحم و انصاف میں رحم اور انصاف دونوں اپنی اپنی فضیلتیں اور دوسرے کی خرابیاں اور نقص ایک دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ عقل کے سپرد کیا جاتا ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور معاون و مددگار رہو۔ مثنوی برکھارُت بھی نہایت عمدہ اور دلچسپ مثنوی ہے اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا حال بڑی خوبی اور دلفریبی سے بیان کیا گیا ہے مثلاً بارش کے فائدے پہاڑوں اور میدانوں میں اس موسم میں فرش زمرّدیں کا بچھ جانا۔ کل جاندار ہستیوں میں ایک خاص قسم کی زندگی اور اُمنگ کا پیدا ہونا وغیرہ اس کی زبان بے تکلف اور سہل اور طرز ادا نہایت نیچرل ہے۔ فضول مبالغے اور دُور از کار تشبیہیں اور استعارے اس میں مطلق نہیں۔ یہ اس رنگ کی ابتدائی تصنیف ہے جس میں مولانا کو آخر عمر میں کمال حاصل ہوا البتہ اگر پُرانے شعراء کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظمیں بہ لحاظ زبان وتخیل کے کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال نہیں رکھتیں۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کی راہبر ہیں جس میں لوگوں کے اب یہ دل نشین ہوتا جاتا ہے کہ علاوہ معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

مسدس حالی | مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے یہ ایک نیا دَور پیدا کرنے والی کتاب ہے اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی ایک

الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخ ارتقار ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیئے یہ ایک
نیا تارہ ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی
نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کردیا کہ ایسی پر اثر اور پر درد نظموں کے واسطے
مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔ اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص ابتک
بہ لحاظ جوش اور زور تخئیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہونچا اس میں اسلام کے گذشتہ
عظمت، مسلمانان سابق کے کارنامے، ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور۔ برخلاف
اس کے زمانۂ موجودہ میں ان کی پستی و زوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں
سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو ان کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے
کمر ہمت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے۔ جوان۔ بچے۔ سب کے دل پسند ہے۔ اس نے کاروان مسلم کے
لئے بانگ جرس کا کام کیا کہ اٹھیں اور آمادۂ کار ہوں طبع ہوتے ہی اس کی عظیم الشان اشاعت
ہوئی۔ زمانۂ حال کی کوئی اردو کی کتاب مقبولیت میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ہندوستان کا
ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظ تھی
اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی
ہے یعنی اچھائیاں زمانۂ گذشتہ کی اور برائیاں زمانۂ موجودہ کی۔ اس میں شاعر زمانۂ
جاہلیت کی حالت، جزیرہ نمائے عرب کی تمام متمدن دنیا سے انقطاعی صورت عرب
اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا ان کا تعصب اور ناروا داری۔ ان کا طغیان
و بت پرستی وغیرہ وغیرہ نہایت صحیح واقعہ نگاری کے طریق پر دکھایا ہے۔ اسی حالت میں
پیغمبر اسلام کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ کی تبلیغ کے ابتدائی ثمرات۔ اعلائے کلمۂ حق توسیع علوم
استیصال ظلم و تعصب۔ اصلاح اخلاق اور ان تمام خوبیوں کی نشر و اشاعت جن کے
مفقود ہونے سے آج کل اہل اسلام مورد آفات ہو رہے ہیں اور جن کی کیفیت آخر کتاب
میں نہایت وضاحت اور اثر سے لکھی ہے۔ اس میں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدمتیں بیان

کی گئی ہیں۔ جو اس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعہ سے اخلاقی اور علمی دنیا میں کی ہیں پھر مسلمانوں کی تعمیر بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے وطن سے نکل کر دور دراز مقامات پر مثلاً اسپین میں جبرالٹر اور ہندوستان میں کوہ ہمالہ تک پہونچ گئے۔

ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر	نشان ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

سرسیّد مرحوم اس کتاب کے متعلق یوں رائے زنی کرتے ہیں:۔

"یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اسی قدر مؤثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھکر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے۔"

شکوۂ ہند | شکوۂ ہند[1] اور قصیدۂ غیاثیہ بھی مسدس مد و جزر اسلام کے طرز میں ہیں یعنی ان میں بھی وہی بیان اسلام کی قدیم شان و شوکت اور موجودہ پستی و نکبت کا ہے جواب ہندوستان میں رونما ہے۔ ترک لذات کی جگہ مزیداری۔ سادگی کی جگہ آرام طلبی، قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور بوداپن، چالاکی و مستعدی کے بدلے سستی و کاہلی اب گھر گھر نظر آتی ہے اس مرقع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہوگیا ہے مگر صرف اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چونکے اور اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو۔

مراثی | مراثی مرزا غالب و حکیم محمود خاں وغیرہ بھی نہایت دلچسپ مؤثر اور قابل قدر نظمیں

[1] اس کا جواب بیان یزدانی نے "رخصت عروس" کے نام سے لکھا ہے جس طرح شکوہ میں حالی نے ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اس نے ہم کو خراب کیا اسی طرح رخصت عروس میں یزدانی نے خود اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا ۱۲

ہیں۔ اوّل الذکر علی الخصوص نہایت ہی درد انگیز اور پر روز مرثیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا رنج و غم بشکلِ بہ نظم ہو گیا ہے وہ سچے جذبات اور حقیقی تاثر سے لبریز اور ایک غمزدہ دل کی کیفیات کی سچّی تفسیر ہے۔ سادگی یعنی شائبہ اغراق و مبالغہ سے اس کا معرّا ہونا جو مشرقی شاعری کا جوہر ہے، اس کا نشان امتیاز ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کتاب مولانا حالی کی شہرت شاعری کے واسطے بالکل کافی ہے حکیم محمود خاں صاحب کے مرثیہ کا رنگ مسدس اور شکوہ کا رنگ ہے اس میں دلّی کی تباہی اور مسلمانوں کی پستی کا ذکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز طریقہ سے کیا ہے

مناجات بیوہ یہ چھوٹی سی عجیب و غریب کتاب مولانا کی ہمارے نزدیک "مسدس" اور "شکوہ" سے بھی زیادہ مطبوع خلائق ہے اس کی بحر کسی قدر غیر معمولی ہے جو اصطلاح علمِ عروض میں "صوت الناقوس" کہلاتی ہے فعلن فعلن فعلن فعلن۔ سوشل معاملات کی اصلاح کی ہوا اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھی بنگال میں ودیا ساگر بیوہ عورتوں کے حامی تھے۔ "مناجات بیوہ" میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت میں اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر یا سُن کر دل پھٹ جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔ اس کی تعریف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

چُپ کی داد اس کتاب میں عورتوں کی خوبیوں اور نیز ان کے اعلیٰ فرائض منصبی کا ذکر ہے یہ حیدرآباد دکن میں مصنف نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جس کے صدر مہاراجہ سر کشن پرشاد وزیر اعظم ریاست تھے، پڑھ کر سنائی تھی۔ یہ کتاب بھی مولانا کے خاص رنگ کی ہے یعنی اس میں بھی وہی سلاست بیان اور صفائی زبان اور سیدھی سیدھی باتیں ایک لطیف پیرایہ میں ہیں جو ان کا خاص شیوہ ہے۔ ان تمام نظموں کی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات سے مصنفہ مُرتفع ہیں۔

دیوان خالی | اس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے جس میں کہ نفس شاعری کی حقیقت سے نہایت فاضلانہ طور پر بحث کی گئی ہے دیوان میں حسب معمول قدیم غزلیات قدیم و جدید دونوں رنگ کی رباعیات، قصائد، ترکیب بند تاریخیں سب کچھ ہیں۔ قطعات میں اکثر کسی اخلاقی مسئلہ کو بصورت قصہ یا مکالمہ کے بیان کرتے ہیں بعض قطعات فی الواقع نہایت بلیغ اور عمیق خیالات پر مشتمل ہیں۔ غزلیات اور اصناف سخن میں سب سے زیادہ ہیں اور مغلق و پیچیدہ خیالات سے خالی ہیں۔ طرز جدید کی غزلوں میں پرانا رنگ بدل کر زمانۂ حال کی روش کی ابتدا معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں بعض اشعار میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل قطعہ بند صورت میں بیان کیا گیا ہے جو موجودہ رنگ کی خاص پہچان ہے۔ رباعیات مختلف مضامین پر اکثر اخلاقی اور نصیحت آمیز ہیں۔ ان میں مفید اور کار آمد باتیں موثر اور زوردار الفاظ میں قدما کے طرز پر بیان کی گئی ہیں جو بہت مقبول ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ان کا ترجمہ انگریزی میں مسٹر جی۔ ای وارڈ نے کر دیا ہے قصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریقۂ سابق کے مادح کی ساری قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح اپنے اہم فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اس کو سنائی جاتی ہیں۔ موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کا قصیدہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

مقدمۂ شعر و شاعری | اس میں نفس شعر و شاعری سے بحث اور شعر کے اعلیٰ آئیڈیل یعنی منتہائے مقصود کا ذکر ہے، ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی شعرا اور ناقدین کی رائیں نہایت تفصیل و وضاحت سے مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مقدمہ گو کہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے مگر کسی قدر سطحی ہے لائق مصنف کا خیال ہے کہ اردو غزل اور نیز دیگر اصناف سخن اصلاح کے محتاج ہیں لہذا ان میں ضروری اصلاح ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ غزل میں مروجہ بیان

حسن و عشق کو نہیں پسند کرتے بلکہ اس کو اس بلند پایہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جس میں صرف بہترین اور اعلیٰ ترین مظاہر دوستی و محبت کا بیان ہو۔ اسی طرح وہ عورتوں کے بناؤ سنگار اور شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے بھی غزل میں حامی نہیں ہیں۔ دائرۂ غزل کو وسیع ہونا چاہیئے اور اس میں نہ صرف عاشقانہ فلسفیانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہوں بلکہ ان کے علاوہ اس میں نیچرل قومی اور سیاسی مضامین بھی جگہ پائیں۔ درستی زبان بھی بہت ضروری شے ہے اور الفاظ اور محاورات کی صحت کا ضرور خیال رکھا جائے۔ اسی طرح صنائع

لے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر مولانا حالی کا مفہوم نہیں سمجھا اور عام طور پر لکھدیا کہ شیخ و زاہد پر جو پھبتیاں کسنے اور ان کو بنانے کا اردو شاعری میں عام رواج ہو گیا ہے اس سے لوگوں کو باز رہنا چاہیئے۔ مولانا نے اس موقع پر جو عبارت واعظ اور زاہد کے تاڑنے اور ان پر نکتہ چینی کے متعلق لکھی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی صرف دو صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے ورنہ بالکل بیکار ہے اور اس کو ترک کر دینا چاہیئے پہلی صورت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی انھیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع اس جماعت سے کسی قسم کی مخالفت ہو دوسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی مخالفت نہ ہو تو یہ طنز و تشنیع ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے مقصود اصلی ان معائب کا اظہار ہو جو اس جماعت میں عموماً پائے جاتے ہیں مثلاً ریا۔ مکر۔ سالوس۔ خشونت و درشتی۔ بدخلقی وغیرہ نہ یہ کہ ان کی ذات پر بلا وجہ حملہ کیا جائے یا ان کی پستی میں اپنی بلندی ثابت کی جائے۔ مولانا حالی نے اس مجوزہ نظریہ کے ثبوت میں ذوق کے دو شعر پیش کئے ہیں سے

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو	تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اور اس کے آگے لکھا ہے کہ چونکہ اس شعر میں اس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو طبقہ زہاد و عباد میں اکثر پائی جاتی ہے کہ اوروں کو تو ذرا ذرا سی بات پر ملامت کرتے ہیں اور آپ اپنی اصلاح سے بے خبر ہیں۔ لہذا اس قسم کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسرا شعر یہ ہے سے

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر	دھمہ آب بنگ سے مہندی ئے گلرنگ سے

اس شعر میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو شیخ پر طعن کی وجہ معقول ٹھہرے۔ سوائے اسکے کہ بے چارے شیخ کی داڑھی سفید ہے اور محض اس جرم میں اس کو بھنگڑ اور شرابی بنایا گیا ہے۔

اسی اصول کے تحت میں دو چار شعر مختلف لوگوں کے اس مبحث پر لکھے جاتے ہیں جن سے ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ کونسا قاعدہ کس پر منطبق ہوتا ہے اور کس قسم کی طعن و تشنیع کی اجازت اور کس کی ممانعت ہے (بقیہ اشعار صفحہ ۱۶ا۴ پر)

بدائع یعنی شعر کے ظاہری تکلفات کی بہتات نہ ہونا چاہیئے اور نہ شعر کی خوبی کا دارومدار ان پر رکھا جائے۔ سنگلاخ زمینیں اور مشکل ردیف قافیے جن کے مصحفی اور شاہ نصیر وغیرہ دلدادہ تھے ان سے احتراز کرنا چاہیئے حتی الامکان ردیف بھی اڑا دی جائے[1]

ادبیات حالی | حالی کا مرتبہ ادب اردو میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ سب سے پہلے اُن ہی نے غزل و قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا۔ مسدس کی اہمیت عملی طور پر ثابت کی اور مسلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مسدس میں موثر طریقہ سے کیا۔ وطن یعنی مادر ہند پر نظمیں لکھیں طرز قدیم پر کہ جس میں تکلف و تصنع اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی۔ ہمواری خیال کو مد نظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے پاک کیا سیاسی مضامین اپنے کلام میں داخل کئے۔ آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا بالکل بجا ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ نیچر کی پیروی۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ ۱۴۵

شیخ صاحب برائیاں مے کی
اک ٹیپ دی تھی حضرت زاہد کو سلے ریاض
کسی سیکش کو دیں گے تختہ انگور کی خدمت
مے بزہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
دیکھنا ناسخ سر شیخ مسم کی طرف
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
کب کسی در پر جبہ سائی کی

اور جو کوئی چیت سی آجائے (ریاض)
اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی پڑی نہیں "
جناب شیخ ٹھیکہ لے چکے ہیں باغ رضواں کا (راسخ)
پیش ایں قوم بشو مایۂ زمزم نہ رسد (غالب)
کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر (ناسخ)
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے (غالب)
شیخ صاحب نماز کیا جانیں (داغ)

[1] اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا حالی ردیف کے خارج کرنے کی صلاح نہیں دیتے ا بلکہ ان کا منشا یہ ہے کہ غزل گوئی میں جہانتک ممکن ہو آسانی مد نظر رکھی جائے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ شاعر کو چاہیئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیے سے میل کھائی ہوئی ہو۔ اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سردست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیئے۔

مبالغہ اور اغلاق سے احتراز ۔ سادگی اور صفائی ۔ جذبات اور درد اثر ۔ ان کی عبارت بہت صاف سادہ اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے ۔ صنائع بدائع بہت کم اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ۔ فضول تعلّی اور بے جا اظہار علم و فضل سے محترز رہتے ہیں ۔

نقائص حالی | وہ کہیں کہیں قواعد عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے ۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں ۔ شاید اس غرض سے کہ کلام میں ایک خصوصیت پائی جائے اور معاصرین کے کلام سے متمیز ہو ۔ کبھی ان کا تخیل بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور کبھی محض تک بندی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ایک رفارمر اور نیشنلسٹ کی حیثیت بھی کہیں کلام کے مزے کو پھیکا کر دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی ان کے کمال شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جس طرح وہ قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور نیچرل شاعری میں بھی ان کا کلام لاجواب ہے ۔ اور ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گا کہ انھوں نے اردو شاعری کو ایک بڑی حد تک ان مضر اخلاق چیزوں سے پاک و صاف کر دیا جو اس میں سرایت کئے ہوئے تھیں اور اس میں ایک نئی روح پھونکی مختصراً یہ کہ ہر چند وہ شعرائے اُردو کی صف اولین میں شامل نہ بھی کئے جائیں مگر ادب اُردو کے سب سے بڑے محسن وہ ضرور شمار کئے جائیں گے ۔

مولانا محمد حسین آزاد | شمس العلما، مولوی محمد حسین آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادب اردو کا مجدد سمجھنا بالکل بجا ہے زمانۂ حال کے بہت بڑے ادیب، بہت مشہور نثار، نامی گرامی نقادِ فن تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور و معروف اخبار نویس تھے ۔ ان کمالات کے علاوہ جدید فارسی کے استاد کامل اور فلالوجی (علم الالسنہ) کے بھی بڑے ماہر تھے ۔ ان کی خدمات اور احسانات زبان اُردو پر بیحد ہیں ۔ اردو شاعری میں اس رنگ کا بانی اور اس میں ایک نئی روح پھونکنے والا اگر کوئی فی الحقیقت کہا جاسکتا ہے تو وہ مولانا کی ذات ہے وصحیح معنوں میں ادیب تھے ان کے کچھ مختصر حالات آیندہ حصۂ نثر میں بھی بیان کئے جائیں گے جس سے ان کا

حقیقی تعلق ہے۔ یہاں اُن کی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

آزاد کی شاعری آزاد فطری شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے۔ اُن کی نثر بھی اس قدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے ان کے والد چونکہ استاد ذوق کے دوست تھے اور ان کی صحبت میں بیٹھتے اٹھتے تھے لہذا آزاد بھی اوائل عمر میں اپنے والد کے ساتھ استاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔ انھیں کی معیّت میں دلی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور اساتذہ فن سے شناسائی کے علاوہ ان کے کلام کے حسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جاتے تھے۔ استاد ذوق سے نوجوان آزاد کو بڑی حسن عقیدت تھی اور انھیں کے فیض صحبت اور حسن تربیت کا یہ اثر ہوا کہ آزاد کے دل میں جذبۂ شاعری پیدا ہو گیا۔ دلی کی آخری عظمت و شان کی یاد دلانے والی صحبتیں گرم تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا اور فلک تفرقہ پرداز نے اُن مجمعوں کو منتشر کر دیا۔ اب لوگ ادھر اُدھر تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ چونکہ لاہور دلی سے قریب تھا اس وجہ سے دلی کے اکثر تباہ حال اشخاص وہاں چلے گئے۔ اُن ہی لوگوں میں محمد حسین آزاد، رائے بہادر منشی پیارے لال پنڈت من پھول میر منشی، مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین، اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔ جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ حسن اتفاق سے پنجاب میں اس وقت کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے جو علاوہ زبان فارسی اور اردو پر عبور رکھنے کے زبان اُردو کی توسیع و ترقی کا دل سے خیال رکھتے تھے۔ اُنھیں کے ایما سے مولانا آزاد نے ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے لاہور میں قائم کی جس کے جلسے اسی انجمن کے مکان میں ماہوار ہوا کرتے تھے اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیئے جائیں۔ نیز یہ کہ شاعروں میں جو طریقہ مصرعۂ طرح دینے کا مروج ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے شعرا خاص خاص مضامین و عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔ قبل اس کے کہ اس قسم کے

شاعرے شروع ہوں مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے فاضلانہ لیکچر اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کو تیار اور آمادہ کر دیا اور یہ دکھا دیا کہ یہ جدید رنگ عنقریب مقبول عام ہو جائے گا اور حقیقی شاعری کیا چیز ہے۔ اس کی ضروریات بتائیں اور وہ خرابیاں بھی دکھا دیں جو بالفعل پرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں مئی ۱۸۷۴ء میں جو ایڈریس انجمن کے افتتاح کے موقع پر انھوں نے پڑھا تھا اس میں اردو شاعری کے عیوب، تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، اس کا تصنع اور خلاف فطرت رنگ۔ غرضکہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب بہ وضاحت بیان کر دیئے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہم کو چاہیئے کہ عشق و عاشقی کے پرانے ڈھکوسلے ترک کریں اور عروس شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانۂ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پرانے مضامین ترک کرو سادگی اظہار اصلیت اور درد و اثر بھا شا سے اور صاف بیانی فائدہ رسانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے سیکھو۔

تصانیف منظوم | آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اس پر خود عمل بھی کیا انھوں نے اسی نئے رنگ میں متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں اوپر بیان ہو چکا ہے کہ استاد ذوق کی صحبت نے ان کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا استاد کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور اپنا کلام دلی کے مشاعروں میں سنانے لگے کہا جاتا ہے کہ ان کا اس زمانہ کا کلام غدر کے ہنگامہ میں سب ضائع ہو گیا۔ غدر کے بعد ان کو ریاست جیند میں ایک جگہ مل گئی تھی جہاں وہ مشق نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں قصیدے وغیرہ سب کچھ کہتے رہے۔ اس زمانہ کا کچھ کلام ان کے بیٹے مولوی ابراہیم نے ۱۸۹۹ء میں "نظم آزاد" کے نام سے شائع کیا ہے، لاہور میں ۱۸۷۴ء میں اس مشاعرے کی بنیاد پڑی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا اسی میں انھوں نے اپنی وہ دلچسپ نئے رنگ

کی نظم پڑھی تھی جو مثنوی شب قدر کے نام سے مشہور ہے اور جس میں رات کی آمد اور شام کی کیفیت کا ذکر ہے پرانے خیال کے لوگوں نے اس جدت کی بڑی مخالفت کی جس سے نئی امنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر اتنا ضرور ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا مشاعرہ کے بند ہو جانے سے بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے اور کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے رہے کبھی کبھی وہ اردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے جن میں کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ مثلاً ان کی نظم "اولوالعزمی کے لئے کوئی سد راہ نہیں" انگریزی شاعر ٹینی سن کی نظم "اکسلیسر" کے انداز پر ہے مگر اس کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں۔ مثنوی شرافت حقیقی۔ معرفت الٰہی۔ سلام علیک جیسے چاہو سمجھ لو جغرافیہ طبعی کی پہیلی۔ مبارکباد جشن جوبلی۔ ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو۔ یہ سب نظمیں مجموعۂ نظم آزاد میں موجود ہیں۔

آزاد کا قدیم و جدید رنگ

قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اسی پرانے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے چنانچہ مجموعۂ نظم آزاد کے آخر میں اُن کے پرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد موجود ہیں جن میں کچھ کچھ اشعار دلچسپ زور دار اور صوفیانہ رنگ کے بھی نکل آتے ہیں اسی کو ان کے آیندہ رنگ کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیئے جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں (۱) مثنوی شب قدر یہ ان کا شاہکار ہے اور اس میں مختلف لوگوں کے اشغال شب کے وقت کے نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے بیان کئے ہیں۔ طالب علم۔ مہاجن اور چور کی کیفیت علی الخصوص پڑھنے کے قابل ہے۔

طالب علم

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں	کل صبح امتحاں ہے سوا اس کے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دورسے	پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے

کریں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے — کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دُور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پہ محنت ضرور ہے

مہاجن

اور وہ جو لکھپتی ہے مہاجن جہان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی

آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دُکان میں
بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لئے ہوئے
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھ دام کی

چور

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر

دُزدِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
اور ہاتھ ڈالا اس کے ہر اک این داں میں ہے
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائے گا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اُڑائے گا

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر

بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر

پڑھتا ہے ذرّہ ذرّہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی دُرِ مضموں نئے نئے

مضمون تازہ گر کوئی اس آن مل گیا — یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا

اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے — پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے

مطلب اڑاتا شعر سے مضموں غزل کے ہے — لاتا پھر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضموں لیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں — آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے — اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے

مجھکو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض — رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض

یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں یہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں — کرتا ہے اس کو حرج عدو کے علاج میں

کر جاتا صاف دشمن بدبیں پہ چوٹ ہے — اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے — اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

(۲) مثنوی حب وطن اس میں انھوں نے ایک دوسرا رنگ اختیار کیا ہے اور اپنے مطالب کو بعض سچے اور بعض فرضی واقعات سے ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خواب امن ایک نہایت زوردار مثنوی ہے جس میں یہ دکھلایا ہے کہ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔

(۴) مثنوی ابر کرم اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں دکھلایا ہے یہ حالی کی برکھارت کے طرز پر ہے۔

(۵) صبح امید۔ اس میں نہایت مؤثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاروبار عالم مثلاً زراعت تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں امید ہی کام دیتی ہے اور کامیابی کا دار و مدار اسی پر ہے۔

آزاد و حالی کا فرق | آزاد مثل حالی کے شاعری کے دلدادہ نہ تھے ان کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک صاف نہیں۔ حالی سرسید مرحوم کی وجہ سے اور نیز اپنی مناسبت طبعی سے ایک قومی شاعر ہوئے اور تنزل اسلام کے راگ کو اکثر اپنے پرجوش کلام کی نئے میں آلاپا۔ آزاد کو اس قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے ان کی افتاد طبیعت عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کامل نثار و شاعر ہونے کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور جریدہ نگار ناقد بھی تھے انھوں نے ضروریات زمانہ کا لحاظ کرکے اپنے میلان طبیعت کو جو اُس زمانہ کا عام رنگ تھا جدید رنگ سے بدلا اور ایثار نفس سے کام لے کر اسی میدان میں شہادت علمی کا درجہ حاصل کیا۔ ان کے مختصر مجموعہ نظم سے پایا جاتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے اور اسی میں اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود دیکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جس قدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہوسکا۔ ان کی نثریں گو نظم نہیں مگر حقیقی معنی میں بے تکلف ہیں ان پر شعریت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی | مولوی محمد اسماعیل صاحب ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ میرٹھ وطن تھا سولہ سال کی عمر تک سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ترقی کرکے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوئے پہلے سہارنپور میں پھر میرٹھ میں ایک عرصہ تک اسی عہدہ پر رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہوگئے جہاں بارہ برس تک قیام کرکے ۱۸۹۹ء میں پنشن لی۔ بعد پنشن اپنے وطن مالوف یعنی میرٹھ واپس آئے۔ اور یہیں قیام اختیار کرکے بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کردی ان کی اعلیٰ قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خطاب "خاں صاحب" بھی سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اس دنیائے ناپائدار سے رحلت کی۔ آگرہ کے قیام میں مولوی صاحب موصوف نے اپنی

وہ اُردو ریڈریں اور پرائمریں تصنیف کیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصۂ دراز تک داخل کورس رہیں۔ یہ درسی کتابیں نہایت سادہ بے تکلف اور دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہیں اور ان کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ اس معاملہ میں مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ کے واسطے وہی کیا جو مولانا محمد حسین آزاد نے صوبہ پنجاب کے واسطے کیا تھا بلکہ ایک معنی میں ان سے بھی زیادہ خدمت انجام دی۔ یہ سب ریڈریں سلاست زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ان کا جواب سررشتۂ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے۔

مولوی صاحب شاعر اور نثار دونوں تھے ان کا خاص رنگ ان دونوں صنفوں میں سادگی اور صفائی ہے جس کے وہ استاد کامل تھے۔ شاعری میں طرز جدید اور طرز قدیم دونوں پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تمام اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ چنانچہ عاشقانہ، سیاسی، اخلاقی، سوشل اور نیچرل غرضکہ ہر قسم کی نظمیں ان کی لکھی ہوئی موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کا کلیات ۱۹۰۱ء میں شایع ہوا تھا اور اس میں ان کی تمام قدیم و جدید ہر رنگ کی نظمیں ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی کچھ پایا جاتا ہے اور طبّاعی اور قادر الکلامی ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے مولوی صاحب کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدان خاص میں تھے ان کے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور زمانہ موجودہ کی نیچرل نظموں کی پیشرو ہیں اردو میں بلینک ورس یعنی بغیر قافیہ والی نظم یا نثر مرجز میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی اور نہایت دل آویز طریقہ سے خیالات کو ادا کیا ہے علاوہ غزلیات کے جس میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں۔ انھوں نے اکثر اخلاقی نظمیں قصے کہانی کے طرز پر مثل "ایساپس فیبلس" کے لکھی ہیں
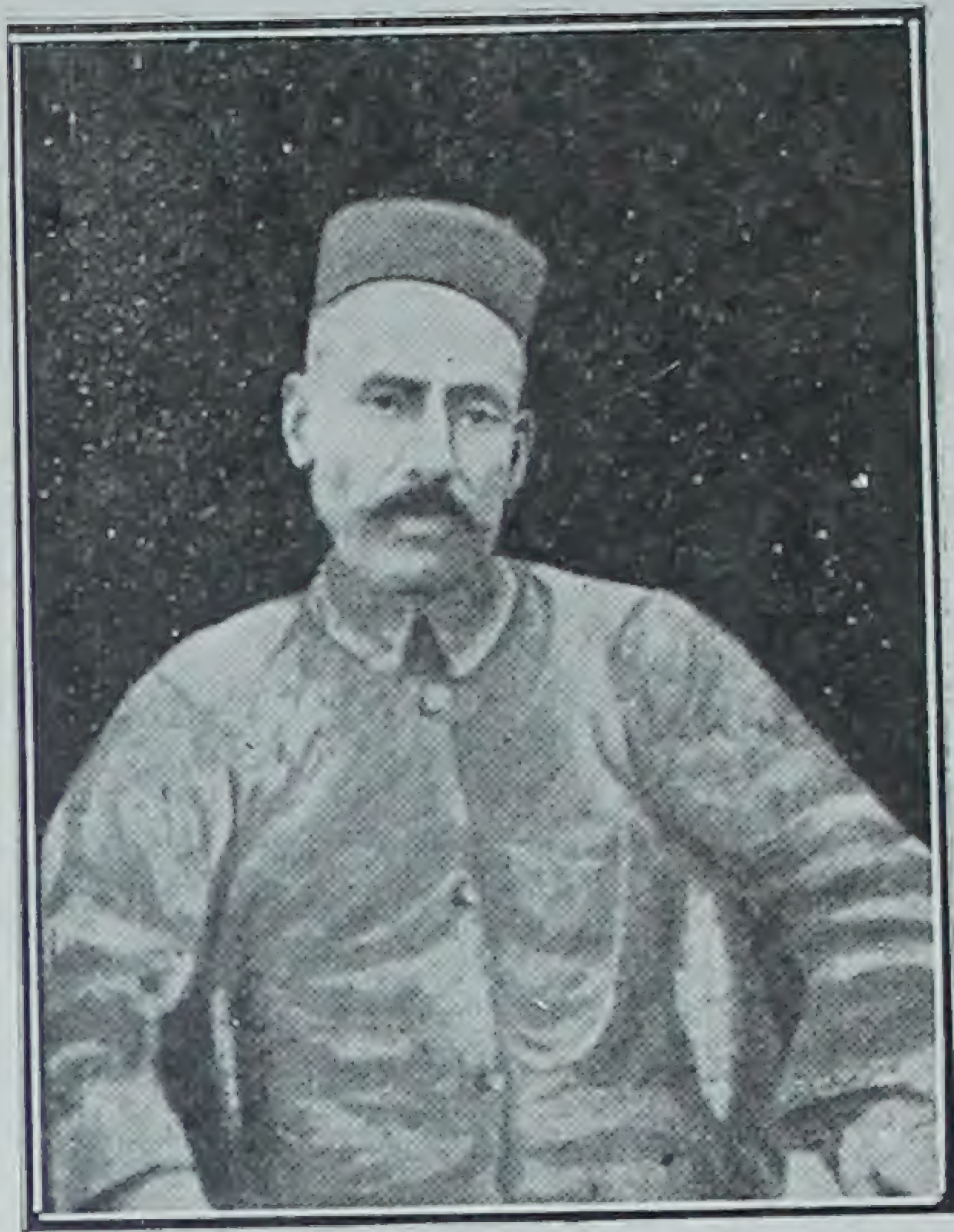
منشی نوبت رائے نظر

حضرت سرور جہان آبادی

جن سے عمدہ اخلاقی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں قلعہ آگرہ کے متعلق بھی ان کی ایک مشہور نظم ہے اس میں انھوں نے مسلمانوں کی ابتدائے ترقی کے دور نہایت موثر طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے راستے بتاتے ہیں ان کا یہ بھی قصد تھا کہ لغات اردو کی ترتیب اور قواعد اردو کی تکمیل نئے طرز سے کریں چنانچہ ان کے مسودات محفوظ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت ضرور شائع ہوں گے آخر عمر میں وہ حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانحعمری مستند کتابوں اور تاریخوں کے حوالے سے مرتب کر رہے تھے اور قران السعدین کی تنقید مکمل ہو چکی تھی کہ موت نے اس کام کو روک دیا۔ اسی طرح یہ بھی سنا جاتا ہے کہ ادب اُردو کی ایک تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ تھا مگر وہ بھی پورا نہ ہو سکا مختصر یہ کہ مولوی صاحب زمانۂ حال کے شاعروں اور نثاروں میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور طرز قدیم و جدید دونوں کا مجموعہ تھے۔

سُرورجہان آبادی

منشی دُرگا سہائے سُرورؔ کو بھی اُردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رکن رکین سمجھنا چاہیئے۔ یہ اُن لوگوں میں تھے جنھوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی اور کلام پُرانے اور نئے دونوں رنگوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے ان کا عمل "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر تھا یعنی پرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں عمدہ اور قابل قدر تھیں وہ لے لیں اور باقی کو چھوڑ دیا۔ مثلاً قدما کا درد و اثر اور بلند خیالی اور الفاظ کے ایجاز و اختصار کے ساتھ جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حب الوطنی کے جذبات نہایت خوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زمانہ حال کی معمولی بے لطف باتوں اور زمانہ گذشتہ کی غیر مہذب معاملہ بندی سے کلام پاک ہے۔ شُستگی الفاظ کے ساتھ بلند خیالی اور پاکیزگی ملی ہوئی ہے۔

سُرور کو شعر و شاعری سے حد درجہ کا شوق تھا بلکہ ان کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ

ان کو فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا ان کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک حقیقی شاعر کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ اکثر شعرا کا حال تھا۔ سرور بھی نہایت آزاد مزاج اور رند مشرب واقع ہوئے تھے فکر فردا سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے اسی وجہ سے وہ مصیبت و عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر یہ عسرت و مصیبت ان کے شاعرانہ شوق اور جذبات کو کبھی دھیما نہ کر سکی۔ وہ مذہبی تقشف اور تعصب سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ ان کو نمائش اور ظاہرداری کا شوق تھا بلکہ ان کی زندگی بے پروائی اور سادگی کا ایک بہترین نمونہ تھی ان میں دنیا کا مکر و فریب مطلق نہ تھا اور جو کچھ عیوب ان میں تھے وہ بھی ہنر معلوم ہوتے تھے سب سے بڑا عیب ان میں مے نوشی کا تھا مگر یہ بھی مرزا غالب کی طرح ان کی شاعری اور خیال آفرینی میں اکثر معین ہوتی تھی۔ گو کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی کمبخت عادت کی بدولت ان کی ہونہار اور قابل قدر زندگی کا بہت قبل از وقت خاتمہ ہوگیا صرف بہ عمر ۳۷ سال ۱۹۱۰ء میں انھوں نے انتقال کیا۔

ان کی شاعری کی خصوصیات | (۱) سب سے بڑی خصوصیت ان کی شاعری کی جذبات نگاری اور درد و اثر ہے اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مثل استاد الشعرا میر تقی میر کے سرور کے مزاج میں بھی حزن و یاس اور رنج و الم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اسی وجہ سے مثل میر کے ان کا کلام بھی جذبات نگاری کا ایک مرقع ہوتا تھا ان کی اس قسم کی نظمیں حسب ذیل ہیں:۔ دیوار کہن، حسرت شباب، اندوہ غربت، مرغان قفس، یاد طفلی، بلبل کا فسانہ، حسرت دیدار۔ ماتم آرزو وغیرہ۔

(۲) دوسری خصوصیت حب الوطنی ہے اس میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے بلکہ ان کو ہندوستان کا قومی شاعر کہنا بالکل بجا ہے۔ ان کے مخاطب صرف ان کے ہم مذہب نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری پبلک ہے۔ اس قسم کی ان کی نظمیں یہ ہیں۔ خاک وطن۔ ہوس حب وطن۔ حسرت وطن

یادِ وطن ۔ مادرِ ہند وغیرہ ۔ یہ مادرِ ہند بابو بنکم چندر چٹرجی کی مشہور نظم بندے ماترم کے طرز پر لکھی گئی ہے ۔ ان تمام نظموں میں حبِ وطن کا سچا جوش اور اعلیٰ خیالات ہیں ان کے سوا بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز کی ہیں مثلاً فسانہ گُل وبلبل ۔ شمع وپروانہ وغیرہ

(۳) اس کے بعد ان کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا نمبر ہے ۔ ان میں بھی صحیح جذبات صداقت ، فصاحت ، بے تکلفی اور روانی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں ۔ پدمنی ۔ پدمنی کی چِتا سیتاجی کی گریہ وزاری ۔ مہاراجہ دسرتھ کی بے قراری ۔ جمنا ۔ گنگا ۔ پریاگ کا سنگم ۔ ستی ۔ نورجہاں کا مزار ۔ حسرتِ دیدار اور نلدمنتی ۔ اس قسم کی نظمیں ہیں جو سب اعلیٰ خیالات اور درد واثر سے مملو ہیں ان سب میں "گنگا" اور "جمنا" خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں جو محاسن شعری کے علاوہ جذبات اور اثر سے لبریز ہیں ۔ یہ فی الحقیقت نہایت اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں ۔ "جمنا" میں علی الخصوص ہندوؤں کے قدیم تاریخی حوالے بہت دلچسپ ہیں

(۴) سُرورؔ کی چوتھی خصوصیت جو ان کو ان کے ہمعصروں سے ممیز وممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے اردو اشعار میں ہندی الفاظ کو کھپایا اور اس طرح کھپایا کہ اس سے شعر کے محاسن میں اضافہ ہو گیا ۔ علی الخصوص مذہبی نظموں میں انھوں نے پُرانے ٹھیٹ ہندی اور بھاشہ کے لفظ بہت استادی سے صرف کئے ہیں جن سے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح رامائن اور دیگر مذہب ہنود کی کتابوں کے بعض سین نہایت پُرزور لکھے ہیں ان کی تمام اس قسم کی نظمیں اہل ہنود نہایت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں ۔

انگریزی نظموں کے ترجمے | سرورؔ کو زبان انگریزی کا بہت محدود علم تھا مگر چونکہ طبیعت نہایت رسا اور شاعرانہ پائی تھی اس وجہ سے انھوں نے جو ترجمے انگریزی نظموں کے کئے ہیں وہ ہر چند کہ لفظی نہیں مگر پھر بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں ۔ اس قسم کی چیزیں بہت ہیں ۔ تقریباً بیس سے کم نہ ہوں گی ۔ بعض میں انھوں نے صرف کسی انگریزی نظم کا نام لے لیا ہے اور اس پر بالکل ہندوستانی طریقہ سے طبع آزمائی کی ہے ۔ مُرغابی ۔ ترانۂ خواب ۔ بچہ اور ہلال ۔ کارزارِ ہستی ۔ امید و طفلی

موسم سرما کا آخری گلاب - یہ سب اسی قسم کی نظمیں ہیں اور اپنے طریقہ میں بہت عمدہ اور دلکش ہیں - ایسی ہی نیچرل نظموں میں ان کی "بیر بہوٹی" اور "کوئل" کو بھی سمجھنا چاہیئے -

سرور نے بعض اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں مگر یہ خیال رکھا ہے کہ شعر کی خوبی اور دلکشی وعظ و نصیحت کی روکھی پھیکی باتوں سے کم نہ ہونے پائے - وہ شاعری کو وعظ پر مقدم جانتے تھے زن خوشخو - بے ثباتی دنیا - ادائے شرم - اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں اعلیٰ خیالات نہایت حسین پیرایہ میں ظاہر کئے گئے ہیں -

سرور کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق رہتے تھے اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے - ہر چند کہ انھوں نے مثنوی - غزل - رباعی قطعہ - قصیدہ - ترجیع بند - ترکیب بند - غرضکہ سب اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے مگر مسدس ان کو بہت محبوب تھا اور اس میں وہ بہت زور طبیعت دکھاتے تھے -

مختصراً ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں ا - جذبات نگاری - درد و اثر - اعلیٰ تخئیل نہایت پیاری اور میٹھی زبان قلبی کیفیات کا من و عن اظہار تنوع خیالات اور انکا اظہار نہایت شاعرانہ اور لطیف طریقہ سے خوبصورت الفاظ میں اور وسیع النظری - ان کا کلام دو مجموعوں میں شائع ہوا ہے ایک وہ جو زمانہ پریس کانپور سے ان نظموں کا نکلا جو بہ اوقات مختلف رسالۂ زمانہ میں خمخانۂ سرور کے نام سے چھپیں - دوسرا جام سرور کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا ہے - ان کا اکثر کلام ضائع ہوگیا مگر اس سے بھی بڑھ کر قابل افسوس یہ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے انکا کلام ہتھیا لیا کبھی معاوضہ کے ساتھ اور کبھی معاوضہ بھی ہضم کر گئے ان کے انتقال کے بعد جو خطوط شائع ہوئے ان سے صاف طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے ان سے مختلف مضامین پر کچھ نظمیں لکھوائی تھیں اور ان کو اپنے نام سے شائع کرادیا تھا اس سے یہ حقیقت کھل گئی کہ بعض حضرات جو خود تو شاعری سے بہرہ نہیں رکھتے مگر شعرا کی صف اول میں اپنا شمار کرانا چاہتے ہیں - دوسروں سے کچھ دے لے کے کہلوا لیتے

ہیں اور پھر اس کلام کو اپنے اسم گرامی کے ساتھ بے تکلف شائع کر دیتے ہیں

اکبر الہ آبادی | اکبر اپنے زمانہ کی ایک بہت بڑی ہستی تھے انھوں نے ایک نئے طرز کی بنا ڈالی جس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے اور اس طرز خاص میں ان کی نقل بالکل محال ہے ان کا کلام ممتنع التقلید اور ناقابل رسائی ہے ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بیمثل شاعر ہونے کے علاوہ ناصح قوم اور بلندپایہ صوفی بھی تھے نثر کے خطوط بھی نہایت دلچسپ لکھتے تھے اور ان سب کے ساتھ ادب سوسائٹی۔ اور حکومت کے زبردست نقاد اور ماہر سیاسیات تھے پھر مذاق و ظرافت میں تو یکتائے روزگار تھے۔

سید اکبر حسین رضوی نام ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء تاریخ ولادت ہے ان کے والدین مرفہ الحال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں پائی ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کرکے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے ۱۸۶۹ء میں ہائی کورٹ کی مثل خوانی کی جگہ ملی ۱۸۷۲ء وکالت کا امتحان پاس کرکے ۱۸۸۰ء تک وکالت کی پھر ملازمت سرکاری کی طرف میلان طبع ہوا اور منصف مقرر ہو گئے ۱۸۹۸ء میں سبارڈنٹ جج اور ۱۸۹۹ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوئے اس کے بعد خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ سے حاصل کرکے ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے

اخلاق و عادات | طبعاً نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے مذاق اور ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سوسائٹی کی روح رواں سمجھے جاتے تھے احباب کو جو ان سے ملنے آتے تھے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت طبعی سے بہت مسرور کرتے۔ خلق و مدارا۔ تہذیب۔ صداقت، ہمدردی اور مہماں نوازی ان کے خاص جوہر تھے بعض باتیں جو ان کے کلام میں " پالیسی" یعنی مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر محمول کی جاسکتی ہیں وہ ان کے ان خطوط میں جو خواجہ حسن نظامی۔ عزیز لکھنوی۔ منشی دیا نراین نگم وغیرہ کے نام ہیں ان کی راستبازی کا

صداقت شعاری پر دلالت کرتی ہیں انھوں نے بعض ایسی چیزیں بھی کہی ہیں جن کی ان سے توقع نہیں ہوسکتی تھی مگر وہ صرف اس لئے کہ خود کو اور دوسروں کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے مذہباً وہ سُنّی تھے مگر شیعوں سے کوئی مخالفت اور تعصب نہیں رکھتے تھے اسی عقائد میں ہرچند کہ وہ ایک پکے مسلمان تھے مگر مذہبی ناروا داری اور عصبیت سے کوسوں دور تھے آخر عمر میں عوارض اور مصائب سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ اپنی اہلیہ اور محبوب بیٹے ہاشم کے انتقال سے ان پہ بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ آخرالذکر کی وفات پر ایک دردناک قطعہ کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں کہ آئی تھی بہار	اب تجھے پا کر میں اے بادِ بہاری کیا کروں
بزمِ عشرت میں بٹھانا تھا جسے وہ اٹھ گیا	اب میں اے فرداتری امیدواری کیا کروں

اکبر کی شاعری اکبر فطری شاعر تھے بچپنے سے ان کو شعر کا شوق تھا چنانچہ ان کا ابتدائے عمر کا کلام ان کی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں فارسی اور عربی کی درسیات سے فراغت حاصل کی اور یہ معلومات ان کو آخر عمر میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ملازمت کے زمانہ میں انھوں نے انگریزی پڑھی اور اس میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی۔ اکبر کا دورِ شاعری ایک بسیط دور ہے جس کو انھوں نے خود پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے

پہلا دور ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک پہلا دور ابتدائے مشق سے ۱۸۶۶ء تک کا ہے اس زمانہ کا کلام پرانے رنگ کا ہے جو اُس زمانہ کا رنگ تھا یہ زمانہ ان کی نومشقی کا سمجھنا چاہیئے اس میں انھوں نے لکھنو اور دلّی کے مستند اساتذہ کی تقلید اور ان کے رنگ میں غزلیں کہیں اور اکثر مشاعروں میں پڑھیں ان غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم میں برتا جاتا تھا۔ مضامین بھی وہی مقررہ تھے جن پر برابر طبع آزمائی کی جاتی تھی اگرچہ ان میں کہیں کہیں جذباتِ عشقیہ بھی ہیں مگر صفائی، سادگی، حسنِ بندش۔ روانی وغیرہ بدرجہ احسن

پائی جاتی ہیں۔ اس وقت کے کلام سے آیندہ کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ اس میں کچھ تصنع بھی شامل ہے

دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۷ء عیسوی تک

اس عہد میں صداقت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں اصلیت بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ مشاقی کی جلا کلام کا جوہر ہے اور قادر الکلامی کا بھی پتہ چلتا ہے مروجہ اور معینہ مضامین کم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں ان پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ تصنع بے تکلفی اور اصلیت سے بدل گیا ہے۔ ذاتی رنگ حدود معینہ پر غالب آ رہا ہے۔ اشعار نے حشو و زوائد سے پاک ہو کر اپنی کینچل بدل دی ہے مگر غزلیں اس میں بھی دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ بہر طور اشعار کے درد و اثر، بندش اور طرز ادا میں بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۸۸ء سے ۱۹۰۸ء تک

یہ زمانہ بہت بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں شاعر کو اپنے کلام پر پوری طرح قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹولتے نہیں اور نہ کہیں ٹھٹکتے ہیں بلکہ ہمت اور اعتبار کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب ان کے کلام میں پختہ استادانہ رنگ آ گیا اور تجربہ اور نومشقی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اب کلام میں نوکاری کی جھجھک اور تردد نہیں باقی رہا۔ غزلیں اس دور میں بھی عنصر غالب ہیں۔ مذاق و ظرافت کا غلبہ ہے جس میں ابھی وہ بات نہیں جو کہ بعد کو حاصل ہوئی طنز سے بھی کلام آشنا ہوتا جاتا تھا۔ غزلوں کا رنگ اب پرانے رنگ سے علیحدہ ہو کر ان میں ایک اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جدّت ادا اور ظرافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے روحانیت اور تصوف بھی جلوہ گر ہے۔ غزلوں کا رنگ باعتبار مضامین اور طرز ادا کے تو بہت کچھ ترقی کر گیا ہے مگر پھر بھی خارجی رنگ زیادہ ہے اس زمانہ کا کلام ان کے کلیات اوّل و دوم میں داخل ہے۔

چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک

یہ دور بہت بڑی ترقی کا حامل ہے اس میں اور دور ماسبق کی نوعیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی کا

منتہم ہے اس دور میں اکبرفی الواقع "لسان العصر" ہوگئے ہیں. اس میں قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی اور حقائق و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق و ظرافت بدستور ہے بلکہ اور تیز ہوگئی ہے اور اسی رنگ میں واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت زبردست نکتہ چینی کی جاتی ہے اب ظرافت و شوخی بے لگام ہوگئی ہے اخلاقی، روحانی، فلسفیانہ اور سیاسی رنگ کے کلام میں زندہ ہے مگر ساتھ ہی عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے حسن و عشق کی زیر لبی گفتگو خاموش نہیں ہوئی مگر اب وہ سیاسیات کے غل غپاڑہ میں مدھم پڑ گئی ہے۔ اکبر اب اپنی صنعت کے صناع کامل ہوگئے ہیں اور کلام میں پختہ کاری آگئی ہے۔ خیالات میں تموّج ہے۔ قوت ابداع و ایجاد فن عروض کے قواعد اور مشکلات سے دبتی نہیں اظہار خیال کے نئے نئے طریقے اور راستے ذہن میں آتے ہیں اور ان کے واسطے نئے نئے دلچسپ قافیوں اور جدید استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ تصوف اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔

| پانچواں دور سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک | اس زمانہ کا کچھ کلام کلیات سوم میں شائع ہوگیا ہے

اس دور میں عاشقانہ رنگ گھٹ کر بہت قدر قلیل رہ گیا ہے اور اب اشعار بالکل سیاسی، اخلاقی، روحانی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یا پھر وہی ظرافت جلوہ فرما ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیئے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے کلام میں وہ جوش و خروش اور بانکپن نہیں جو زمانہ شباب کے کلام میں ہے اور یہ سچ بھی ہے اس لئے کہ طویل عمر نے ان کو زمانہ کے نشیب و فراز اور حقائق سے آگاہ کردیا ہے اب زندگی ان کی نظر میں ایک عمیق معنی رکھتی ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر ان کی نظر زیادہ جاتی ہے۔ اب چونکہ تجربہ وسیع ہوگیا ہے لہذا اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ آدمی ان کو اپنا دستور العمل بنائے اس زمانہ کا ان کا کلام بہت ہے۔ اس قدر کہ دو کلیات مرتب کئے جاسکتے ہیں سنا ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جنکو وہ صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے یعنی جن کی اشاعت ان کو منظور نہ تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے مرنے سے پہلے ایک کتاب مسمیٰ بہ "گاندھی نامہ" لکھی جس کو نان کوآپریشن

کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیئے مگر اس کتاب کو انھوں نے مصلحتہً نہیں شایع کیا۔

ان کا مطبوعہ کلام تین کلیات میں شامل ہے جن میں سے دو انکی زندگی میں طبع ہوئے تھے اور تیسرا ان کے صاحبزادے نے ان کے انتقال کے بعد شایع کیا خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی ایک اور شایع ہونے کو باقی ہے۔ اکبر نثر کے خطوط بھی بہت خوب لکھتے تھے ان کے مکتوب الیہ کثیر التعداد تھے جن سے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جو خطوط کہ انھوں نے خواجہ حسن نظامی، منشی دیا نرائن نگم احسن مارہروی، مرزا محمد ہادی عزیز اور مولوی عبدالماجد بی۔ اے دریا آبادی کے نام لکھے ہیں وہ چھپ گئے ہیں ان سے انکے اصلی مزاج کا رنگ اور بعض نج کے واقعات بخوبی معلوم ہوسکتے ہیں اور ایک عمدہ سوانحعمری تیار ہوسکتی ہے یہ خطوط نہایت دلچسپ اور لطیف مقولوں کی شان رکھتے ہیں مگر پھر بھی مرزا غالب کے خطوط کی بات ان میں کہاں۔ اکبر کوئی بڑے نثار نہ تھے لہذا ان کی کوئی نثر کی چیز سوائے ان خطوط اور اودھ پنچ کے مضامین کے جو پڑھنے کے قابل ہیں موجود نہیں ہے اودھ پنچ ہی سے انھوں نے غالباً ظریفانہ رنگ اخذ کیا ہوگا۔

اکبر کی غزلیات چستی بندش، روزمرہ، سلاست، روانی، بے تکلفی، اعلیٰ تخئیل، اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ ان کے اشعار دنیا کی بے ثباتی، دنیاوی جاہ و ثروت کی بے حقیقتی اور دنیاوی مسرتوں کی ناپائداری کے مضامین سے مملو ہیں اور درد و اثر اور حزن و یاس کے مضامین بھی بکثرت ان میں موجود ہیں مگر اکبر کی شہرت زیادہ تر ان کی غزلوں پر مبنی نہیں کیونکہ ان سے ان کی مجموعی قابلیتوں کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے نمونہ کے طور پر چند منتخب اشعار ان کی غزلوں کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

رنگ قدیم

چال نثار دل کے سوا کوئی نہ دیکھے سوے دوست رقص کرتی ہے نسیم صبح کیوں مستانہ وار	چال ہے تیغ قضا کی جنبش ابروے دوست گلشن دل سے اُڑا لائی ہے شاید بوے دوست

کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقش پائے یار سے
غیرت داماں گلچیں ہو رہا ہے کوئے دوست

میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں
جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکس روئے دوست

لکھا ہوا ہے جو رونا مرے مقدر میں
خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف

نگاہ پڑتی ہے ان پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یہی نظر ہے جواب قاتل زمانہ نہ ہوئی
یہی نظر ہے کہ اٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

ہزار جلوۂ حسن بتاں ہو اے اکبر
تم اپنا دھیان لگائے رہو اسی کی طرف

کوئی پہونچا نہیں اے یار تیرے قدر رعنا تک
ہماری فکر عالی سرو سے ہو آئی طوبیٰ تک

زمین پر شمع روشن ہے فلک پر ماہ تاباں ہے
تمہارے نور سے ہیں فیضیاب ادنیٰ سے اعلیٰ تک

جو اس نے ناز سے پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے
خوشی سے یہ ہوئے بیخود کہ ہم بھولے تمنا تک

کہیں دل ہوں کہیں ہیں باعث بیتابی دل ہوں
کہیں انداز بسمل ہوں کہیں ہیں ناز قاتل ہوں

کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہد معنی
کہیں ہوں محمل لیلیٰ کہیں لیلائے محمل ہوں

کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
کہیں مجبور مطلق ہوں کہیں مختار کامل ہوں

کہیں تصویر حیرت ہوں کہیں محو پریشانی
کہیں ہوں شیفتہ رخ کا کہیں زلفوں کا مائل ہوں

کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں

رنگ متوسط

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
اب گرد رہ گئی ہے وہ میلا نکل گیا

ہر اک شے میں نظر آتی ہے اک صورت یاس
شغل اب کچھ بھی نہیں فسخ عزیمت کے سوا

مطمئن ہو کے لگاتا ہوں لحد میں بستر
اب اٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

پیغام آ رہا ہے دل بے قرار کا
قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

شائق ہوا ہے بوسۂ دامان یار کا
اللہ رے حوصلہ مرے مشت غبار کا

باغ جہاں میں کوئی روش بے خلش نہیں
شمس و قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر
اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا مزا
ہے سبب جوشِ جنوں کا رنجِ ہجراں اے حضور
عشقِ بت میں کفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا
تجربہ نے حبِ دنیا سے سکھایا احتراز
عالمِ ہستی کو تھا مدِ نظر کتمانِ راز

دوڑاؤں گل پہ ہاتھ تو کھٹکا ہے خار کا
کیا شعبدہ ہے گردشِ لیل و نہار کا
جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا
آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آجائے گا
جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا
پہلے کہتے تھے فقط منہ سے اور اب کرنا پڑا
ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

شعر غیروں کے اسے مطلق نہیں آئے پسند
حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا

(رنگ آخر)

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے
حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سنے

شدتِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا
عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا
دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا

دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اس میں
آپ اکبر سے عبث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

بے تعلق منزلِ ہستی سے گزرا دل مرا
نہیں ہے کام زباں کا کچھ اب دعا کے سوا

اس کی نظروں میں سزاوارِ تمنا کچھ نہ تھا
نظر کسی پہ نہیں ہے مری خدا کے سوا

کروں کیا غم کہ دنیا سے ملا کیا
یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل
وہاں قالوا بلیٰ یاں بت پرستی

کسی کو کیا ملا دنیا میں تھا کیا
نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا
ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا

الٰہی اکبر بیکس کی ہو خیر
میرے دل سے امتیاز دی و فردا اٹھ گیا

یہ چرچے ہو رہے ہیں جابجا گیا
حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اٹھ گیا

جہان فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہے اکبر
جو ہو چکا ہے وہ پھر نہ ہوگا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا
غور جب ہم نے کیا سائنس کو دنیا پایا

نبی کو سمجھا نہیں ہوں اب تک اگرچہ وہ اصل مدعا ہے
خدا کو البتہ جانتا ہوں خدا ہی ہے جو ہو رہا ہے
جدائی نے میں بنایا مجھ کو جدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

دوں گا ذرا سمجھ کے جواب ان کی بات کا
رخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا

دہر میں سوختۂ گرمیِ بازار نہ ہو
دل میں ہوں تو سودا کا خریدار نہ ہو

نقش دل ہو صفت معنیِ رنگین اے دوست
رنگ ظاہر پہ نہ جا نقش بہ دیوار نہ ہو

سانس کی طرح چلے منزل ہستی میں بشر
مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہ ہو

نہیں آزاد جو اپنوں سے تعلق کرے قطع
وہ ہے آزاد جو غیر دل کا گرفتار نہ ہو

بزم ہے شعلہ مزاجوں کی سنبھل اے اکبر
برق خرمن کہیں یہ گرمی گفتار نہ ہو

جنون عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے
یہی ہستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے

یہ سچ ہے یہ خبر ہے نصف دنیا نصف دنیا سے[1]
کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے

وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبر
کہ امید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت

اکبر کی خاص شہرت ان کی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیفہ، ظریفانہ پر

[1] مقابلہ کرو آدم اسمتھ کے اس مقولہ سے کہ مفلسی ایک راز ہے جو نصف دنیا نصف دنیا سے چھپاتی ہے ۱۲

بنی ہے جو اُن کی زرّیں نظموں میں آبدار موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں ۔ ان کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا مگر وہ بہت جلد اس سے گزر کر ترقی کے مدارج اعلیٰ تک پہونچ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں ان کو اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اس زمانہ کے کلام میں بھی متین اشعار کے ساتھ کہیں کہیں مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور سوسائٹی کا رنگ بدلتا گیا اُن کے اس رنگ میں ترقی ہوتی گئی اور پختہ کاری آتی گئی اس رنگ نے ان کی شوخ طبیعت کے واسطے نئے راستے کھول دیئے اور انھوں نے اس سے نہایت مفید خاص خاص کام لینا شروع کئے۔ اس رنگ میں حقیقتاً وہ بے مثال رہے اور ہر چند کہ بہت سے لوگوں نے ان کی نقل کرنا چاہی مگر صحیح معنوں میں کوئی ناقل نہ ہوا سب نقال رہے۔ وہ حقیقی ظرافت اور شاعرانہ دل و دماغ کا مجموعہ تھے۔ ان کا تیسرے دور کا کلام خاص کر اس رنگ میں بہت کامیاب ہے اس میں ان کی ظرافت محض ظرافت ہے آخر میں البتہ اس طرز و روش میں فرق آگیا ہے اور وہ ظرافت کے پردے میں اور بہت سے مفید مضامین ادا کر جاتے ہیں اس وقت اگرچہ وہ نحیف و نزار ہو گئے تھے مگر شاعرانہ دل و دماغ برابر اپنا کام کر تا تھا اس زمانہ میں وہ ظرافت اور بذلہ سنجی کو۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی مسائل کے ادائے مطالب کا ایک مؤثر ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ مقصود بالذات صرف ظرافت نہ تھی بلکہ تعلیم حقائق مقصود اصلی تھی۔

اکبر کی ظرافت کے اجزا حسب ذیل ہیں :-

(۱) جدید اور لطیف تشبیہیں اور تمثیلیں جو عام مشاہدے کی چیزوں میں برتی جاتی ہیں اُن میں وہ تصنع اور نازک خیالی سے کام نہیں لیتے بلکہ انھیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو ہر شخص دیکھتا ہے اور جانتا ہے اور انھیں کے بیان میں ایک خاص جدت اور لطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے دل مزے لیتا ہے۔

(۲) نئے نئے با مذاق الفاظ مختلف زبانوں کے آخر شعر میں بطریق قافیہ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معمولی الفاظ ایسے انوکھے طریقہ سے استعمال کرتے ہیں جو اس سے قبل کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔

(۴) ایسے معمولی اور سُبک الفاظ جن کو شعراء عام طور پر استعمال نہیں کرتے وہ شعر میں نہایت جدت طرازی اور خوش کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کی اتنی کثرت ہے کہ ان کی ایک مختصر فرہنگ تیار ہو سکتی ہے۔ مثلاً کلو۔ صلو۔ بُدھو جمّن وغیرہ کہ یہ ان کے خاص اصطلاحات ہیں اور وہ ان کو خاص خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ معمولی معمولی الفاظ مثلاً گٹ پٹ فالتو۔ یا اکثر بازاری محاورے جو شعر میں نہیں کھپ سکتے اور عام طور پر کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے کلام میں وہ نہایت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح ایسے بھی الفاظ ہیں کہ جو دیگر شعرا کے یہاں اور معنی میں استعمال ہوئے ہیں مگر اکبر ان کو بالکل دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی لکھ جاتے ہیں جو اُردو میں ہنوز مروج نہیں ہوئے اور کلام میں ثقیل اور بے میل معلوم ہوتے ہیں۔ اس تراش خراش میں انھوں نے محض اپنی طباعی اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ کوئی رنگینی عبارت یا عمق معنی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ہنسنا ہنسانا مقصود ہے۔

اکبر کی ظرافت کو محض بذلہ سنجی اور تمسخر نہ سمجھنا چاہیئے، اس کی تہ میں نہایت لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا تعلیمی، سیاسی ہو یا معاشرتی ادب آموز ہو یا روحانی ہمیشہ اس میں پنہاں ہوتی ہے ان کے الفاظ اور معانی میں ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اُن کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور نہ ان کا مذاق عامیانہ اور سوقیانہ ہوتا ہے ان کی ظرافت بہت جامع اور وسیع ہوتی ہے وہ کبھی کسی مخصوص شخص یا جماعت کا خاکہ نہیں اُڑاتے بلکہ ان کی ظرافت کے تیر بلا لحاظ مراتب سب طرف چلتے ہیں۔ البتہ واقعات و سیاسیات حاضرہ ان کی خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ مغربی طرز تعلیم اور ہندوستان میں انگریزی تہذیب کی دلدادگی پر انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کی خرابیوں

اور تعلیمی اور مذہبی نقائص کو بھی نشانہ ظرافت بنایا ہے۔ امیر و غریب۔ عالم و جاہل، ہندو
مسلمان، سنی شیعہ، سب کی بلا امتیاز و تفریق خبر لی گئی ہے ان کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے
کہ سیاسیات سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ اس قسم کے بعض اشعار بادی النظر میں تو معمولی معلوم
ہوتے ہیں مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو ان میں تیر و نشتر بھرے ہیں

اکبر کی خاص اصطلاحات یہ ہین۔ مس۔ شیخ۔ سید۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا۔ مسجد۔ مندر۔ بت
کالج۔ برہمن۔ لالہ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ جو ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ مس سے مغربی تعلیم
کی نظر فریبی اور دلکشی۔ شیخ سے پرانے رنگ کے مسلمان جو اپنے مذہب کی باتوں سے تو واقف
ہین مگر انگریزی تہذیب سے بالکل ناآشنا ہیں سید سے سرسید مرحوم جو انگریزی تعلیم و تہذیب
کے دلدادہ تھے۔ یا ان کے تبعین یعنی علی گڈھ کالج کی تعلیم کے عاشق اسی طرح اونٹ سے
مسلمانون کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے مسلمان ہندؤں کا اتحاد مراد ہے

اقسام ظرافت اکبر کی ظرافت مندرجہ ذیل اقسام پر تقسیم ہو سکتی ہے، مذہب۔ سیاسیات
تہذیب جدید۔ پردہ و تعلیم نسواں۔ ظرافت الفاظ۔ طنزیات

ان سب اقسام کے نمونے بالترتیب مختصراً پیش کئے جاتے ہین:۔

مذہب

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
چہرے کے نیچے قہر ہے داڑھی کا جھول جھال

بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبرؔ
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی

پیتا ہوں شراب آب زمزم کے ساتھ
ہے عشق حقیقی و مجازی دونوں

فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں
اس فرد کو بچایئے تفصیل ذیل سے

یہاں تو شیخ کو دھن ہے بگل بجانے کی
اب صرف سنخ کرتے ہیں دیسی شراب کو

رکھتا ہوں اک وظیفہ بھی ٹمٹم کے ساتھ
قوال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی
آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی

پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی
چاقو ولایتی نہیں دیسی چھُرا سہی

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں اُن کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

بے نمازوں میں ہیں وہ اور اس پہ شرماتے نہیں
یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں
نسبت کس مصروف کار دیں بہ قلب مطمئن
یک فنا فی الآنریست دیگ فنا فی اللّٰہ اردون

شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے
ہیں مگر اونٹ پر ہمیں قابض!
اونٹ کے سب لغات جانتے ہیں
کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذان
ہاں تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

سیاسیات

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں
نو کھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں
اٹم ہر کیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں
مُرید ان کے تو شہروں میں اکڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو
کہہ دیا صاف ہم نے لے مہراج
با مقیمان کوئے دلدار ہم
کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو
ہو مبارک تمھیں یہ کام یہ کاج
یا ڈیپوٹیشن ست یا غم میم
جب توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو

یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
گلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی
کا سیاسی کا شد لیتی پہ ہر اک در بستہ ہے
پانچ ٹوٹا رام نے کھولی گرہ پھر بستہ ہے

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

مولانا حسرت موہانی

اصل کا اس بت خود بین سے کوئی ہنٹ کہاں
صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

ممبر علی مُراد ہیں یا شکھ ندہاں ہیں !
لیکن معائنہ کو وہی نابدان ہیں

تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوق لیلائے سول سروس نے اس مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

جامۂ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں
پھینکیئے اب کوٹ کو تہ کیجیے پتلون کو

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی
نہ وہ وضع ملت نہ قران خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی

ہر اک شاخ میں پاس یہ لے ہوا ہے
مرا لال کالج کا کاکا توا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

ٹرخا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کر کے
سیدؔ بھی گورے کھسکے برسوں مساس کر کے

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے

پردہ تعلیم نسواں

پردہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ ساماں تو ہیں
حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلماں تو ہیں

غریب اکبر نے بحث پردہ کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لیگا مرا موا کیا

اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون ساحق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے

بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے
ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بمبے کا پانی ہے

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
ہمارے ملک میں ہونا ہے تعلیم نسواں سے

استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
بجز اس کے کہ باوا اور بھی گھبرائیں اماں سے

ظرافت الفاظ

ح حکومت کی جب یہاں نہ رہی
ہر طرح اب ہے عاجزی ہم میں

حنفی نفی ہیں معطل ہیں
اب ہمارے امام خنبل[1] ہیں

اذانوں سے سوا ایدا ورکن انجمن کی سیٹی ہے
کہاں باقی رہے ہم میں وہ اوراد سحر گاہی
گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبر
شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام
شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرمادیا
پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا

اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے
وظیفہ کی جگہ یا پانیر یا آئی ڈی ٹی ہے
کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وسکی کبھی ٹی ہے
گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

عہد اسلام و عہد انگلش میں
پہلے توحید تھی تو اب تحصیل

سُنئے قول اکبر سخن گو کا
آگے غل ایک کا تھا اب دو کا

طنزیات

آئندہ اگر ملے جو ہے نام و نمود میں
دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ

کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت میں
فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

[1] انگریزی میں ہنبل بمعنی عاجز کے ہیں۔

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

ہماری مجلسیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
شیخ جی کو جو آگیا غصّہ
تم ہو شیطان کے مطیع و مرید
ہے تمہاری نمود بس اتنی

بنا نقش تھے قبل اس کے اب اسپر کے ہتو ہیں
گو تقدس مآب بے شک ہیں
چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں
لگے کہنے یہ پھینک کر دُھسّہ
تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید
جس طرح ہو پڑی پریڈ پہ لید

استحصال بالجبر

یعنی ایسے اشعار جو ادنیٰ تغیر الفاظ سے کلام اکبر بن گئے ہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حال قوم
کریما بہ بخشائے بر حال بندہ
رشتۂ درگردنم افگندہ پیٹ

صلوٰۃ است رائج در ایشان نہ صوم
کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ
نے برد ہر جا کہ کیک ست و پلیٹ

پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے
ہوگئی اب خیال کی اصلاح

ہر چہ از باپ میرسد نیکوست
ہر چہ از آپ میرسد نیکوست

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر
ہیٹ را نہ بر سر من جائے دستار لے عزیز
عمر گزری ہے اسی بزم کی طراری میں
ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقہ سے کم خالی
الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناد لہا
بکن تزئیں پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون

کرزن چہ گفت و دل چہ شنید و ملر چہ کرد
مردتا مسٹر تو اند شد چرا قبلہ شود
دوسری نشست ہے چندہ کی طلبگاری میں
چلو بس ہوچکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی
کہ قرآن سہل بود اول و لے افتاد مشکلہا
کہ سر سیّد خبردار د ز راہ و رسم منزلہا

سکۂ زر با بوے در دھوتی زنّار داشت	با وجودش نالہائے زار در اخبار داشت
گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست	گفت مارا خوف فیس و ٹیکس در این کار داشت
در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست	بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست
یاد دار ایں قول مولانائے روم	مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست
ہم ڈنر خواہی و ہم آردنغ صاف	ایں خیال ست و محال ست و گزاف

اکبر کی سیاسی نظمیں

اس قسم کی نظمیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں محض ظرافت ہی ظرافت ہے یعنی ایک عمدہ خیال ظریفانہ طرز میں ادا کیا گیا ہے اور بس ان کا مقصد صرف خوش طبعی ہے دوسری وہ کہ جن میں ظرافت کے پردہ میں سیاسی معاملات اور حقائق مضمر ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں مصنف کی رائے کے ساتھ ان کی ذاتی ناراضی اور غیظ و غضب بھی شامل ہے۔ ان میں ظریفانہ انداز صرف اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ حق بات کی تلخی دور ہو کر شاعر کا دلی مطلب سامع کے دل میں اتر جائے۔ اس قسم کے اشعار سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک ہوشیار ڈاکٹر شکر آلود تلخ گولیوں سے لیتا ہے۔ معمولی اشخاص کے واسطے ایسے اشعار صرف ہنسنے ہنسانے کا کام دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ اُن کے انداز طبیعت سے واقف ہیں ان کے وہ بہت عمیق معنی رکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کو چاہیئے کہ اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنے کے واسطے وہ ذرا غور و فکر سے کام لے سیاسی اشعار میں وہ مغربی طرز معاشرت کی حقیقی اور اصلی کیفیت دکھلاتے ہیں ان کے نزدیک یہ سب دام ہیں جو مشرقی روحانیت کو شکار کرنے کے لئے بچھائے گئے ہیں۔ سیاسی حقوق کو وہ محض زنجیر غلامی کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں جو سیدھے سادے ہندوستانیوں کے پھانسنے کی تدبیریں ہیں۔ ان کے نزدیک سرکاری اسکول ایسے کارخانوں سے زیادہ نہیں جن میں کلارک لوگ تیار کئے جاتے ہیں اور غلامی ذہنیت اور بڑھائی جاتی ہے اور انگریزی تعلیم سے زنجیر غلامی کی کڑیاں اور بھی کسی جاتی ہیں وہ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی سے معشوق کی کمر کی تلاش کرلیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو اکبرؔ شوریدہ سر کا حال	خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

عیسائیت کے اس فرسودہ اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بذریعۂ شمشیر پھیلایا گیا وہ پوچھتے ہیں کہ کیا یورپ بھی اپنی توپوں اور مغربی ساز و سامان کی چکاچوند سے روپیہ وصول نہیں کرتا اور رعایا کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس قسم کے اشعار کو ان کی ذاتی رائے سمجھنا ضروری نہیں کیونکہ اکبر ایک بڑے شاعر تھے۔ سیاست داں نہ تھے۔ انھوں نے علم پالٹیکس کی تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور مختلف عہدہ ہائے سرکاری پر اپنے فرائض منصبی قابلیت سے انجام دیکے پنشن پا گئے تھے اور حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب بھی ملا تھا چونکہ وہ شاعر تھے لہذا ہر قسم کے خیالات کا اظہار شعر ہی میں کرتے تھے اس سے غرض نہیں کہ وہ خیال ان کا ذاتی ہوتا یا کسی دوسرے کا ہوتا تھا۔ ان کو خیال کی واقعیت سے سروکار نہ تھا بلکہ اس کے طرز ادا سے تھا وہ کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی گورنمنٹ کے خلاف لکھتے تھے اور چونکہ شاعر تھے لہذا نتائج کی گرفت سے بے خوف تھے ان کی رائیں جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں کسی ماہر سیاسیات کی مستند رائیں نہیں شمار کی جا سکتیں۔ کیونکہ ان کے مقولوں میں بعض جگہ اختلافات بھی ہیں۔ وہ فطرتاً بہت محتاط تھے اور کوئی ایسی رائے نہیں ظاہر کر سکتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کو دشواریاں پیش آئیں وہ شاعر پہلے ہیں اور ماسوائے شاعر بعد کو ان کا مقدم فرض منصبی خوش کرنا ہے خیالات کا اظہار اس کے مابعد ہے وہ کسی گروہ یا جماعت کی کمزوریوں کی گرفت کرتے ہیں اور ان کو اپنے اشعار میں نہایت مختصر جامع اور ظریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مسلمانوں کے معترف ہیں کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ دوسرے مواقع پر وہ اسی تعلیم مغربی کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ بے دینی اور لامذہبی کا زینہ ہے۔ وہ اخلاقی مسائل کو کسی رفارمر یا فلسفی کی طرح شرح و بسط سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان کو اپنے اشعار میں دلچسپ مختصر طریقہ سے بیان کر جاتے ہیں مگر یہی اختصار مضمون کو بہت معنی خیز اور پرزور بنا دیتا ہے پھر الفاظ کے انتخاب میں ان کو وہ ید طولیٰ حاصل ہے کہ ایک ہی لفظ سے کئی کئی معنی نکلتے ہیں جو بادی النظر میں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ان کے نزدیک تمام سیاسی امراض کی جڑ ہندوستان کی کمزوری ہے ہماری

خوشامد اور گڑگڑانے سے اور اسی طرح آہ وزاری اور اضطراب سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ یہ قوئی کا بیکار مصرف اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اسی طرح انھوں نے کانگریس کی کارروائیوں انتہا پسند جماعتوں اور جابرانہ حکومت کے نقائص کا بھی خوب خاکہ اڑایا ہے یہ سب مضامین نہایت نادر استعارات، لطیف اشارات اور بلیغ ظرافت کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ معمولی پڑھنے والوں کے واسطے تو وہ محض ایک زعفران زار ہیں مگر چشم حقیقت بین ان کی تہ میں ایک معنی دیکھتی ہے۔ ان کے اشعار میں محض سماعی اثر سے بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کے بعض اشعار پر گورنمنٹ کو جنگ عظیم اور بلوۂ مسجد کانپور کے زمانہ میں ان کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ شورش انگیز مضامین لکھنے سے آیندہ اجتناب کریں۔ اُن کے اشعار بہت مؤثر تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے اس واسطے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ اور عامی سے عالم تک ان کو پڑھتے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان کا مطلب نکال کر ان سے محفوظ ہوتے تھے۔ اُن کے کلام کی یہ بھی ایک خاص صفت ہے کہ اُردو اور ہندی زبان کے دلدادہ دونوں اس کو مساوی طریقہ پر پسند کرتے ہیں سیاسی اور اخلاقی میدان میں اکبر ایک قومی شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم نے اپنا قومی امتیاز اور قومی آئیڈیل چھوڑ دیئے اور مغربی معاشرت اور مغربی تعلیم کے دلدادہ ہوگئے ان کا یہ اعتقاد ہے کہ روحانیت مادیت پر ضرور غالب آئے گی تمام سیاسی مشکلات کا ان کے نزدیک حل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل کی جائے اور قدرت خداوندی پر پورا بھروسہ رکھا جائے۔

اکبر بحیثیت نکتہ چیں سوسائٹی اکبر کی شاعری کی نمود کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جنم لے رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی شراب خالص ہندوستانیوں کے دماغوں میں اتر کر گئی تھی جس کی وجہ سے اعتدال دماغی وہ کھو بیٹھے تھے ہندوستان ایک عجیب انقلاب کا جولانگاہ تھا مغربی تمدن، مغربی اخلاق و معاشرت، غرض کہ ہر قسم کی مغربیت آنکھوں کو خیرہ اور دماغوں کو تیرہ کر رہی تھی ہندوستانی لوگ مغربیت کے اتنے دلدادہ ہوگئے تھے کہ انگریز بننا اپنا فخر سمجھتے تھے اس قسم

لوگوں کو اس میں خاص لطف آتا تھا کہ پرانی تہذیب اور پرانے خیالوں کا خاکہ اڑائیں وہ ہر ہندوستانی چیز کو نگاہِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام۔ یورپی لباس۔ یورپی طعام یورپی وضع و قطع مرغوبِ خاطر تھی انگریزی گفتگو ایک خاص طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی ہر انگریزی چیز خواہ کیسی ہی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ فاتحوں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پالیا تھا۔ قدیم رسم و رواج حتیٰ کہ مذہب کی بھی بے احترامی اور رسوم شکنی کی ہوا چلی ہوئی تھی یہی پُرآشوب زمانہ تھا کہ اس میں کچھ انجام بین ہستیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ یہ لوگ آیندہ خطرے سے واقف تھے انھوں نے ان تیز رفتار لوگوں کو جو شترِ بے مہار کی طرح منھ اٹھائے چلے جاتے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے خطرات سے آگاہ کیا بنگال کا نامور افسانہ نگار بنکم چندر چٹرجی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے پُرزور اور دلچسپ ناولوں میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی کا جو خاکہ اڑایا ہے اور جو کام اس کے افسانوں سے نکلا وہ بہترین وعظ و نصیحت اور سخت ترین نکتہ چینی سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا اکبر نے بھی یہی روش اختیار کی مگر انکا حربہ بجائے نثر کے نظم تھا۔ انھوں نے بھی اس زمانہ کی حماقتوں کو خوب لتاڑا اور لوگوں کے غرور اور طرزِ روش کا لطیف جوابات الزامی سے خوب خاکہ اڑایا ہے مگر بعض جگہ وہ چوک گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں انھوں نے تناسب حالات اور مصالح وقت کا خیال نہ کر کے بسا اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑنا چاہا ہے وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیرپا فوائد کے بھی قائل نہ تھے شاید اسی وجہ سے یعنی انتہائی قدامت پسندی سے پوری پبلک ان کے ساتھ نہ تھی[1] اور اسی وجہ سے انکی شہرت پر کسی قدر اثر پڑا ہے[۱]

[۱] یہ مصنف صاحب کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکبر ایک بہت مذہبی شخص تھے اور آخر عمر میں تو علی الخصوص ان کا کلام مذہب اور روحانیت سے مملو تھا وہ ترقی اور تہذیب کے کسی حال میں منکر نہ تھے عام اس سے کہ وہ مردوں میں ہو یا عورتوں میں۔ مگر جب اس ترقی و تہذیب کا تصادم مذہب سے ہوتا تھا تو وہ ہر ار تہذیبوں کو مذہب پر قربان کرنا پسند کرتے تھے مگر اس سے ان کے کمال اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا اور کوئی جماعت ایسی نہیں ہے کہ جو ان کے کمال فن کی قائل اور معترف نہ ہو محض اسوجہ سے کہ وہ ابن الوقت نہ تھے بلکہ برعکس اس کے یہی احترام مذہب مثل ظرافت کے ان کا طرۂ امتیاز ہے ۱۲۔ مترجم

اس نئے انقلاب کے زمانہ میں سرسید سب سے پہلے شخص تھے جو مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متاثر ہوگئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے جونکانے اور انکو قعر مذلت سے نکالنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے برخلاف اس کے اکبر تہذیب جدید کی کامل تقلید اور اس کی ہر بات ماننے کے مؤید نہ تھے ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمام تر بُری اور ناقابل تقلید ہے صحیح نہ تھا وقت کے سیلاب کو روکنا یا اسکے مخالف چلنا عقل کی بات نہیں ہے اکبر جدید تعلیم کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ اس میں مذہب کو بالکل بھلا دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے لوگ آزاد خیال ہو کر مذہب کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ وہ پردے کے قیود کو کم کرنے یا توڑنے کے بھی سخت مخالف تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس میں بڑے بڑے نقصان ہیں ان کو معلوم تھا کہ انگلستان اور یورپ و امریکہ وغیرہ میں اس جنسی آزادی اور ارتباط سے بُرے بُرے نتیجے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ اس خیال سے کانپتے تھے کہ اگر اسی قسم کا اختلاط مردوں اور عورتوں میں ہندوستان میں واقع ہوا تو اس سے کتنا بڑا طوفان برپا ہوگا ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن میں بعد المشرقین واقع ہے اس ملک کے حالات خیالات روایات رسوم و رواج یورپ سے بالکل مختلف اور اکثر متضاد ہیں۔ یورپی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہیں کیونکہ اس میں اور انمیں زمین و آسمان کا فرق ہے اسی طرح وہ مغربی طرز پر تعلیم نسواں کے بھی سخت مخالف ہیں کیونکہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر ضرور اثر پڑے گا انھیں وجوہ سے انھوں نے مغربیت پسندی کا اپنے اشعار میں خوب خاکہ اڑایا ہے اور جا بجا ایسے طنز کئے ہیں ہندوستانی عشاق کو ان کی رائے میں کتاب محبت کا سبق اپنے ہم مشربان یورپ سے لینا پڑیگا اور ہندوستانی معاشیق کو ادا و ناز اور کرشمہ وغمزہ کا انداز اپنی یورپین ہمجنسوں سے سیکھنا پڑیگا کمیٹیوں اور چندوں کا زمانہ ہے مردوں اور عورتوں دونوں کے خیالات اور جذبات اور اخلاق ہر چیز میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے پرانے قومی آیڈیل لوگ کھو بیٹھے یا ان کو عمداً حوالہ ماضی کر دیا۔ علما عصر نے اپنی قدیمی وضع چھوڑ کر شہرت پرستی اور نفس پرستی اختیار

کرلی۔ صوفی اب اپنے زہد و ورع کی تجارت کرنے لگے۔ علماء مثل سابق کے شمع ہدایت نہیں رہے عورتیں "چراغ خانہ" سے "شمع انجمن" بن گئیں۔ مادیت کا دور دورہ ہے۔ قناعت اور خودداری چھوڑ کر لوگوں نے ترقی کا زینہ خوشامد اور چاپلوسی کو ٹھہرا دیا۔ غرضکہ یہ اُمور مذکورہ بالا اس نئے زمانہ کے تبرکات ہیں اور ان سے کسی قسم کا بھی فائدہ متصور نہیں ہے اسی انتہائی قدامت پسندی کی وجہ سے وہ سرسید اور ان کے متبعین یعنی تعلیم علی گڈھ کے حامیوں کے سخت مخالف تھے۔ جس قدر سرسید کی رفتار ان کے نزدیک تیز تھی اسی قدر ہمارے نزدیک ان کی روش سست تھی۔ اکثر اس قسم کے اختلافات ضرورت شعری پر بھی مبنی کیے جا سکتے ہیں۔

اکبر نہ صرف جدید خیالات اور جدید تہذیب کی اشاعت کے شاکی ہیں بلکہ وہ قومی تہذیب و تعلیم کے زوال کے بھی نوحہ گر ہیں۔ وہ درستی اخلاق احیائے علوم قدیمہ اور ان خرابیوں کے جو مشرقی شائستگی میں بیرونی اثرات سے داخل ہو گئی ہیں دور کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ وہ تعلیم نسواں کے اصولاً مخالف نہیں مگر اس کا صحیح طریقہ پر رواج چاہتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہے کہ عورتیں تعلیم پا کر اچھی بیویاں اور اچھی مائیں۔ قومی جائداد نہ بنیں۔

تعلیم عورتوں کو ضروری تو ہے مگر	خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تسلیم	قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

وہ پرانی پاس وضع۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری وغیرہ کے فقدان کا افسوس کرتے ہیں اور زمانہ موجودہ کے مایہ ناز صفات پالسی۔ دوروئی۔ خود غرضی۔ بے حمیتی پر غصہ اور افسوس کرتے ہیں۔ ان کو افسوس آتا ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کی کورانہ روش کے پیچھے لوگ اپنے والدین بھائی بہن اور دیگر متعلقین اور واسطہ داروں کے واجبی حقوق فراموش کر بیٹھے یہاں تک کہ خدا کا بھی احساس ان کے دل سے اُٹھ گیا دنیا کے بکھیڑوں کے پیچھے دین کو بھلا بیٹھے ہیں۔ یہ مادہ پرستی کا دور جو صرف تیز رفتار ریل اور ٹیلیگراف و ٹیلیفون کے معجزنما اثر کا قائل ہے ہمارے دلوں کو کسی قسم کا سکون و اطمینان نہیں بخشتا۔ موجودہ دور کی سائنس کی معجزنمائیاں اور نئی نئی مشینوں کی سحر آفرینیاں سراپا فائدہ ہی فائدہ نہیں ہیں۔ مگر ناگہانی

جو اکثر کثرت اضطرار اور تیز حرکتوں کا نتیجہ ہے اور کمی عمر اور خرابی صحت یہ سب اسی کے برکات ہیں۔ جدید طریقہ تعلیم بھی جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا۔ اخلاقی و روحانی امراض کے لئے اکسیر صفت ثابت نہیں ہوا سائنس کی ترقی اور نیچر کی مغلوبیت نے دل کی تکلیفوں کو کسی طرح رفع نہیں کیا اور نہ وہ مصائب دور کئے جن کے رفع کرنے کی امید کی جاتی تھی دونوں تہذیبوں کے درمیان میں ایک عمیق خلیج حائل ہے۔ مغربی تہذیب ہمہ تن دنیاوی جاہ و ثروت تجارت و دولت کی طرف متوجہ ہے اور مشرقی تہذیب کا منتہائے نظر روحانی ترقی ہے وہ باسانی مختصر اور تھوڑی چیز پر قانع ہو جاتی ہے فتوحات اور ملک گیری کا اس کو شوق نہیں قناعت اور تسلیم و رضا اس کا آئین ہے۔

اکبر کے مذہبی عقائد علاوہ شاعر کے وہ ایک ناصح قوم، ریفارمر، واعظ اور فلسفی بھی تھے وہ خدا کی وحدانیت اور تاثیر دعا کے دل سے قائل تھے، ان کا دلی اعتقاد تھا کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اور اس میں فلسفہ سائنس اور منطق کا کوئی دخل نہیں۔ وہ مذہبی جھگڑوں اور جزئی اختلافات اور تعصبات سے بالکل بری تھے مذہب ان کے نزدیک ایک زندہ اور محبت کرنے کے قابل شے ہے اس کو چند آرا اور حقائق فلسفیانہ کا مجموعہ نہ سمجھنا چاہیئے اگر کوئی ایسی نکتہ چینی گوارا نہیں کر سکتے جو اعتقاد کے منافی ہو کیونکہ یہی مذہب کی جان ہے ان میں تعصب اور کٹر پن مطلق نہیں اور اسی وجہ سے وہ مُلّائیت کی تنگ خیالی کو برا سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے جزئی اختلافات ایک وسیع النظر موحد کی نظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں وہ اکثر اشعار میں انسان کی بے حقیقتی کا ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی کامیابی پر مغرور نہ ہو ان کا قول ہے کہ ہر چند سائنس کی ترقیوں کے قائل ہو مگر خدا کو کسی حال میں دل سے نہ بھولو وہ اصول اخلاق اور فلسفہ اور حقائق و معارف کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ظواہر مذہب کی وہ پرواہ نہیں کرتے وہ نفس کشی اور ضبط خواہشات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں رسوم ظاہری مثل پوست کے ہیں اور اصول اور

افعال و اطوار مثل مغز کے، وہ تعصب اور غصہ کو بہت برا سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے تنگ خیالی پیدا ہوتی ہے۔ وسعت نظر اور بلند خیالی ان عیوب کو رفع کردیتی ہے آخر عمر میں وہ فلسفہ اور تصوف بہت کہتے تھے ایک جگہ انھوں نے معاوضۂ آخرت کا مضمون بہت خوب لکھا ہے

نادر کاکوروی متوفی ۱۹۱۲ء | نادر علی خاں نادر طرز جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں میں سے تھے اس رنگ میں ان کی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں درد و اثر اعلیٰ تخئیل حب وطن ان کے کلام کے مخصوصات سے ہیں یہ انگریزی شعرا بائرن اور ٹامس مور کے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں کا رنگ نہایت سلیس عمدہ طریقہ سے اُردو میں بھی داخل ہوجائے۔ ان کی نظمیں، "شمع و پروانہ" "شعاع امید" "پیکر بے زبان" "فلسفۂ شعری" بہت مشہور ہیں ان کو اپنے وطن یعنی ہندوستان سے عشق تھا۔ چنانچہ اسی وطنی جذبات کی نظمیں "مقدس سرزمین" اور "مادر ہند" دیکھنے کے قابل ہیں۔ ٹامس مور کی مشہور کتاب "لالہ رُخ" کے طرز پر انھوں نے بھی ایک مثنوی لکھی ہے اور اس کا بھی نام لالہ رخ رکھا ہے۔ ان کا انتقال عین جوانی یعنی پینتالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اس بے ہنگام سانحہ سے ادبی دنیا نے جو امیدیں ان کی ذات سے قائم کی تھیں ان سب پر پانی پھر گیا۔

حصّۂ نظم تمام ہوا

انڈکس حصۂ نظم

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

فہرست مضامین

حصۂ نثر

باب ۱۷

اردو ناول کی ابتدا

مضمون	صفحہ
باب ۱۸	
اُردو ڈراما	

فہرست تصاویر حصۂ نثر

تاریخ ادبِ اُردو

باب ۱۵

حِصّۂ نثر

نثر اُردو کی ابتدا اور ترقی

فورٹ ولیم کالج کلکتہ

نثر اُردو کی تعویق آغاز کے اسباب

اُردو نثر کی ابتدا واقعی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ شمالی ہند میں اس کی عدم ترقی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں فارسی کا رواج تھا۔ درباری اور تعلیم یافتہ شرفا کی زبان وہی تھی۔ مراسلے، کتابوں کی تقریظیں اور دیباچے یہ سب فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اُردو شعرا کے تذکرے جن میں ان کے کچھ حالات بھی ہوتے تھے یہ بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفیٰ اور مسجع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروج تھی اس وقت کے اُردو نثر نگار ظہوری اور پنج رقعہ کی ایسی پیچیدہ اور مغلق عبارت لکھنے کے شائق تھے اور اسی قسم کی عبارت لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فارسی کی مروجہ اقسام نثر یعنی مرجز۔ مقفیٰ۔ مسجع اور عاری اُردو میں بھی بے تکلف اختیار کی گئی تھیں اور جب کبھی کوئی بات نثر میں لکھنا ہوتی تو وہ نہایت رنگین اور پُر تکلف عبارت میں لکھی جاتی تھی۔ نظم کا عام رواج تھا یہاں تک کہ خطوط بھی نظم میں لکھے جاتے تھے۔ نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی بڑی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ایک پڑھے لکھے آدمی کی یہی تمنائے انتہا تھا۔ نظم کا یہ عام رواج اور مقبولیت نثر کو بھی نظم بنائے ہوئے تھا۔ نثر بیچاری ایک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ دور نظم کے عروج کا دور تھا اور نثر کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ یہ اسباب اس کی ابتدا کی تاخیر کے ہوئے

اور یہی اس بات کی بھی وجہ ہو کہ اس کی ابتدا ایسے مقام سے ہوئی جو شمالی ہند اور ادبی مرکز سے دور تھا۔

زبان دکھنی میں قدیم اُردو نثر کی تصانیف

محققین زبان اور ریسرچ اسکالروں نے بحرِ تحقیق میں غوطہ زنی کر کے دکن کی قدیم نثر کے بہت سے نمونے دستیاب کئے ہیں۔ یہ کارروائی ہنوز جاری ہو اور امید کی جاتی ہو کہ بہت عرصہ نہیں گزرے گا کہ کافی مواد ایک مکمل اور معتبر تاریخ نثر اردو کی تیاری کے لیے فراہم ہو جائے گا ایسے محقق ہمارے نزدیک مولوی عبدالحق صاحب اور حکیم سید شمس اللہ قادری ہیں کہ جن کی کوششیں اس بارے میں بہت تحسین اور آفریں کے لائق ہیں۔ جہاں تک کہ قدیم ترین نمونے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہو کہ نثر اُردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہو۔ یہ نمونے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں ہیں جن میں دکن اور گجرات کے فقرا اور اہل دل کے اقوال و امثال قلمبند کئے گئے ہیں۔ یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے ہیں اور زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں۔ مثلاً شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ) کی تصانیف اور "معراج العاشقین" مصنفہ حضرت خواجہ گیسو دراز گلبرگوی جو اگرچہ کوئی ادبی حیثیت تو نہیں رکھتا مگر پھر بھی اُس زمانہ کی زبان کا حال بخوبی اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ کے نواسے سید محمد عبداللہ الحسینی نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے رسالہ نشاط العشق کو دکھنی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری نے شرح مرغوب القلوب لکھی اور ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے دو کے نام "جل ترنگ" اور "گلباس" ہیں۔ مولانا وجہی کی "سب رس" ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہو جس کا ذکر حصۂ نظم میں مولانا وجہی کے بیان میں آچکا ہو۔ میراں یعقوب نے "شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا" کا اُردو ترجمہ نہایت سلیس اور سادہ دکھنی زبان میں ۱۰۸۱ھ میں کیا۔ سید شاہ محمد قادری نے بھی جو اورنگ زیب کے زمانہ میں تھے اور رائچور کے نوروریا خاندان سے تعلق رکھتے تھے مختلف مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ گیارھویں صدی میں سید میر شاہ نے ایک مذہبی کتاب زبان دکنی میں "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔

دہ مجلس فضلی مصنفہ ۱۱۴۲ء

قبل اس کے کہ دکن کی اُردو شمالی ہند میں آئے یہاں بھی کچھ کتابیں نثر میں لکھی گئیں جو زیادہ تر قصّہ کہانیوں کی صورت یا مذہبی رنگ میں تھیں اور فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں

انھیں کتابوں میں فضلی کی وہ مجلس ہی جو بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔ اس وقت مصنف کی عمر بائیس برس کی تھی جیسا کہ وہ خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی کی روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہی جو ملّا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہی۔ فضلی نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہی کہ میری بڑی تمنا تھی کہ یہ کتاب نہایت سہل اور عام فہم زبان میں جو اس وقت مروج تھی لکھی جائے مگر چونکہ مذہبی کتاب تھی اور میرے سامنے اس سے قبل کوئی نمونہ موجود نہ تھا لہذا مجھے اس کی تحریر میں بہت پس و پیش تھا اسی حالت میں میں نے خواب میں سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ تشریف لائے ہیں اور آپ نے میرے مشکلات کو حل کیا اور امداد فرمائی۔ فضلی نے جو مذہب امامیہ رکھتے تھے ائمہ معصومین کی شان میں کچھ نظمیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں مگر اُن کو کچھ شہرت نہیں ہوئی۔ وہ مجلس جس میں اصل میں بارہ مجلسیں ہیں۔ نثر اُردو کی ایک کامل کتاب تو نہیں کہی جا سکتی البتہ وہ اُس زمانہ کی اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہی۔ عبارت میں خامی ہی جیسا کہ ہر ابتدائی کام میں ہوا کرتی ہی جملے پیچیدہ پُر تصنع اور مقفیٰ ہیں۔ اسی طرح ایک مختصر نمونہ اُس زمانہ کی نثر اُردو کا سودا کے کلیات کے شروع میں موجود ہی جس سے اس زمانے کا رنگ بخوبی معلوم ہوتا ہی زمانہ حال کی پابندی صرف و نحو اس میں بالکل نہیں ہی صرف قافیہ دار الفاظ مثل نظم کے جملوں کے آخر میں رکھ دیے گئے ہیں۔ مضمون بھی تشبیہوں اور استعاروں سے مملو ہے ایسی عبارت صرف موزوں نہ ہونے کی وجہ سے نثر کہی جا سکتی ہی ورنہ اس میں اور نظم میں کوئی فرق نہیں ہی۔ انشا اور قتیل کی دریائے لطافت گو فارسی میں ہی مگر نہایت دلچسپ کتاب ہی اس میں اُس وقت کے مختلف پیشہ وروں کی بولیاں مختلف رسوم و رواج اور معمولی بول چال اور ضرب الامثال اور دلّی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق اور متروکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبان کا زبان دہلی و لکھنؤ میں شامل ہونے سے اثر وغیرہ درج ہیں۔

نوطرز مرصع ترجمہ قصہ چہار درویش مصنفہ ۱۷۹۸ء

دوسری مشہور کتاب اس عہد کی نوطرز مرصع ہی جس کو میر محمد حسین خاں متخلص بہ تحسین نے امیر خسرو کے قصہ چہار درویش سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء ہی اور یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں مکمل ہوا جن کی تعریف میں ایک قصیدہ دیباچہ کے

آخر میں دیا ہوا ہی بمصنف مذکور مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے اور محمد باقر خاں شوق کے بیٹے اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بعد اس کے وہ جنرل اسمتھ کے میر منشی مقرر ہوئے اور انھیں کے ساتھ کلکانہ گئے۔ جب صاحب موصوف ولایت گئے تو تحسین پٹنہ چلے آئے اور وہاں وکالت کرنے لگے اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ پٹنہ سے فیض آباد آگئے جہاں نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہوگئے یہ سلسلہ ملازمت نواب آصف الدولہ کے زمانہ تک قائم رہا۔ تحسین علاوہ خوشنویس ہونے کے منشی بھی نہایت اچھے تھے۔ چنانچہ "ضوابط انگریزی" جو اس زمانہ کی گورنمنٹ ہند کے قوانین کا مجموعہ ہی اور "تواریخ قاسمی" اُن کی تصنیف ہیں یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ "نوطرز مرصع" کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی و عربی الفاظ سے مملو ہی غالباً یہی وجہ ہوگی کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے قصہ چہار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ موسوم بہ "باغ و بہار" نہایت صاف اُردو زبان میں میر امن دہلوی سے کرایا جس کا مفصل حال آگے آتا ہی۔

فورٹ ولیم کالج سے نثر اُردو کے تعلق کے اسباب

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں بڑے بڑے قطعات ملک حاصل کرلیے تھے جن کے عمدہ انتظام کے واسطے ضروری تھا کہ اُن کے اعلیٰ عمّال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ اُن کے سپرد تھا اچھی طرح واقف ہوجائیں تجارتی تعلقات یوماً فیوماً کم ہوتے جاتے تھے مگر انتظامی معاملات بڑھتے جاتے تھے۔ مترجم جن کے ذریعہ سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کو یورپی عمّال یا تجار سمجھ سکتے تھے اب بیکار ہوگئے تھے کیونکہ یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ کوئی قوم تاوقتیکہ مفتوح قوم کو زبان اور رسوم و رواج اور روایات تاریخی و مذہبی سے کماحقہ بلاواسطہ واقف نہ ہوگی اُس پر پورے طور سے حکومت نہیں کرسکتی۔ اور ان سب باتوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ حاکم اپنے محکوموں کی زبان سیکھیں۔ لہذا کورٹ آف ڈائرکٹرز نے یہ دیکھ کر کہ اُن کے عمّال ہندوستان میں اپنے فرائض منصبی محض دیسی زبانوں کے نہ جاننے کی وجہ سے بہت بری طرح سے ادھورے طریق پر ادا کرتے ہیں یہ تاکیدی حکم دے دیا کہ آئندہ سے اُن کے حکام مقامی اپنے عمّال کے واسطے دیسی زبانوں سے کماحقہٗ واقفیت کو ضروری قرار دیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ بڑے بڑے قطعات ملک

انگریزی عملداری میں داخل ہوتے جاتے تھے لہذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رکاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی لڑائیوں کی وجہ سے لوگوں کے تعلیم میں پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت صدمہ پہونچ رہا تھا اب دور ہو جائے۔ اسی اصول پر تعلیم انگریزی کی اشاعت شروع ہوئی جس سے خیالات اور زبان دونوں میں انقلاب عظیم پیدا ہونا شروع ہوا جس کا اثر کہیں نظم پر پڑا اور کہیں نثر پر مختصر یہ کہ تعلیم انگریزی نے ہندوستان کے واسطے وہی کیا جو اب سے پانچ چھ سو برس پیشتر رینا سانس (نشاط ثانیہ) نے یورپ کے واسطے کیا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر تغیر اور انقلاب کے ساتھ اچھائیوں کے ساتھ ساتھ کچھ برائیاں بھی ضرور آجاتی ہیں مگر اس صورت میں اچھائیوں کا پلہ بھاری رہا یعنی اس تعلیمی تغیر سے دیسی زبانوں کو بہت فائدہ پہونچا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۷۵۹ء لغایت ۱۸۴۱ء | ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منتظم اعلیٰ تھے نثر اردو کے مربی (باپ) کہلائے جانے کے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ انہیں کی ان تھک کوششوں سے ملک کی دیسی زبان یعنی اردو مکمل ہو کر سرکاری زبان بننے کے لائق ہوئی اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی کی جگہ وہ سرکاری اور درباری زبان قرار پائی۔ ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے ۱۷۵۹ء میں بمقام اڈنبرا پیدا ہوئے جارج ہیریٹ کے درسگاہ میں جو اسی شہر میں واقع تھی تعلیم پائی ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بہ حیثیت ڈاکٹر داخل ہوئے۔ ابتدا ہی سے یہ خیال اُن کے دل میں راسخ تھا کہ انگریزی افسروں کو فارسی دانی کی اس قدر ضرورت نہیں رہا کہ اُس وقت دستور تھا جس قدر کہ ملک کی دیسی زبانوں علی الخصوص زبان ہندوستانی کی ہے جو اس وقت ہر طبقہ اشخاص سے میل جول کے لیے سب سے زیادہ مشہور زبان سمجھی جاتی تھی گلکرسٹ نے خود اس معاملہ میں سبقت کی۔ اُن کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہندستانی کپڑے پہنے ان مقامات میں جہاں اردو بہت صحیح اور بامحاورہ بولی جاتی تھی برابر گھوما کرتے تھے۔ اور اردو کے علاوہ سنسکرت فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں سے بھی باخبر تھے۔ ان کی کامیابی کو دیکھ کر دیگر ملازمین کمپنی کے دل میں بھی

اردو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا مختصر یہ کہ انگریزوں میں اردو پڑھنے کا رواج اسی وقت سے ہوگیا۔ لارڈ ویلیسلی نے جو اُس وقت گورنر جنرل تھے اس تجویز کی اہمیت اور ضرورت پر نظر کرکے اور گلکرسٹ کے مفید کاموں کے عمدہ نتائج کو دیکھ کر ان کو مالی امداد بھی بہت دی اور فورٹ ولیم کالج کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا۔ یہ کالج سنہ ۱۸۰۰ئہ میں اس غرض سے قائم ہوا تھا کہ اس میں کمپنی کے انگریزی ملازمین کو ملک کی دیسی زبانوں میں تعلیم دی جائے گلکرسٹ عرصہ تک اپنی جگہ پر نہ رہ سکے۔ علالت کی وجہ سے مستعفی ہوکر سنہ ۱۸۰۴ء میں پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ زبان اردو سے اُن کو اس قدر عشق تھا کہ ایڈنبرا میں سنہ ۱۸۱۶ئہ تک قیام کرکے لندن آگئے جہاں امیدواران انڈین سول سروس کو وہ مشرقی زبانوں میں پرائیوٹ طریق پر تعلیم دیا کرتے تھے سنہ ۱۸۱۸ء میں وہ اورنٹیل انسٹیٹیوٹ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ جس کو اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن میں قائم کیا تھا مگر سنہ ۱۸۲۵ئہ میں بند ہوگیا تھا۔ اس کے بند ہونے کے بعد بھی وہ تقریباً سال بھر تک شائقین زبان کو پرائیوٹ طور پر اردو پڑھاتے رہے اور اپنے بعد اپنی جگہ پر سینڈ فورڈ آرنو اور ڈنکن فوربس کو جو مشہور مستشرق تھے مقرر کر گئے۔ گلکرسٹ کا انتقال ۸۲ برس کی عمر میں بمقام پیرس سنہ ۱۸۴۱ئہ میں ہوا۔ وہ بہت سی کتب متعلقہ زبان ہندوستانی کے مصنف ہیں۔ جن کی پوری فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (ہندوستانی زبانوں کے نقشہ جات) کی جلد نہم میں دی ہے۔ ان کی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں (۱) انگریزی ہندوستانی ڈکشنری ۲ حصوں میں۔ مطبوعہ سنہ ۱۷۹۳ء (۲) اورنٹیل لنگوسٹ (مشرقی زبان داں) جو زبان اردو کا آسان مقدمہ ہے۔ مطبوعہ سنہ ۱۷۹۸ئہ (۳) ہندوستانی گرامر مطبوعہ سنہ ۱۷۹۶ء (۴) ہندوستانی فلالوجی۔ گلکرسٹ ہی کے انتظام اور ماتحتی میں ایک جماعت ہندوستانیوں کی کالج میں قائم ہوگئی تھی۔ جنھوں نے نہ صرف انگریزوں کے پڑھنے کے واسطے درسی کتابیں بلکہ زبان اردو و ہندی میں مستقل تصانیف نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف کیں سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد بعض مشہور اہل زبان و اہل قلم اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر ڈاکٹر گلکرسٹ کی شہرت اور فیاضی کا شہرہ سُن کر کلکتہ پہونچ گئے تھے۔ انھوں نے اُن سب کو و نیز اکثر کلکتہ کے لوگوں کو اپنے کالج میں خوشی سے جگہ دی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسروں۔ مثلاً کپتان روبک، کپتان ٹیلر،

ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی خدمات بھی ضرور قابل تعریف ہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانہ میں مشہور ہندوستانی اہل قلم جو کالج میں جمع ہوگئے تھے حسب ذیل ہیں۔ میر امّن۔ افسوس حسینی۔ لطف۔ حیدری۔ جوان۔ للولال جی نہال چند۔ اکرام علی ولا۔ سید محمد منیر۔ سید شیر علی افسوس۔ اور مداری لال گجراتی۔

میر امّن دہلوی | میر امّن دہلوی متخلص بہ لطف دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباو اجداد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں وظائف اور جاگیروں سے معزز و ممتاز تھے۔ احمد شاہ درانی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو فوج کی لوٹ مار میں میر امّن کا گھر بھی شامل تھا اور سورج مل جاٹ نے ان کی خاندانی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا میر امّن اس مصیبت میں دلّی سے نکل کر پٹنہ پہونچے یہاں کچھ عرصہ تک رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ جہاں نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد تھی۔ اسی زمانہ میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گلکرسٹ سے کرادیا جن کی فرمائش سے انھوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب قصۂ چہار درویش لکھی جس کا تاریخی نام باغ و بہار ہے (۱۲۱۷ھ)۔ یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا اور اس کو امیر خسرو دہلوی نے اپنے پیرو مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے بحالت علالت دل بہلانے کے واسطے تصنیف کیا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب حضرت کو صحت ہوئی تو آپ نے دعا دی کہ اس قصہ کو جو کوئی سُنے گا وہ بحکم خدا بیماری سے شفا پائے گا۔ یہ قصہ فارسی میں بھی بہت مقبول ہے اور اس کے دونوں اُردو ترجمے یعنی تحسین اور میر امّن کے ترجمے مع دیگر تراجم کے جو ہندوستان کے اکثر دیسی زبانوں اور نیز غیر ملکی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ بہت مقبول ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۷ھ میں ختم ہوئی تحسین کے ترجمہ کو میر امّن نے اپنی زبان میں لکھا ہے۔ کیونکہ اس میں اکثر غیر مانوس فارسی و عربی الفاظ تھے جن کو میر امّن نے نکال دیا اور اپنی کتاب کو اس قدر صاف سلیس و با محاورہ عبارت میں لکھا کہ بقول سر سید مرحوم کے جو مرتبہ میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہے وہی میر امّن کو نثر میں ہے۔ یہ قصہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اس میں اُس زمانہ کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کے مرقعے نہایت وضاحت سے کھینچے گئے ہیں۔ دیباچہ میں سبب تالیف کتاب اور اپنا حال لکھ کر زبان اُردو کی ایک مختصر سی تاریخ بھی بتادی ہے جو زیادہ صحیح نہیں سمجھی جاسکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کتاب باغ و بہار انگریزوں میں بہت مقبول رہی ہے

چنانچہ اب تک وہ انگریزی حکام کے اردو امتحانوں میں داخل درس ہی۔ علاوہ اس کتاب کے "گنجینۂ خوبی" بھی میرامن کی تصنیف ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی کے طرز پر ۱۸۰۲ء میں تحریر کی گئی منشی کریم الدین کا خیال ہی کہ میرامن نے کوئی دیوان بھی ضرور مرتب کیا ہوگا مگر اس کا کہیں پتہ نہیں ڈاکٹر فیلن نے خود میرامن کی زبانی سُنا تھا کہ ان کو کسی سے فن شعر میں تلمذ نہ تھا۔

افسوس ۱۷۳۵ء
تا نہایت ۱۸۰۹ء

میر شیر علی دہلوی متخلص بہ افسوس میر علی مظفر خاں کے بیٹے تھے جو نواب میر قاسم کے سرکار میں داروغہ سلح خانہ تھے۔ یہ حضرت امام جعفر صادق کی اولاد میں تھے اور ان کے آباؤ اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں ایک شخص سید بدر الدین نامی نارنول میں جو آگرہ کے قریب ہے سکونت گزیں ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کے باپ اور چچا سید غلام علی خاں آگرہ سے دلی آئے اور عمدۃ الملک نواب امیر خاں کی سرکار میں ایک بیش قرار تنخواہ پر ملازمت اختیار کی افسوس دہلی میں پیدا ہوئے جس کو ان کے بزرگوں نے بطریق وطن کے اختیار کیا تھا۔ ۱۱۴۶ھ میں جب نواب امیر خاں کا انتقال ہوا تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے۔ جہاں نواب میر قاسم اور ان کے بعد نواب میر جعفر کی ملازمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب آخر الذکر معزول کئے گئے تو وہ لکھنؤ آگئے اور وہاں سے حیدرآباد گئے جہاں اُن کا انتقال ہوا۔ افسوس بھی اپنے والد کے ساتھ پٹنہ سے لکھنؤ آئے تھے اور چونکہ میلان طبیعت شعر و شاعری کی طرف بہت تھا اور فضائے لکھنؤ میں زمانہ شاعری اس وقت گونج رہا تھا۔ انھوں نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا کلام میر حیدر علی حیراں کو دکھلاتے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ میر حسن۔ میر تقی اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں اُن کی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے بعد ان کے بیٹے نواب مرزا نوازش علی خاں کرتے رہے لکھنؤ ہی کے قیام میں نواب حسن رضا خاں نائب نواب آصف الدولہ کی وساطت سے افسوس کرنیل اسکاٹ صاحب سے ملے جنھوں نے ان کی قابلیت اور ذہانت و ذکاوت کو بہت پسند کر کے دو سو روپیہ مشاہرہ پر ان کو کلکتہ بھیجا اور پانچ سو روپیہ زادِ راہ کے لیے بھی عنایت فرمائے۔ افسوس راستے میں مرشد آباد میں مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند سے بھی ملے تھے کلکتہ پہونچ کر وہ فورٹ ولیم کالج کے زمرۂ اُستادان میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہوئے ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں

(۱) اُردو ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اُردو جو کلکتہ میں پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں چھپا تھا اور نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے (۲) ۱۸۰۸ء میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب آرائش محفل لکھنا شروع کی جس میں علاوہ ہندوستان کے جغرافیائی حالات کے فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی ایک مختصر تاریخ بھی ہی۔ اس کی تصنیف میں اکثر تاریخوں سے مدد لی گئی مگر اُس کا اصلی ماخذ منشی سوجن رائے بٹیالوی کی خلاصۃ التواریخ ہے ان کے علاوہ افسوس نے میر بہادر علی کی نثر بے نظیر منشی عزت اللہ کی مذہب عشق اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی بہار دانش کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی اور کلیات سودا بھی اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا۔ ان تصانیف کے علاوہ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ افسوس کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہوا۔

میر بہادر علی حسینی | ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے بہرطور اتنا معلوم ہی کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے اور کتب ذیل کے مُصنف ہیں (۱) اخلاق ہندی جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی یہ ہتوپدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا جو شاہ نصیر الدین بہاری کے حکم سے مفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا صاف اور سلیس اُردو ترجمہ ہی (۲) نثر بے نظیر یعنی مثنوی میر حسن نثر میں جو ۱۸۰۲ء میں تصنیف اور ۱۸۰۳ء میں یعنی دو برس قبل اصل مثنوی کے شائع ہوئی (۳) رسالہ گلکرسٹ یعنی گلکرسٹ صاحب کی گرامر کا خلاصہ زبان اُردو کی صرف و نحو اور فن عروض کا رسالہ ہے مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۶ء (۴) ترجمہ تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین تالش جس میں اورنگ زیب کے مشہور جرنیل میر جملہ کے حملۂ آسام ۱۶۶۲ء کا ذکر ہے۔ حسب الحکم کولبرک صاحب ترتیب پایا۔ ان کے علاوہ قصۂ لقمان اور قرآن شریف کے ایک ترجمہ میں بھی حسینی نے شرکت کی تھی۔

سید حیدر بخش حیدری | سید حیدر بخش حیدری سید ابو الحسن کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے ان کے آباؤ اجداد نجف کے باشندے تھے۔ ان کے والد لالہ سکھدیو رائے کے ساتھ دلی سے نکل کر بنارس پہونچے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ حیدر بخش اپنے والد کے ساتھ تھے بنارس میں اس وقت نواب علی ابراہیم خاں متخلص بہ خلیل مصنف تذکرۂ گلزار ابراہیم عدالت انگریزی کے جج تھے۔ اُن کی سپردگی میں حیدری دے دیے گئے

تاکہ نواب صاحب کے فیض صحبت سے اچھی طرح مستفیض ہوں علوم مذہبی کی تعلیم ان کی مولوی غلام حسین غازی پوری کے سایۂ عاطفت میں ہوئی جو نواب صاحب موصوف کی عدالت کے ایک سربرآوردہ مولوی تھے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں یہ سُنکر کہ نورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قابل منشیوں کی مانگ ہے حیدری نے ایک کتاب موسومہ بہ "قصّہ مہر وماہ" ترتیب دی جس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۴ھ ہے اور اس کو ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمت میں بطور اپنی قابلیت کے نمونہ کے پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو بہت پسند کیا۔ اور حیدری کو کالج مذکور کی ایک منشی گری پر ممتاز کیا۔ حیدری کی اکثر تصانیف ہیں جو زیادہ تر فارسی کتابوں کے تراجم ہیں۔ کتب ذیل زیادہ مشہور ہیں (۱) قصّہ لیلیٰ مجنوں۔ جو امیر خسرو کی اسی نام کی مثنوی کا اُردو ترجمہ ہے یہ غالباً ملازمت کلکتہ سے پیشتر تحریر ہوا تھا (۲) طوطا کہانی سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ مصنفہ ۱۸۰۱ء بحکم ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب۔ اصل میں یہ قصّہ سنسکرت میں شوکا شپتنی کے نام سے تھا فارسی میں اسی نام کی ایک کتاب جو باون قصوں پر مشتمل تھی ضیائے نخشبی نے ۱۳۳۰ھ میں لکھی تھی جس سے یہ دوسرا طوطی نامہ پینتیس قصص کا سید محمد قادری نے ۱۷۹۳ و ۹۴ء میں مختصر اور صاف کر کے ترتیب دیا۔ یہ سب قصے، مثل انگریزی کنگ آرتھر کے فسانوں کے ہندوستان میں بہت مقبول ہوئے۔ اور اُن کے ترجمے مختلف زبانوں میں مختلف اوقات میں ہوئے۔ مثلاً انگریزی میں اسمال صاحب نے ۱۸۷۵ء میں کیا بنگلہ میں چنڈی سیرام پوری نے ۱۸۰۶ء میں کیا اور طوطا اتہاس نام رکھا ہندی میں انبا پرشاد راسانے زبان دکنی میں نظم میں غواصی نے اور نثر میں ایک غیر معلوم شخص نے۔ ہندی میں اصل سنسکرت سے بھیروں پرشاد نے گجراتی نظم میں سمالا بھٹ نے اور مرہٹی میں کسی غیر معلوم شخص نے (۳) آرائش محفل ترجمہ قصّہ حاتم طائی اس کو میر شیر علی افسوس کی آرائش محفل سے خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ یہ قصّہ سب سے پہلے ۱۸۰۲ء میں کلکتہ میں چھپا تھا اور اس کی زبان نہایت سلیس سہل اور دلچسپ ہے اس کا ترجمہ بھی بنگلہ ہندی اور گجراتی میں ہو گیا ہے (۴) تاریخ نادری ترجمہ نادر نامہ منشی مرزا مہدی مرتبہ ۱۲۲۴ھ (۵) گلِ مغفرت جس کو انھیں کے گلشن شہیداں کا خلاصہ سمجھنا چاہیئے جو ملا حسین واعظ کاشفی کے روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے اس کا دوسرا نام دہ مجلس بھی ہے۔ سنہ تصنیف ۱۸۱۲ء اور مقام طباعت کلکتہ ہے۔

اس کا ترجمہ زبان فرانسیسی میں بھی ہو گیا ہے (۶) گلزار دانش شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اُردو ترجمہ جس میں عورتوں کے مکر و کید کے قصے درج ہیں (۷) ہفت پیکر نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب مصنفہ ۱۸۰۵ او ۱۸۰۶ء (۸) ان کے علاوہ حیدر مراتی ایک دیوان غزلیات اور مجموعہ صد حکایات بھی ان کی تصانیف سے ہیں۔ حیدری کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا جیسا کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے فہرست کتب اودھ میں ذکر کیا ہے۔

مرزا کاظم علی جوان اصل میں دلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ۱۷۸۴ء میں وہ موجود تھے ان کا ذکر نواب علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں کیا ہے جن کے پاس بنارس میں اُنھوں نے اپنا کچھ کلام نمونتاً بھیجا تھا ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ صاحب نے ان کو منشی گری کی ایک جگہ دے کر لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا تھا منشی بنی نرائن اپنے تذکرہ جہاں میں جو ۱۸۱۴ء کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ یہ اُس وقت زندہ تھے۔ بلکہ ۱۸۱۵ء میں جو مشاعرے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہوئے تھے اُس میں بھی یہ موجود پائے جاتے ہیں۔ کتب ذیل ان کی طرف منسوب ہیں (۱) کالیداس کی مشہور کتاب شکنتلا ناٹک کا اُردو ترجمہ جس کے دیباچہ میں بطور تمہید کے وہ لکھتے ہیں کہ کالیداس کی اصل کتاب کا ترجمہ برج بھاشا میں ۱۷۱۶ء میں ایک شاعر نواز کبیشر نامی نے مولے خاں پسر خدائی خاں سپہ سالار شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے یہ ترجمہ برج بھاشا سے بزبان اُردو ۱۸۰۱ء میں کیا گیا اور اس پر نظر ثانی للّولال جی کبیشر نے کی اور کلکتہ میں ۱۸۰۲ء میں طبع ہوا (۲) قرآن شریف کا ایک اُردو ترجمہ حسب فرمائش گلکرسٹ صاحب (۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی (۴) سنگھاسن بتیسی جس کی تصنیف میں للّولال جی بھی شریک تھے (۵) بارہ ماسہ یا دستور ہند مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۲ء جس میں ہندوستان کی مختلف فصلوں اور موسموں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے۔ یہ کتاب بعد ترجمہ شکنتلا ناٹک کے تحریر ہوئی۔

جوان نے "خرد افروز" جس کا حال آگے آتا ہے) اور میر و سودا کے کلام کے کچھ منتخبات بھی شائع کئے تھے ان کے دو بیٹے عباس اور ممتاز بھی کسی قدر مشہور ہوئے۔

نہال چند لاہوری | دلّی میں پیدا ہوئے مگر چونکہ لاہور میں زیادہ رہے اس وجہ سے لاہوری کے لقب سے مشہور ہیں ۱۲۱۷ھ میں کلکتہ گئے تھے۔ ان کے کچھ مزید حالات معلوم نہیں سوائے اس کے جیسا کہ اپنی کتاب مذہب عشق کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ کپتان ولورٹ نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے ان کا تعارف کرایا جن کی فرمائش سے انھوں نے قصہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) مذکورہ بالا مذہب عشق (جو تاریخی نام ہی) معروف بہ قصہ گل بکاؤلی جو شیخ عزت اللہ بنگالی کے اسی نام کے فارسی قصہ مصنفہ ۱۱۲۴ھ کا اُردو ترجمہ ہے۔ ایک دوسرا اُردو منظوم ترجمہ اسی قصہ کا کسی شخص ریحان نامی نے ۱۲۱۲ھ میں کیا ہی جس میں چالیس باب ہیں۔ جو گلگشت کے نام سے موسوم ہیں۔ نیز ایک اُردو مثنوی موسوم بہ تحفۃ المجالس اسی قصہ کی بہت قدیم موجود ہے یہ نام تاریخی ہی جس سے ۱۰۵۳ھ نکلتے ہیں۔ اور اس سے بھی ایک قدیم تر نسخہ کا پتہ چلتا ہی جو زبان دکنی میں ہے۔ جس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ھ ہی۔ مگر ان سب سے زیادہ مشہور مثنوی گلزار نسیم ہی جس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہی۔ مذہب عشق کا سنہ تصنیف اُن تاریخوں سے جو کتاب کے آخر میں دی ہوئی ہیں ۱۲۱۷ھ اور ۱۸۱۳ء عیسوی نکلتا ہی۔

مظہر علی خاں ولا | مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علی خاں متخلص بہ ولا سلیمان علی خاں وداد کے بیٹے دلّی کے رہنے والے تھے۔ مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ گلشن بے خار میں میر نظام الدین ممنون کو بھی ان کا اُستاد لکھا ہی یہ بھی کلکتہ کے کالج میں منشی تھے اور اکثر تراجم ان کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً (۱) پند نامہ سعدی کا اُردو ترجمہ منظوم مصنفہ ۱۸۰۲ء (۲) ناصر علیخاں بلگرامی واسطی کی ہفت گلشن کا ترجمہ۔ جو اخلاق و موعظت کی ایک کتاب ہے اور سات بابوں پر مشتمل ہی۔ جو تاریخیں اس کے آخر میں دی ہوئی ہیں اُن سے سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء نکلتا ہی۔ اس میں اخلاقی حکایتیں آداب گفتگو۔ بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور چند احادیث نبوی و اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ درج ہیں (۳) قصہ مادھونل وکام کنڈلا جو موتی رام کبیشر کی برج بھاشا کا اُردو ترجمہ ہی سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء ہی (۴) صورت کبیشر کی بیتال پچیسی بھاشا کا اردو ترجمہ جو للّو لال جی کی شرکت میں کیا گیا وجہ تسمیہ یہ ہی کہ پچیس قصّے کسی بیتال (بھوت) نے

راجہ بکرماجیت کے سامنے کہے تھے یہ ہندوستانی پبلک میں بہت مقبول ہی مگر اس میں کوئی ادبی ندرت نہیں ہی (۵) فارسی تاریخ شیرشاہی کا ترجمہ جو بعد کو انگریزی میں بھی ہو گیا ہی (۶) ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا جس میں غزلیات قصائد رباعیات وغیرہ مع سوانحعمری مصنف کے ہیں اس کا ایک نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۱۰ء میں دیا تھا۔

حفیظ الدین احمد | انھوں نے خرد افروز کے نام سے ۱۸۰۳ء میں ابو الفضل کی عیار دانش کا اردو ترجمہ کیا اور عیار دانش خود ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کی تلخیص اور انوار سہیلی کلیلہ دمنہ عربی کا ترجمہ ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ انھیں قصوں کا ایک ناتمام ترجمہ انوار سہیلی سے ایک شخص مرزا مہدی نامی نے کیا تھا جو کپتان ناکس کے منشی تھے اور ان کے ساتھ کلکتہ اور گیا گئے تھے۔ کپتان ناکس نے گیا میں ایک مشہور داستان گو ہینگا خاں نامی سے بھی اسی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا اور ان دونوں کا مقابلہ کرکے مرزا مہدی کے ترجمہ کو ترجیح دی تھی۔ انوار سہیلی کا ایک ترجمہ دکھنی زبان میں بھی موجود ہے جو ایک شخص مسمی محمد ابراہیم بیجا پوری کی تصنیف ہے اور مدراس میں ۱۸۲۴ء میں چھپا ہی۔ بستان حکمت فقیر محمد خاں گویا کی بھی اسی کا ترجمہ ہے اور یہی سب سے بہتر ہے۔ نواب امیر علی خاں وسطی نے ۱۸۷۲ء میں ایک مختصر ترجمہ ستارۂ ہند کے نام سے کیا تھا اور ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ اثر رنگ رضی بہاری لال کھرت پوری نے ۱۸۷۹ء میں کیا تھا۔

مولوی اکرام علی | انھوں نے عربی کی مشہور و معروف اخلاقی کتاب اخوان الصفا کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر کشف الظنون کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہی کہ رسائل اخوان الصفا کو جو تعداد میں اکاون ہیں اشخاص ذیل نے تحریر کیا۔ محمد بن نصر البستی معروف بہ مقدسی۔ ابو الحسن علی بن ہارون الزنجانی۔ ابو احمد النہر جوری عوفی۔ زید بن رفاعہ اور یہ سب کے سب حکیم تھے۔ اس پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر ڈیٹرس نے ۱۸۵۸ء لغایت ۱۸۷۹ء میں کیا مولوی صاحب موصوف نے اردو میں صرف اس قدر حصہ کا ترجمہ کیا ہی۔ جس میں کہ حیوانات اور انسان کی برتری کا سوال شاہ جن کے سامنے پیش کیا گیا ہی۔ مختصر مضمون یہ کہ جانوران اپنے مالک انسان کے ظلم و تعدی سے عاجز آگئے ہیں اور انھوں نے اپنا مرافعہ

بادشاہ اجنہ کے پاس جس کا نام بیورا سپ ہے پیش کیا ہی اس مقدمہ کے فیصلہ کا ایک دن مقرر کیا گیا ہی جس میں سب جانور جمع ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فضائل و فوائد اور یہ کہ وہ انسان کو کیا نفع پہونچاتا ہی اور انسان اس کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا ہی۔ بیان کرتا ہی۔ چنانچہ گھوڑے۔ گدھے۔ اونٹ اور بھیڑی کے بیان یکے بعد دیگرے لیے جاتے ہیں جو سب ایسے ہی دلچسپ ہیں جیسے کہ کنگر بی کی مشہور انگریزی کتاب ایوننگز ایٹ ہوم۔ یہ ترجمہ کپتان ٹیلر صاحب کی فرمائش سے نہایت سلیس اور آسان اردو میں کیا گیا اور ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا۔ کپتان لاکٹ کی سفارش سے جو اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے مولوی اکرام علی ۱۸۱۴ء میں محافظ دفتر مقرر ہوئے تھے۔

للو لال جی | یہ گجراتی برہمن تھے مگر شمالی ہند میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ باوصف اس کے کہ ہنا۔ وتھے مگر اردو کے بھی بڑے ماہر تھے چنانچہ شکنتلا ناٹک سنگھاسن بتیسی۔ بتیال پچیسی اور قصۂ دھونل کی تصنیف میں انھوں نے اصل مصنفوں کو بہت مدد دی تھی جس کا حال اوپر بیان ہوا۔ علاوہ اس کے ۱۸۱۰ء میں انھوں نے ایک کتاب زبان ہندی میں لطیف حکایات کی تصنیف کی جو "لطائف ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔

بینی نرائن | بینی نرائن متخلص بہ جہاں دیوان جہاں کے مصنف ہیں جس میں ایک تذکرہ ہندستانی شعرا کا بھی شامل ہی۔ جو کپتان روبک صاحب سکریٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش سے ۱۸۱۲ء میں لکھا گیا اور انھیں کے نام پر معنون بھی ہی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ "چار گلشن" کے نام سے کیا جس میں بادشاہ کیواں اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ ۱۸۱۱ء میں منشی امام بخش کے ایک دھرا رسے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنھوں نے اس کو پسند کر کے مصنف کو انعام سے سرفراز کیا اور اُس کی اصل کتب خانہ کالج میں داخل کرا دی۔ گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق ہی کہ انھوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی تنبیہ الغافلین کا بھی ترجمہ اردو میں ۱۸۲۹ء میں کیا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بینی نرائن مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت بھی کر لی تھی۔

مرزا علی لطف | کاظم بیگ خاں کے بیٹے تھے جو استرآباد کے رہنے والے تھے اور ۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کی ہمراہی میں آئے تھے اور بعد کو ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی دہلی میں داخل ہو گئے

لطف فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اپنے باپ کے شاگرد تھے جن کا تخلص ہجر یا ہجری تھا۔ اردو شاعری کی نسبت لطف کا خود بیان ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں دکن حیدر آباد کے سفر کے ارادے سے نکلے تھے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے ان کو روک لیا۔ اور ان کا مشہور تذکرہ "گلشن ہند" ان سے لکھوایا چنانچہ اس قصہ کا ذکر انھوں نے اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء اور ماخذ نواب علی ابراہیم خاں کا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے گو کہ اس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ بالکل نایاب تھا۔ جب حیدر آباد میں طوفان عظیم آیا تو اس کی ایک جلد موسیٰ ندی میں بہتی ہوئی جارہی تھی اتفاقاً وہ کسی قدردان کے ہاتھ آئی اور اب وہ ایک نہایت نفیس مفید اور دلچسپ مقدمہ کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کے اہتمام سے شائع ہوگیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس وجہ سے کہ اُس زمانہ کا طرز تحریر اُس وقت کے مشہور مشہور شاعروں کے دلچسپ حالات جن سے کہ مصنف سے ملاقات ہوئی اور اُس وقت کی سوسائٹی کے مرقعے اس میں موجود ہیں۔ ہر چند کہ صحت واقعات کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ قابل وثوق نہیں اور عبارت بھی ضرورت سے زیادہ پرتکلف اور پرتصنع مسجع ومقفی ہے

مولوی امانت اللہ ان کا تخلص شیدا تھا انھوں نے اخلاق جلالی کا ترجمہ "جامع الاخلاق" کے نام سے کپتان جیمس مونٹ صاحب کے حکم سے ۱۸۰۵ء میں کیا۔ دیباچہ میں کپتان مذکور اور نیز گورنر جنرل مارکوس آف ولزلی کی نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف ہے۔ مولوی امانت اللہ نے ۱۸۰۴ء میں کتاب ہدایت الاسلام بزبان عربی و اردو تحریر کی جس کا ترجمہ خود گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں کیا ۱۸۱۱ء میں انھوں نے ایک منظوم صرف ونحو اردو موسوم بہ "صرف اردو" تصنیف کی۔

اس عہد کے دیگر منشی اور نثار علاوہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا اس عہد کے بعض دیگر منشی ونثار یہ تھے سید جعفر علی رذاؔی لکھنوی۔ افتخار الدین شہرتؔ۔ عبد الکریم خاں کریمؔ دہلوی۔ مرزا ہاشم علی عیاںؔ۔ مرزا قاسم علی امتیازؔ۔ میر عبد اللہ مسکینؔ۔ مرزا جان طپشؔ۔ مولوی خلیل علی خاں اشکؔ اور مرزا محمد فطرتؔ۔ اشکؔ نے ۱۸۰۵ء میں اکبر نامہ کا ترجمہ "واقعات اکبر" کے نام سے تیار کیا مگر وہ شائع نہیں ہوا۔ طپشؔ نے ایک کتاب اردو محاورات پر لکھی اور ۱۸۱۱ء میں ایک طویل مثنوی بہار دانش کے نام سے لکھی ان کا کلیات

فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہو گیا ہے

تراجم قرآن شریف از مولانا شاہ ولی اللہؒ وشاہ عبدالعزیزؒ وشاہ عبدالقادر وشاہ رفیع الدینؒ	مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مشہور محدث وصوفی اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ہیں ان کے متعدد

تصانیف ہیں جن میں حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاعن سیرۃ الخلفا نہایت مشہور و ممتاز ہیں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب بھی علم وفضل اور زہد و تقویٰ میں اپنے والد بزرگوار سے کم نہ تھے ان کا انتقال ۱۲۲۹ھ میں ہوا۔ دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ھ-۱۲۳۳ھ) بھی نہایت جید عالم تھے جنھوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا تیسرے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالقادر تھے (۱۱۶۷ھ-۱۲۳۴ھ) جو اپنے علم وفضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے واسطے مثل اپنے پدر بزرگوار اور برادران محترم کے مشہور تھے۔ انھوں نے ۱۲۰۵ھ میں ایک دوسرا اردو ترجمہ قرآن شریف کا کیا اور ایک تفسیر موضح القرآن کے نام سے تصنیف کی۔ ان کا ترجمہ نہایت سلیس سادہ اور بامحاورہ اردو میں ہی جس سے اُن کا تجر علمی بدرجہ اتم ظاہر ہی۔ یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا اور اب تک ہی کہ مولوی نذیر احمد صاحب اپنے ترجمہ قرآن شریف میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا پورا خاندان اس علمی خدمت کے واسطے مشہور ہی اور حق یہ ہی کہ یہ حضرات مترجمین متاخرین کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ گئے کیونکہ ان لوگوں کے تراجم اصل میں قرآن شریف کے تراجم نہیں ہیں بلکہ خاندان شاہ ولی اللہ کے تراجم کے تراجم ہیں۔ ہمارے نزدیک شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے فی الحقیقت اُس تغیر عظیم کا پتہ دیتے ہیں جو زبان اُردو میں ہونے والا تھا جبکہ فارسی کا اختلاط ہو رہا تھا۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی	مولوی عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے پوتے تھے

ذہانت اور رسائی فکر میں یگانۂ روزگار اور اپنے عہد کے بہت بڑے عالم باعمل تھے۔ سید احمد مجاہد بریلوی کے ہمراہ جہاد کی نیت سے نکلے مگر قلعہ بالاکوٹ ملک پنجاب کے قریب شربت شہادت سے سیراب ہوئے یہ واقعہ ۱۲۴۶ھ کا ہی۔ شاہ نصیر نے اس واقعہ کو مذاق کے طور پر ایک قصیدہ کی صورت میں لکھا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں:-

کلام اللہ کی صورت ہو ادل ان کا سیپارہ ‖ نہ یاد آئی حدیث اُن کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے ‖ اگرچہ تھے دُم شملہ سے وہ شبیر نیستانی

جب اس قسم کے طنز آمیز اشعار اُن کے مریدوں نے سُنے تو وہ شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ دوڑے اور اُن کی خوب خبر لینا چاہی۔ مرزا آخانی کوتوال شہر کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ موقع واردات پر پہونچے اور شاہ صاحب کو اُن لوگوں سے چھڑایا۔ مولانائے موصوف کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں۔ رسالہ توحید صراط مستقیم۔ تنویر العینین۔ تقویتہ الایمان وغیرہ۔

ترتیب صرف ونحو ولغات اردو

کتب درسیہ اور تراجم کے علاوہ ترتیب صرف ونحو وتراجم کے اوپر بھی پوری توجہ مبذول کی گئی۔ کتب مذکورہ ذیل اُن یوروپین اصحاب کی تصنیف وتالیف ہیں جن کو زبان اُردو کی ترقی سے بہت دلچسپی تھی۔ سب سے پہلی ہندستانی گرامر وہ ہے جو ۱۷۱۵ء میں جان جوشو اکٹیلر نے تصنیف کی تھی جو بزمانہ شاہ عالم وجہاندار شاہ یعنی ۱۷۱۲ء میں مملکت ہالینڈ کی طرف سے ہندوستان میں سفیر تھے۔ انھوں نے آگرہ لاہور دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی تھی اور ۱۷۱۶ء میں اپنے ملک کی طرف سے ایران میں بھی سفیر ہوئے تھے، انھوں نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت تیار کی جس کو ایک انگریز ڈیوڈمل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ کٹیلر مذکور کی گرامر میں نہ صرف ہندوستانی افعال کی گردانیں ہیں۔ بلکہ احکام عشرہ توراۃ اور "لارڈس پریر" کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے۔ ۱۷۴۴ء میں ایک مشہور جرمن پادری شلز نامی نے ایک دوسری ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرا ٹیکا ہندوستانی کا" زبان لاطینی میں تیار کی جس میں ہندوستانی الفاظ بخط عربی وفارسی مع خط انگریزی کے تحریر کئے۔ اسی سنہ میں مل نے ہندوستانی حروف تہجی اور کچھ ہندوستانی الفاظ کے اوپر ایک رسالہ لکھا۔ ۱۷۴۵ء میں بھی اسی مضمون کی ایک کتاب جی۔ اے۔ فرٹز نے تصنیف کی جس میں ہندوستانی حروف تہجی کا دوسرے ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور ۱۷۶۱ء میں اسی قسم کی ایک تیسری کتاب ایک اٹالوی پادری کیسا نوبلی گاٹی نے تصنیف کی جس کا

لہ یہ مرزا آخانی راقم آثم (مترجم) کے دادا تھے جن کی تعریف میں اسی قصیدہ میں بطور شکریہ کے شاہ صاحب نے یہ شعر کہا ہے
سہ نصیر الدین بے چارہ تو رستہ طوس کا لیتا ؛ نہ ہوتے شحنہ دہلی اگر یاں میرزا آخانی۔ (دیکھو آب حیات ذکر شاہ نصیر)

نام "الفابٹیم برہانکم" رکھا۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی حروف اپنی خاص شکل میں ٹائپ میں لکھے گئے۔ ۱۷۷۲ء میں ہیڈلی کی گرامر اور ۱۷۷۸ء میں زبان پرتگالی میں ایک ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرامٹیکا اندوستانا" چھپیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصانیف کا زمانہ آتا ہے جنھوں نے نہایت شوق و تلاش سے متعدد رسائل گرامر اور لغات اور فرہنگیں اور تحقیقات زبان کے متعلق دوسری کتابیں تصنیف کیں اور چھپوائیں ان کی مدت تصنیف بیس برس ہے۔ اور ۱۷۸۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے تقریباً پندرہ کتابیں متعلق بہ صرف و نحو و علم الالسنہ و لغات و تراجم و امثال وغیرہ تصنیف کیں اکثر ہندوستانی منشی اور پنڈت جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے ان کے ساتھ یہ بھی شریک تصنیف رہے اس کے علاوہ ان کی نگرانی میں متعدد عمدہ عمدہ ادبی کتابیں تیار ہوئیں۔ مختصر یہ کہ اس عہد کی تصنیفات و تالیفات کے وہ روح رواں تھے۔ اور علاوہ علمی قابلیت و استعداد کے ایسے خلیق متواضع اور ہمدرد واقع ہوئے تھے کہ مختلف اقطاع ملک سے قابل قابل لوگ ان کی قدردانی کا شہرہ سن کر ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مطبوعہ ۱۷۹۰ء اور ایک ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۷۹۶ء ہے۔ اسی طرح کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۰۸ء میں اور مولوی امانت اللہ نے ایک مختصر ہندوستانی صرف و نحو منظوم موسوم بہ صرف اردو ۱۸۱۰ء میں تصنیف کیں۔ جان شیکسپیر کی ہندوستانی گرامر ۱۸۱۳ء میں اور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئیں۔ کپتان پرائس اور ٹیلیس نے بھی ہندوستانی کتابیں لکھیں گارسن ڈیٹاسی مشہور مستشرق فرانس نے زبان اردو کے متعلق متعدد کتابیں زبان فرانسیسی میں تصنیف کیں اور ڈنکن فاربس نے اپنی متعدد تصانیف سے جو از قسم گرامر اور لغت ہیں اور نیز اردو کی قدیم کتابوں کو ایڈٹ کر کے زبان اردو کو ممنون احسان کیا۔ سر ولیم مانیر بانی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور ڈاکٹر فیلن نے بھی نہایت مفید کتابیں بصورت گرامر اور لغت کے تصنیف کیں۔ پلیٹ کی گرامر ۱۸۷۴ء میں اور ڈکشنری ۱۸۸۴ء میں اور پادری کریون صاحب کی مختصر ڈکشنری ۱۸۸۱ء میں چھپ کر نکلیں اور یہ سب کتابیں طلبا کے لیے نہایت مفید سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستانیوں کے مرتب کردہ لغات و دیگر کتب

اب دیکھنا چاہیے کہ خود ہندوستانیوں نے اپنی زبان کی ترقی و تدوین میں کیا حصہ لیا۔ انشا اور قتیل کی متحدہ تصنیف "دریائے لطافت" جس کو زبان اردو کی سب سے زیادہ مشہور اور قدیم صرف و نحو کی کتاب سمجھنا چاہیے ۱۸۰۲ء میں تحریر اور ۱۸۴۸ء میں بمقام مرشدآباد پہلی بار شائع ہوئی۔ منشی محمد ابراہیم نے ایک اردو کی صرف و نحو معروف بہ تحفہ الفنسٹن ۱۸۲۳ء میں لکھی مولوی احمد علی دہلوی کا رسالہ "چشمہ فیض" اردو کی صرف و نحو پر ۱۸۴۵ء اور مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدائق البلاغت ۱۸۴۹ء اور منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی۔ نثار علی بیگ فیض اللہ خاں اور محمد احسن کے رسالہ جات صرف و نحو مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب "جامع القواعد" مطبوعہ لاہور ۱۸۴۵ء جلال کی "گلشن فیض" مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۰ء جو ایک اردو ہندی الفاظ و محاورات کی تحقیق کی لغت ہے یہ سب اسی زمانے کی تصنیف ہیں۔ زمانہ حال کی تصانیف میں منشی امیر احمد صاحب کی مشہور لغت امیر اللغات (جو افسوس ہے کہ ناتمام ہے) مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ چار جلدوں میں جو سالہاسال کی کاوش و محنت کا بہت اچھا نتیجہ اور حضور نظام کی سرپرستی اور دریا دلی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اور مولوی نور الحسن صاحب نیّر کاکوروی کی نور اللغات قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے ایک مختصر رسالہ صرف و نحو ایک نئے طریقے سے ترتیب دیا ہے۔ مگر ہماری ناچیز رائے میں باوجود ان تمام کتب کے جن میں سے اکثر فی زمانا موجود ہیں پھر بھی ایک مکمل سائنٹیفک اردو گرامر کی اب بھی سخت ضرورت ہے۔ بہتر یہ کہ اگر اس زمانے کے فضلا کمر ہمت باندھ لیں اور امیر اللغات کی باقی جلدیں پوری کر دیں اور کوئی دریا دل رئیس اس کی طباعت کا اہتمام کر دے تو اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے تکمیل سے زبان اردو کی نہایت معقول اور عمدہ خدمت سرانجام پائے گی۔

عیسائی پادریوں کے کارنامے زبان اردو کی توسیع و ترقی میں

سب سے قدیم اردو ترجمے بائبل کے وہ ہیں جو بنجمن شلز اور کالبرگ نے ۱۷۴۸ء لغایت ۱۷۵۸ء میں کئے مرزا محمد فطرت اور دیگر کالج کے منشیوں نے عہد جدید کا ترجمہ اردو میں کیا جو بہ نظر ثانی ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۰۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اسی طرح سیرام پور کے پادریوں نے بھی بائبل کے ترجمے اردو ہندی میں نکالے۔ پادری مارٹن نے ۱۸۱۴ء میں عہد جدید کا ترجمہ

زبان یونانی سے اُردو میں کیا جس پر مرزا محمد فطرت نے نظر ثانی کی۔ پوری بائیبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء لغایت ۱۸۱۹ء میں شایع کیا۔ پادری لوگ اپنے مطالب عوام الناس کے دل نشین کرنے کے واسطے انھیں کی زبان میں اپنی تحریریں اور تقریریں کرتے تھے اور اشاعت دین کی غرض سے متعدد رسالے پمفلٹ اور اخبار وغیرہ نکالتے تھے جن میں مذہبی روایتوں اور گتھیوں کے علاوہ بہت سی مفید چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں جن سے زبان کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔

باب ۱۶

نثر اُردو کا دورِ متوسط اور دورِ جدید

مطبوعات لکھنؤ

ہر چند کہ نثر اُردو کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ بھی جو دلی کی تباہی کے بعد علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز بن گیا تھا نثر نگاری میں فورٹ ولیم کالج سے کچھ کم نہ رہا کتب ذیل سب اسی اشرف البلاد کی طباعت کی یادگار ہیں بستان حکمت۔ کلیلہ دمنہ۔ گل بکاولی۔ گلشن نو بہار۔ گل و صنوبر۔ نورتن مصنفہ محمد بخش مہجور شاگرد جرأت وغیرہ وغیرہ۔

فقیر محمد خاں گویا
بستان حکمت ۱۲۵۱ھ

نواب فقیر محمد خاں لکھنؤ کے ایک نامور رئیس اور فوج شاہی کے ایک مشہور رسالدار تھے حسام الدولہ خطاب اور گویا تخلص کرتے تھے ناسخ کے شاگرد تھے مگر خواجہ وزیر سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں گو دیوان ان کے مرنے کے ایک عرصہ کے بعد مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں چھپا۔ گویا کا انتقال ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ ان کی تصنیف بُستان حکمت انوار سہیلی کا مشہور ترجمہ ہے جو ۱۲۵۱ھ میں ختم ہوا اور شیخ ناسخ نے تاریخ کہی جس کا مصرع تاریخ یہ ہے ع خرد گفت بُستان سیراب حکمت۔ سبب تالیف اس کا مُصنف یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن وہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے، اور چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور انوار سہیلی کا ذکر ہو رہا تھا۔ اور سب لوگ اس کی تعریفیں کر رہے تھے کہ اثنائے گفتگو میں سب اہل محفل نے

مصنف سے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے اگر تم اردو میں ترجمہ کرو تو خوب چیز ہو غرض کہ ان لوگوں کے اصرار پر مصنف نے کمر ہمت باندھی اور ترجمہ شروع کرکے انجام کو پہونچایا۔ اگر کتاب کو بالاستیعاب پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترجمہ لفظی نہیں ہے بلکہ موقع موقع پر ایجاز و اطناب کو دخل دیا ہے البتہ عربی و فارسی الفاظ بہ کثرت ہیں اور زبان بھی شگفتہ اور سلیس نہیں۔ عربی الفاظ اور امثال بکثرت استعمال کئے گئے ہیں جس سے کہیں کہیں عبارت بے مزہ اور مغلق ہو گئی ہے۔ مگر یہ بات قابل توجہ کہ عبارت مقفی اور مسجع نہیں جیسا کہ سرور کی فسانۂ عجائب کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب اپنے زمانے میں مقبول تھی مگر اب لوگ اس کو کم پڑھتے ہیں

لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور نثار مرزا رجب علی بیگ سرور ایک جامع الکمالات شخص تھے باپ کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ۱۲۰۱ھ یا ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے	مرزا رجب علی بیگ سرور متوفی ۱۲۸۶ھ

اور وہیں نشو و نما اور تعلیم پائی۔ عربی و فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاطوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس فن میں حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے جن کا ذکر فسانۂ عجائب میں موجود ہے موسیقی سے بھی علمی و عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے فن شعر میں آغا نوازش تلمیذ میر سوز کے شاگرد تھے جن کا ذکر اپنی کتاب میں بہت محبت و ادب سے کرتے ہیں۔ حریف ظریف ہشاش بشاش وجیہ اور خوش رو آدمی تھے۔ ان کے دوستوں میں شرف الدین میرٹھی اور مرزا غالب بھی تھے اور آخر الذکر نے فسانۂ عجائب اور گلزار سرور پر فاضلانہ تقریظیں بھی لکھی ہیں۔

۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے حکم سے جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنہ ہجری نبوی صلعم بارہ سو چالیس تھے آنے کا اتفاق مجبوراً کو روہ کانپور میں ہوا۔ بسکہ یہ بستی ہیچ و پوچ ہے اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں۔ اچھا نا جو ہوں گے تو گوشہ نشین عزلت گزیں۔ مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ بہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل سخت گھبرایا کلیجہ منھ کو آیا۔ قریب تھا کہ جنون ہو جائے۔ تیرہ بختی الٹہ زیادہ پیش لائے" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ یہیں کانپور میں حکیم سید اسد علی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے ایک دن ان سے کہا کہ میں ایک قصہ لکھنا چاہتا ہوں۔ سن کر فرمایا!

بیکار مباش کچھ کیا کر۔ اُس وقت یہ کلمہ توسن طبع پر تازیانہ ہوا یعنی باعث تصنیف کتاب بن گیا پھر اسی کے آگے ایک طنز یہ طور پر لکھتے ہیں کہ میاں ہیچمپرز ہوں مجھ کو زبان کا دعویٰ نہیں۔ اگر شاہجہان آباد کا رہنے والا ہوتا تو زباں دانی کا دعوی کرتا جیسا کہ میر امن نے کیا ہے۔ جن کی نسبت یوں گلفشانی کرتے ہیں " اگر وہاں (شاہجہان آباد میں) چند روز بود وباش کرتا فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا کہ میر امن نے چار درویش میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصہ میں یہ بات آئی ہے دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منھ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے بشر کو دعوئے کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ وعار ہے مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"[۵] مختصر یہ کہ کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس کے شروع میں چند سطور بادشاہ وقت غازی الدین حیدر کی مدح وثنا اس غرض سے لکھی ہیں کہ اُن کا قصور معاف کیا جائے اور لکھنؤ آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔ جن کی تعریف میں سرور نے لکھنؤ کے حالات کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا ہے اور آخر میں ایک دعائیہ غزل بھی ان کی شان میں ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

تا ابد قائم رہے فرمانروائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ

اسی غزل کے چند مشہور شعر یہ ہیں ؎

یا تو ہم پھرتے تھے اُن میں یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

اُن کی استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جام جم پر تُف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

جن وانس ووحش وطائر کیوں نہ سب محکوم ہوں
ہے سلیماں ان دنوں فرمانروائے لکھنؤ

یوں رہے آباد یارب تا بہ دورِ مشتری
میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ

بُلبُل شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اُس نے کہے ہیں کوچہائے لکھنؤ

[۵] اس سخت تنقید کا جواب خواجہ فخر الدین حسین صاحب سخن دہلوی مرحوم نے سروش سخن میں نہایت دنداں شکن اور معقول دیا ہے (دیکھو دیباچہ سروش سخن)

سرور کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنؤ میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ تحریر ہوئی مگر بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۰ھ ہی جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۴۶ء میں سرور کی بیوی کا انتقال ہوا اور اسی سال سرور واجد علی شاہ کے درباری شعرار میں بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار داخل ہوئے۔ اور انھوں نے اپنا مدحیہ قصیدہ حضرت ظل سبحانی کی تعریف میں معرفت قطب الدولہ مصاحب شاہی پیش کیا۔ ۱۸۴۷ء میں بادشاہ کے حکم سے کتاب شمشیر خانی کا ترجمہ موسوم بہ سرور سلطانی کیا اور ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۱ء کے اثنا میں اکثر چھوٹے چھوٹے قصے تصنیف کیے جن میں سے ایک "شرر عشق" ہے جو نواب سکندر بیگم والی بھوپال کے حکم سے لکھا گیا۔ ۱۸۵۶ء میں "شگوفۂ محبت" امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائش سے تحریر ہوا۔ انتزاع سلطنت ۱۸۵۶ء کی وجہ سے سرور بہت خستہ حال اور پریشان روزگار ہو گئے تھے کچھ دنوں سید قربان علی سررشتہ دار کانپگی صاحب اور منشی شیو پرشاد ملازم کمسریٹ نے ان کی اعانت کی لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس ذریعہ کو بھی منقطع کر دیا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والی بنارس کی طلبی پر سرور ۱۸۵۹ء میں بنارس گئے اور مہاراجہ صاحب نے وہاں ان کی بہت قدر افزائی اور خاطر و مدارات کی۔ بنارس میں اُنھوں نے "گلزار سرور"، "شبستان سرور" اور دیگر نظم و نثر کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کیں۔ مہاراجہ بنارس کی طرح سرور کو مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے بھی اپنی اپنی ریاستوں میں طلب کیا تھا اور آخر الذکر نے ایک جوڑی طلائی کڑوں کی ان کو مرحمت فرمائی تھی۔ سرور کے ایک خط سے جو ان کی انشائے سرور میں چھپ گیا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی لکھنؤ، میرٹھ اور راجپوتانہ بھی گئے تھے اس وجہ سے کہ اس خط میں انھوں نے اپنے سفر کی تکلیفوں کا حال مشرح طور پر لکھا ہی۔ انشائے مذکور میں جو خطوط درج ہیں وہ ان کے سوانح زندگی اور اس عہد کے حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک مرتبہ اُن پر ایک الزام قتل بھی لگایا گیا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتہ گئے تھے۔ اور واجد علی شاہ سے بھی ملے تھے جو اُس وقت مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ مگر سرور وہاں سے ناکام آئے اور بالآخر اپنی آنکھوں کا علاج لکھنؤ میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر سے کرایا۔ اس کے بعد وہ بنارس گئے جہاں ۱۸۶۷ء

(مطابق ۱۲۶۵ھ) میں (یعنی غالب سے ایک سال پیشتر) انتقال کیا۔

فسانۂ عجائب | سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تصنیف فسانۂ عجائب ہے۔ اس کا قصہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کے مضمون و واقعات میں کوئی جدت نہیں اور عبارت اسی زمانے کی مروجہ فارسی کی تقلید میں پُر تکلف و تصنع و مقفیٰ اور مسجع ہے۔ یہ ایک ایسا فرضی افسانہ ہے جس میں طلسم سحر دیووں سے لڑائی جادوگروں سے مقابلے سفر کے عجائب و غرائب بکثرت ہیں۔ یہ نوجوان طبیعتوں کو بہت مرغوب ہے مگر سن رسیدہ لوگ نفس قصہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے البتہ اس کی زبان اور مصنوعی عبارت کو اکثر پسند کرتے ہیں۔ اس کی عبارت پُر تکلف ہے مگر اس میں واقعات کی فراوانی نہیں ہے بعض فقرات ضرور ایسے ہیں جو مثل نظم کے دلچسپ ہیں اور ادبی مرصع کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس کتاب کو زمانہ حال کے اصول تنقید سے جانچنا ایک فضول سی بات ہے اس وجہ سے کہ مصنف اگلے زمانے کے لوگوں میں ہیں۔ قصہ بھی پُرانے رنگ کا ہے اور طرز عبارت اُس زمانے کا ہے جب فارسی عام طریقے سے رائج تھی اُردو کے خطوط تک میں تصنع اور تکلف شامل تھا اور سادگی عبارت کو لکھنے والے کی سادہ لوحی اور عدم قابلیت پر محمول کرتے تھے۔ ان قیود پر نظر کرتے ہوئے ہم کو ان لوگوں کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے قدیم فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ مثلاً مرزا غالب اور سر سید وغیرہ جس طرح نظم اُردو کی ابتدا مرثیوں غزلوں اور مثنویوں سے ہوئی اُسی طرح فرضی قصوں اور افسانوں پر نثر اُردو کی بنیاد رکھی گئی اور جس طرح اصناف نظم مذکورہ تدریجی ترقی کرتی ہوئی اس درجے کو پہونچیں اسی طرح نثر اُردو بھی اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے زمانۂ حال کی سلیس اور متین سادہ روش پر آ گئی فسانۂ عجائبات کا دیباچہ اس لیے اور بھی دلچسپ ہے کہ اُس میں اُس زمانے کی شہر لکھنؤ کی سوسائٹی وہاں کے طرز معاشر امرا و روسا کی وضعداریوں اُن کے پُر تکلف جلسوں۔ شہر کے رسوم و رواج کھیل تماشوں۔ دلچسپ مناظر۔ مختلف پیشوں اور اہل کمال کے حالات۔ بازاروں کی چہل پہل۔ سودا فروشوں کی آوازوں وغیرہ وغیرہ کی دلکش اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو سرشار کی مرقع نگاری سے علٰحدہ سمجھنا چاہیے اس وجہ سے کہ سرشار کے یہاں کیریکٹر اور مختلف سوسائٹیوں کے بحیثیت مجموعی نمونے دکھائے گئے ہیں۔

ان میں تفصیل و تطویل سے کام لیا ہے اور اپنے ظریفانہ طرزِ بیان سے اُس میں ایک دلکش اور نظر فریب رنگینی پیدا کر دی ہے برعکس اس کے سرور کے یہاں سوسائٹی کے مرقعے یا کیرکٹر نگاری کے کرشمے نہیں ہیں نیز یہ کہ سرور اپنے سلسلۂ بیان میں اُن چیزوں پر جن کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں صرف ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرشار بحیثیت ایک ناولسٹ کے کیرکٹر نگاری اور تفصیل جزئیات کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کی سرور کو چنداں ضرورت نہیں اس موقع پر پنڈت لچھمن نرائن در کے وہ فاضلانہ خیالات سننے کے قابل ہیں جو فسانۂ عجائب کو پڑھ کر انھوں نے انگریزی میں قلم بند فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرشار کے بہ نسبت سرور کے یہاں لکھنؤ کا بیان بہت زیادہ مکمل۔ بہت زیادہ متناسب اور بہت زیادہ خوبصورت ہے۔ مگر سرور آدمیوں کا حال نہیں لکھتے صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔ حلوائی کی دوکان کے پاس سے ہم گزرتے ہیں اور ہمارے مُنھ میں پانی بھر آتا ہے۔ تنبولیوں کے یہاں کی گلوریاں دیکھ کر ہمارا جی للچاتا بالائی کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ کی بالائی کے آگے ڈیونشایر کی کریم (بالائی) کوئی چیز نہیں۔ لبس فروش جوہری بنیئے بقال۔ کنجڑے سب جوکھا مال لیے بیٹھے ہیں۔ چوک اور دوسری بازاریں اور سیرگاہیں (جواب باقی نہیں رہیں) ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور اُن کی خوب سیر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ اُن بلند عمارتوں اور کمروں پر بھی جاتی ہے۔ جہاں سے کچھ حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہم کو جھانکتی ہیں ہم چوک میں ہو کر گزرتے ہیں مگر وہ ایک شہر خموشاں ایک سُونی بستی معلوم ہوتا ہے۔ راہ گیر اور دوکان دار سب سوتے ہیں ہم مجمع میں چلتے ہیں مگر کھوے سے کھوا وہاں نہیں چھلتا۔ کمرے والیاں ہمارے اشاروں کا جواب نہیں دیتیں تنبولنیں کرشمہ و ناز میں مصروف ہیں مگر مُنھ سے کچھ نہیں بولتیں۔ کنجڑے بھرے ہیں۔ بساطی بددست۔ حلوائی اونگھ رہے ہیں حلوا اُن کی مٹھائیاں جیبوں میں بھر کے چلیں۔ زندگی کا کہیں پتہ نہیں۔ مشہور مشہور گویتے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر اُن کا گانا سننے میں نہیں آتا۔ شعرا۔ فوجی سپاہی۔ پہلوان۔ بادشاہ وزیر سب سامنے سے فانوسی تصویروں کی طرح گزر جاتے ہیں سب خاموش۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سب تصویریں بے ہوشی کے عالم کی کھینچی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر خموشاں ہے جس کا نقشہ ٹینیسن نے اپنی مشہور نظم "ڈے ڈریم" (خوابِ روز) میں

کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"کہیں بٹلر (خانساماں) اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں شراب کی بوتل دبائے بیٹھا ہے جو آدھی رہ گئی ہے۔ اور کہیں بُڈھا اسٹوورڈ (باورچی) اپنے کام میں مصروف ہے۔ کہیں حسین میڈ (ماما) کا ہاتھ نوعمر خادم (پیج) نے پکڑ لیا ہے۔ میڈ کچھ کہنے کے لیے اپنا مُنھ کھولا چاہتی ہے۔ پیج بوسہ کے واسطے مُنھ لپکاتا ہے۔ اور شرم کی سُرخی میڈ کے رخساروں پر دوڑ جاتی ہے۔"

اُس زمانے میں مقفّیٰ مسجع عبارت اس درجہ مقبول اور مروّج تھی کہ اس سے احتراز مشکل تھا۔ اسی وجہ سے فسانہ عجائب کی عبارت سلیس اور بول چال روزمرّہ میں شمار نہیں کی جاسکتی برعکس اس کے اس میں تعقید و تکلف بیحد ہے۔ اور سرور کی کھینچی ہوئی تصویریں جابجا کہ پنڈت بشن نرائن درنے اوپر بیان کیا ہے۔ اشخاص قصہ کے صحیح خط و خال نہیں دکھاتیں بلکہ وہ محض اُن اشخاص کے ماحول اور گرد و پیش کو ظاہر کرتی ہیں توانی کی پابندی کی وجہ سے سلسلۂ بیان کی روانی اور سلاست میں فرق پڑ جاتا ہے اور اکثر جگہ پڑھنے والا الفاظ کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ سرور نے اپنے جذبۂ وطنی کے جوش میں میر امن بلکہ دلّی والوں پر اکثر چوٹیں کی ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا۔ قصے میں کیرکٹر نویسی کم ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ملکۂ مہر نگار کے کیرکٹر میں سچی محبت باوفائی۔ دلیری۔ معاملہ فہمی جرأت اور متانت و بردباری کو نہایت واضح طریقے سے دکھایا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ضمناً بعض قصے ایسے بھی بیان کیے ہیں جن کے ہیرو انگریز ہیں۔ مثلاً پیٹرسن کا قصہ جس کے ذیل میں کچھ انگریزی الفاظ آگئے ہیں جو شاید اس سے پیشتر نثر اُردو میں شاذ و نادر استعمال ہو رہی ہوں۔ دنیا کی بے ثباتی کا سبق جو بندر کی تقریر سے ملتا ہے اور جوگی کی عبرت افزا نصیحتیں نہایت مؤثر اور دلکش ہیں۔ اس کتاب کے جواب میں دو قصے اور بھی لکھے گئے ایک "سروش سخن" مولفہ خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی جو ۱۸۶۰ء میں تحریر ہوا اور جس میں سرور پر بہت سی چوٹیں کی گئی ہیں اور دلّی والوں کی تعریف میں ہیں۔ دوسرا "طلسم حیرت" مولفہ محمد جعفر علی شیون لکھنوی جو ۱۸۷۲ء میں تصنیف ہوا جس میں سرور بلکہ اہل لکھنؤ کی طرف سے "سروش سخن" کے مطاعن کا جواب دیا گیا ہے۔

سرور کی دیگر تصانیف | (۱) ۱۸۴۷ء میں سرور سلطانی ترجمہ "شمشیر خانی" جو شاہنامہ فردوسی کا ملخص ہے اس کا بھی طرز عبارت مثل فسانہ عجائب کے مقفیٰ اور مسجع ہے جو تاریخ کے لیے مناسب نہیں۔ اس میں ایک مقام پر جذبۂ وطنیت کے جوش میں ہندستان کی بہت تعریف کی ہے جو قابل دید ہے (۲) ۱۸۵۱ء میں "شرر عشق" جس میں بھوپال کے جنگلوں کے کسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ایک سارس کا جوڑا جس کی محبت مشہور ہے ایک جنگل میں پھر رہا تھا کہ نر کو کسی نے مار ڈالا۔ مادہ نے لکڑیاں جمع کیں اور اُس کے اوپر نہایت باقاعدہ طریقے پر ستی ہوگئی وغیرہ (۳) اسی سال "شگوفہ محبت" بھی لکھا گیا۔ جس میں مہر چند کھتری کا پرانا قصہ نئے انداز سے بیان کیا ہے اور واجد علی شاہ کے سفر کلکتہ کا بھی اس میں ذکر ہے (۴) "گلزار سرور" جو ایک فارسی کتاب حدائق العشاق کا ترجمہ ہے جس میں ایک افسانہ کی صورت میں روح اور عشق کا مجادلہ دکھایا گیا ہے یہ ایک مذہبی مضمون ہے جس کو مصنف نے اپنی خاص رنگین عبارت میں لکھا ہے۔ اسی پر مرزا غالب نے ایک دلچسپ تقریظ اُسی رنگ یعنی مقفیٰ عبارت میں لکھی ہے (۵) "شبستان سرور" یعنی الف لیلہ کے چند قصوں کا دلچسپ ترجمہ جس میں جا بجا چیدہ اشعار داخل کرکے کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

الف لیلہ کے ترجمے | الف لیلہ کے قصے ہندوستان میں ہمیشہ سے مقبول رہے اور اُن کا ترجمہ اکثر لوگوں نے کیا ہے۔ منشی شمس الدین احمد نے ۱۸۳۶ء میں مدراس سے ایک ترجمہ نکالا جس کا نام "حکایات الجلیلہ" ہے اس میں صرف دو سو راتوں کی حکایات ہیں اور مدراس کالج کے طلباء کے واسطے یہ کتاب لکھی گئی تھی دوسرا ترجمہ منشی عبدالکریم نے ۱۸۴۴ء میں فارسٹر صاحب کی انگریزی الف لیلہ سے کیا۔ جس کی زبان اس قدر صاف اور سہل ہے کہ ادبی ذوق کے لوگ اس کو معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں پھر ایک منظوم ترجمہ منشی نولکشور صاحب کی فرمائش سے ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۸ء میں چار حصوں میں تسنیم دہلوی منشی طوطا رام شایاں اور منشی شادی لال چمن نے کیا۔ جس کا ایک نثر کا ترجمہ منشی طوطا رام شایاں نے ۱۸۶۸ء میں نکالا اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں حامد علی نے ترجمہ کیا اور مرزا حیرت دہلوی نے ۱۸۹۲ء میں "شبستان حیرت" کے نام سے بطرز ناول ترجمہ کیا۔ (۶) شاہزادہ ایڈورڈ (جو بعد کو ایڈورڈ ہفتم ہوئے) کی شادی کے موقع پر سرور نے ایک تہنیت نامہ موسوم بہ "نثر نثر و نثار" لکھا جس میں انگریزی حکومت کے

فوائد اور برکات نہایت عمدہ الفاظ میں بیان کیے ہیں (۷) انشائے سرور یعنی سرور کے خطوط جو انھیں کے خاص طرز میں ہیں۔

اُردو نثاروں میں سرور کا رتبہ | اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم طرز کے اُردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ بہت بلند ہو اپنے طرز خاص میں وہ عدیم المثال ہیں۔ مگر بعد کو جب زمانے کا رنگ بدلا اور کاروباری دور شروع ہوا تو اس قسم کی پُر تکلف اور پُر تصنع عبارت جس کے طویل جملوں اور ثقیل عربی و فارسی الفاظ سے لوگوں کا جی اکتا گیا تھا اور موجودہ ضرورتوں کے اظہار کے لیے بھی وہ ناموزوں تھی، ترک کی گئی۔ بہرطور سرور نے اپنا رنگ خوب برتا اور اس رنگ کے وہ بڑے ماہر تھے۔ اُن کی تمام تصنیفات میں لکھنؤ کے حالات اور یہاں کی سوسائٹی کے مرقعے خاص طور پر بہت دلچسپ ہیں۔ نثر میں اُن کو اتنا شغف تھا اور اس میں وہ اتنے مشہور ہوئے کہ ان کے دیگر کمالات یعنی اُن کی خوشنویسی اُن کی موسیقی دانی یہاں تک کہ ان کی شاعری بھی اس کے سامنے فروغ نہ پا سکی۔ ان کا دیوان مفقود ہو مگر اُن اشعار سے جو ان کی نثر کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں کہا جاسکتا ہو کہ وہ بھی ضرور اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ سرور گو کہ لکھنؤ کے عاشقوں میں ہیں اور لکھنؤ ہی میں رہے مگر پھر بھی ان کے اشعار سے دلی کا اتباع معلوم ہوتا ہو کیونکہ لکھنؤ کے تصنع اور مبالغہ سے وہ بری ہیں۔

غالب بحیثیت نثار | عام لوگ غالب سے صرف بحیثیت ایک شاعر کے روشناس ہیں اُن کی نثاری کی حیثیت عام نظروں سے پوشیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اردو دونوں کے بے مثل نثار بھی اُسی طرح ہیں جس طرح کہ بے نظیر و بے عدیل شاعر ہیں۔ اُن کی نثر اردو کی تصانیف زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے یعنی لطائف غیبی تیغ تیز اور نامۂ غالب[1] جو سب برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ان سب میں اُن کے وہ خطوط جو اُردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی کے نام سے مشہور ہیں اور نیز وہ تقریظیں جو چند کتابوں پر لکھی ہیں نثر اُردو کا بہترین نمونہ اور

---

[1] نامۂ غالب کو آبِ حیات میں مرزا کی تصانیف فارسی میں رکھا ہے۔

اُن کے خاص رنگ کا آئینہ ہیں۔

اردوئے معلی اور عود ہندی ۱۸۵۰ء تک مرزا فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے جیساکہ اُن خطوط سے پایا جاتا ہی جو پنج آہنگ میں چھپے ہیں اور نیز بعض جگہ خطوط اُردو میں بھی اس کا ذکر ہی۔ اس کے بعد انھوں نے اُردو میں خطوط لکھنا شروع کیے۔ ان کا رنگ بالکل مخصوص ہے اور انھیں پر نثر اُردو کی ایک خاص طرز کی بنیاد قائم ہوئی۔ مگر جہاں تک خیال ہے کوئی شخص اُن کی پوری تقلید اور نقل میں کامیاب نہیں ہوا یوں تو بہت سی انشا اور رقعات کی کتابیں موجود ہیں اکثر مشہور لوگوں کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا کا رنگ سب سے علیحدہ ہی۔ اس میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع خشونت اور خشکی مطلق نہیں۔ عبارت کی روانی اور سلاست سے علیحدہ ہوتا ہی کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور مضامین کی کثرت پتہ دیتی ہی کہ ایک دریائے مضامین اُمڈا چلا آتا ہی۔ یہ ایک خاص صفت ہے کہ ہر چند عبارت حد درجے کی بے تکلف اور روزمرہ ہے مگر ابتذال اور سوقیت اس میں مطلق نہیں بلکہ اس میں ایک ادبی شان ہی۔ لطف ہر فقرے سے عیاں اور ظرافت ہر جملے کی تہ میں پنہاں ہی۔ مرزا اکثر ایسے خیالات کا جن سے ان کا مکتوب الیہ موافق نہ بھی ہو اس عبارت اور صفائی سے اظہار کرتے ہیں جیسے کہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کی تحریر کا زور اور اُن کا انداز بیان اُس کی زبان بند کر دے گا بلکہ اُس کو اُن کے دام محبت میں اسیر کرلے گا۔ ان کی تحریر میں بالکل باتوں کا مزہ آتا ہی۔ اور بعض خطوط انھوں نے فی الواقع مکالمہ کی صورت میں لکھے ہیں۔ کسی میں مکتوب الیہ کو غائب فرض کر لیا ہے جس سے معلوم ہو کہ مکتوب الیہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہی۔ قلم کی ایک جنبش سے وہ ایسی سحر آفرینی کر دیتے ہیں کہ دل مزے اُٹھانے لگتا ہے مرزا نے اپنے خطوط میں علاوہ ایک طرز خاص اختیار کرنے کے یہ جدت بھی کی ہے کہ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ اور بہت سی اور باتیں جو عموماً خطوط میں لکھی جاتی ہیں مگر درحقیقت فضول اور بیکار ہیں سب چھوڑ دیں وہ پنج آہنگ میں لکھتے ہیں کہ ”خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہی کہ جب خط لکھنے کے لیے قلم و کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اُس کی حالت کے موافق ہوتا ہی پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں القاب آداب کا پرانا طریقہ اور شکر و شکوہ و شادی و غم کا قدیم رویہ میں نے بالکل

اٹھا دیا۔ مثلاً یہاں چند نمونے اُسی شان کے لکھے جاتے ہیں:۔ "اہاہاہا میرا پیارا مہدی آیا آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے دار السرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے"۔ "آؤ میاں سید زادہ آزادہ دلّی کے عاشق دلدادہ ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے ....." "برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعاء حیات وصحت کے معلوم ہو بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا تپ کو کیوں چڑھنے دیا۔ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا کہ تم مانع نہ آئے ....." "میری جان تو کہہ رہا ہے جیسے سیانا سودیوانا صبر وتسلیم توکل ورضا شیوہ صوفیہ کا ہے مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا سید صاحب اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دیا اور میرن صاحب کو اپنا ہمزبان کر لیا"

یہاں ہم مرزا کا ایک خط جو میر مہدی کے نام ہے بہ تمام وکمال نقل کرتے ہیں تاکہ مرزا کی وہ تمام خصوصیات تحریر جن سے اُن کی نثر بھی مثل نظم کے معجز نما معلوم ہوتی ہے بخوبی سمجھ میں آسکیں مثلاً خط سے القاب آداب کا بالکل غائب ہونا اور بجائے اس کے ایک فرضی مکالمہ سے خط کا شروع کر دیا جانا۔ عبارت کی سادگی شوخی اور بے تکلفی۔ مذاق کے پیرایہ میں کچھ دوستانہ نصیحتیں بھی کرنا۔ جدید رنگ زمانہ یعنی جمہوریت پسندی کے برخلاف پرائیوٹ خط میں بھی "ملکہ انگلستان" کے پہلے لفظ "جناب" لکھنا جس سے اُن کی حد درجے کی قدامت پسندی اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے ابتدائی چند سطور کو جن سے خط شروع ہوتا ہے ہم مکالمے کی صورت میں لکھے دیتے ہیں۔ غ سے غالب اور م سے میرن صاحب سمجھنا چاہیئے۔

خط بنام میر مہدی

غ ۔ اے جناب میرن صاحب السلام علیکم

م ۔ حضرت آداب۔

غ ۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو۔

م ۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں بخار جاتا رہا ہے صرف تپش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہوں آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔

غ ۔ نہیں میرن صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے

م ۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے ۔

غ ۔ میاں آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ۔

م ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے ۔

غ ۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میر مہدی کو خط لکھوں ۔

م ۔ کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا اب جو میں وہاں نہیں ہوں نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے ۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا ۔

غ ۔ میاں بیٹھو ہوش کی خبر لو تمھارے جانے سے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُس کو خط نہیں لکھا (اس کے بعد مسلسل خط شروع ہوتا ہے)

لا حول ولا قوۃ سنو میر مہدی ، صاحب میرا کچھ گناہ نہیں ، میرے پہلے خط کا جواب لکھو تپ تو رفع ہوگئی بخش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو ، پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو ۔ یہ خدی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا ، حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے ۔ دیکھو بیٹھے ہیں کیا جانوں حکیم میر اشرف میں اور ان میں کچھ کونسل ہو رہی ہے پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے اگر چل نکلیں اور پہونچ جائیں تو اُن سے پوچھیو کہ جناب ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیجیو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ دفتر را گاؤ خورد اس کے معنی کیا ہیں ۔ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک نہ بتائیں ۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینھ آیا ۔ اب مینھ برس رہا ہے ۔ میں خط لکھ چکا ہوں سرنامہ لکھ کر چھوڑ دوں گا ۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا ۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہونچے اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے ۔ کہو وہاں کے لوگ تمھیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں ۔ میر نصیر الدین کو دعا ۔

اس کاٹ چھانٹ سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ طرز تحریر کی درستی ہوگئی اور یہ ایک نہایت عمدہ

جدت کی مثال قائم ہوگئی جس سے اردو خطوط نویسی پرانے تکلف، تصنع اور بے موقع اظہار علمیت سے آزاد ہو کر نہایت شیریں اور دلچسپ بن گئی۔ ہر چند کہ یہ اختراع ان کے معاصرین کو پسند نہ آیا مگر جوں جوں زمانہ بدلتا گیا اور وقت گزرتا گیا اب لوگوں کو اس کی اہمیت کا ضرور احساس ہوا اور ہر طرف اس کے متبعین پیدا ہو گئے مولانا حالی۔ سر سید۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے علاوہ دیگر ارباب قلم مثلاً امیر مینائی اور وغیرہ نے بھی سادگی عبارت کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر نثریں لکھیں مگر حق یہ ہے کہ مرزا کی سادگی و دلکشی شوخی و ظرافت جذبات نگاری و اظہار مافی الضمیر میں کوئی ان کا مدمقابل نہ ہوئے گا۔

ان رقعات کی ایک بین خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ان کے حالات زندگی کے مصفیٰ اور مجلیٰ آئینہ ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یہ زحمت گوارا کرے کہ ان کے خطوط کو تاریخ تحریر کی ترتیب سے جمع کرے اور ان کے وہ حصے جو مرزا کے حالات زندگی کے متعلق ہیں علحدہ کرتا جائے تو مرزا کی ایک مختصر خود نوشتہ سوانح عمری اُن سے مرتب ہو جائے گی۔ یہ خطوط اُن کی زندگی اور جزئیات زندگی کی تصویریں ہیں اُن سے حیات، احباب اور معاصرین سے تعلقات کے متعلق اُن کے نظریے اور ہمعصر اور قدیم شعرا کے متعلق اُن کے خیالات سب بخوبی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ بعض کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی غرض اصلی مکتوب الیہ کے دل کو خوش کرنا اور اُس کا غم غلط کرنا ہے۔ اُن مذاق ظرافت بھی سب سے نرالا ہے۔ اردو نظم میں تو اس کا جواب ہی نہیں۔ اہل یورپ میں بھی اس قسم کی لطیف ظرافت بھی مفقود ہے۔ فرنچ شاعر والٹیر اور انگریزی نثار ڈین سویفٹ اپنے اپنے طرز میں ایک خاص رنگ ظرافت رکھتے ہیں مگر مرزا اُن سب سے علحدہ ہیں والٹیر کی طرح ان میں نقالی اور سویفٹ کی طرح ان میں تیزی اور دل آزاری نہیں ہے۔ اُن کی ظرافت کی لطافت اور نزاکت کا پرتو اید یسن میں کچھ کچھ پایا جاتا ہے۔ مرزا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے نثر اردو کو خشکی اور بدمزگی کے الزام سے بچا لیا۔

مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفیٰ اور مسجع عبارت

مرزا ہر چند خطوط میں سادگی اور سلاست عبارت کے دلدادہ تھے مگر رواج زمانہ کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں اسی پرانے انداز میں لکھتے تھے۔ اس کی وجہ مولانا حالی کی زبان سے سننا چاہیے وہ کہتے ہیں "مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیے جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی

فرمائش کرنے والے تھے وہ بغیر ان تکلفات باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔" یہاں اُن کی دو تقریظوں کی کچھ عبارت بطور نمونہ دی جاتی ہے تاکہ اس رنگ میں بھی اُن کا انداز تحریر بخوبی معلوم ہو سکے۔ (۱) مرزا رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور کی تقریظ: "سبحان اللہ خدا کی کیا نظر فریب صنعتیں ہیں تعالی اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں۔ یہ جو حدائق العشاق کا فارسی زبان سے عبارت اُردو میں نگارش پاتا ہے ارم کا بیں دنیا سے اُٹھ کر بہارستان قدس کا ایک باغ بن جاتا ہے۔ وہاں حضرت رضوان ارم کے نخل بند و آبیار ہوئے یہاں مرزا رجب علی بیگ سرور اور حدائق العشاق کے صحیفہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر یہ ہیچمدان جو موسوم بہ اسد اللہ خاں اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے خدائے جہاں آفریں سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہاں اے صاحبان فہم و ادراک سرور سحر بیان کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گران بہا پیرایہ ہے۔ مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان اور شوخی تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹا دیا یہ وہ تحریر ہے......"

(۲) مفتی میر لعل کی کتاب "سراج المعرفت" کی تقریظ: "حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نامہ نہم بہ پیچیدہ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے لا مؤثر فی الوجود الا اللہ اور خط میں مندرج ہے کہ لا موجود الا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نامہ آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی خامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں۔ آثاری افعالی صفاتی ذاتی انبیائے پیشین صلوات اللہ علی نبینا و علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری کو اٹھا دیں اور حقیقت بے رنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھائیں اب گنجینہ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے......"

کتب و رسائل اسلامی سے اُردو کو تقویت | ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہیں رکھتی تھی مگر اس سے بلاشبہ نثر اُردو کو بہت فائدہ پہونچا اور اس کی تقویت کا باعث ہوئی مولوی سید احمد شہید بریلوی اور اُن کے

بزرگ اُستادوں یعنی مشہور و معروف شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے زمانے میں اشاعت مذہب وہابیت کی صورت میں رونما ہوئی جس کی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسائل عوام الناس کے فائدے کے واسطے صاف اور سہل زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہ خیال برابر زور پکڑتا اور قوت حاصل کرتا گیا اور گو اصل تحریک جو مولوی صاحب موصوف نے اٹھائی تھی ان کی وفات کے بعد امتداد زمانہ سے دب گئی تھی مگر مشہور راہبر قوم سر سید احمد خاں کے تمام تعلیمی معاشرتی مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی وہی روح رواں تھی[۵]۔ سید صاحب اور اُن کے رفقائے کار کے جدید اصولوں کی اشاعت نے گو ملک میں اس وقت بہت بےچینی اور مخالفت پیدا کر دی تھی اور اختلافات کی آندھی سے ملک کی فضا گرد آلود ہو گئی تھی مگر جس قدر کتب اور رسائل ان مسائل کی موافقت و مخالفت میں لکھے گئے ہر چند کہ وہ مذہبی رنگ کے تھے مگر چونکہ وہ سب صاف اور سلیس زبان میں ہوتے تھے اس وجہ سے زبان کو اُن سے یقیناً بہت کچھ تقویت اور مدد پہونچی۔

مولوی سید احمد شہیدؒ ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے اور شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادر صاحب ایسے بزرگوں سے علوم دینیہ کی تکمیل کی جنھوں نے بعد کو تو مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے لہذا ان کی تقریریں اور وعظ سن سن کر لوگ بکثرت ان کے مرید ہو گئے تھے۔ اور اپنے اصُول کی تبلیغ پہلے دلّی میں مکمل کر کے ۱۸۲۰ء میں کلکتہ گئے اور وہاں سے ۱۸۲۲ء میں حج بیت اللہ کی نیت سے روانہ ہو گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کر کے قسطنطنیہ چلے گئے۔ اور چھ برس تک ٹرکی کی سیر سیاحت اور نیز اپنے ہمخیالوں کی جماعت پیدا کرتے رہے۔ جب دلّی واپس آئے اور یہاں کے مسلمانوں کے عقائد کا دیگر ممالک کے لوگوں سے مقابلہ کیا تو نسبتاً زمین و آسمان کا فرق پایا۔ اور اسی سے اُن کے دل میں اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ آدمی پُر جوش تھے لہذا اشاعت دین کے متعلق اُن کے جوش کی کوئی انتہا باقی نہیں رہی تھی۔

۵؎ مصنف صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تحریک مذہبی بصورت اشاعت وہابیت مولوی سید احمد شہید کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جو تربیں اور تاویلیں مذہب میں سر سید مرحوم نے پیش کیں یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں اس وجہ سے کہ وہابیوں کے اصول کے مطابق جملہ احکام شریعت بہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ بلا کسی توجیہ اور تاویل کے عمل واجب ہے اور سر سید مرحوم اپنے معتقدات اور اصولوں کے ثابت کرنے میں دلائل عقلی اور تاویلات سے بہت کچھ کام لینا چاہتے تھے جو عقائد وہابیہ کے بالکل منافی ہے۔

چنانچہ پہلے سکھوں سے انھوں نے جہاد کا اعلان کیا اور ۱۸۲۶ء میں مولوی اسماعیل کو ساتھ لے کر پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ اور اکثر امرا اور مشاہیر نے جو ان کے معتقد اور ہم خیال تھے اس مذہبی کام کے واسطے کافی روپیہ سے اُن کی مدد کی تھی۔ ۱۸۲۹ء میں اپنے اس مشن میں ان کو اتنی کامیابی ہوگئی تھی کہ پورا پشاور اُن کے قبضے میں آگیا تھا۔ لیکن بعد کو اُن کے اصولوں کی سختی دیکھ کر افغانوں نے جنھوں نے اُن کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اُن سے بیوفائی کی۔ یہ حالت دیکھ کر وہ دریائے اٹک کے اس پار پہاڑوں میں جا چھپے جہاں ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے ایک دستہ سے جس کا سردار شیر سنگھ تھا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔

شاہ عبد العزیز صاحب نے قرآن شریف کی تفسیر موسوم بہ تفسیر عزیزی فارسی میں لکھی جس کا اب ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے۔ اور اُن کے بھائی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا جو ۱۸۰۳ء میں ختم ہوا اور ایک شخص سید عبد اللہ نامی نے جو مولوی سید احمد مذکور کے مرید تھے ۱۸۲۶ء میں بمقام ہگلی اس کو چھپوایا۔ اسی طرح مولوی سید احمد صاحب کی کتاب تنبیہ الغافلین جو اصل میں زبان فارسی میں تھی اس کا بھی اُردو ترجمہ انھیں مولوی عبد اللہ نے ۱۸۳۰ء میں ہگلی سے شائع کیا۔ مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف۔ مثلاً ترغیب جہاد۔ ہدایۃ المومنین نصیحۃ المومنین۔ موضح الکبائر والبدعات۔ مائۃ مسائل وغیرہ یہ سب اسی زمانے کی کتابیں ہیں جو اصل میں اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھیں مگر جن سے زبان اردو کو بھی ضرور تقویت پہونچی۔

چھاپہ کی ابتدا

منجملہ اور اسباب کے چھاپے نے بھی اشاعت و ترقی زبان میں بہت بڑی مدد دی اور قدیم حالت میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک چھاپہ خانہ کھل گیا تھا جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیوں کی تصانیف خود ڈاکٹر گلکرسٹ کے اہتمام میں چھپ کر تیار ہوتی تھیں۔ مگر ان کی تیاری میں اس قدر روپیہ خرچ ہوتا تھا کہ آخر کار یہ مطبع بند کر دینا پڑا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی بعض کتابیں بھی یہاں نہ چھپ سکیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں جو ٹائپ کے حروف مروج تھے وہ بھی نہایت بدنما اور بھدے تھے۔ اسی زمانے میں سیرام پور واقع بنگال کے پادریوں نے

بھی ایک چھاپہ خانہ کھولا تھا جس میں مختلف ہندستانی زبانوں کی کتابیں چھپتی تھیں ۱۸۱۲ء میں اس چھاپہ خانہ میں آگ لگ گئی اور اکثر کتابیں جل کر خاک ہوگئیں۔ ۱۸۳۷ء میں ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ دلی میں قائم ہوا جس نے اشاعت کتب کو بہت آسان کر دیا۔ اس میں پُرانی کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں کے تراجم یا اور کتابیں اور رسائل مختلف مضامین پر طبع ہوتے تھے اور غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں بھی بہت صرف سے اور تکلف کے ساتھ ایک مطبع ٹائپ کا کھولا گیا تھا. جس میں سب سے پہلے ہفت قلزم چھپی تھی دوسری کتابیں جو اس مطبع سے نکلیں حسب ذیل ہیں مناقب الحیدریہ بزبان عربی ۱۸۱۹ء میں۔ محامد حیدری فارسی میں ۱۸۲۲ء میں (یہ دونوں کتابیں غازی الدین حیدر کی تعریف میں ہیں) گلدستۂ محبت جس میں نواب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال فارسی میں ہے۔ پنج سورہ بخط طغرا۔ تاج اللغات جو ایک عربی کی لغت زبان فارسی میں ہے۔ ۱۸۳۱ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر جنھوں نے ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ کان پور میں کھولا تھا نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ آئے اور یہاں بھی ایک مطبع جاری کیا۔ ایک اور مشہور کتاب جو اس زمانے میں لکھنؤ میں چھپی وہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی جس کو لارڈ بروہم نے سائنس کے فوائد اور اعمال پر تصنیف کیا تھا۔ اس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر معروف بہ میر محمد حسینی لکھنوی نے اسکول بک سوسائٹی کلکتہ کی فرمائش سے کیا اور مطبع سلطانی میں ۱۸۴۳ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اُردو میں ہے۔ سب سے پہلی کتاب جو لکھنؤ میں لیتھو میں چھپی شرح الفیہ تھی۔ ۱۸۴۸ء میں تقریباً بارہ چھاپہ خانے لیتھو کے لکھنؤ میں موجود تھے جن میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہیں۔ ۱۸۴۹ء میں منشی کمال الدین حیدر مذکور نے جو رصد خانہ شاہی کے میر منشی تھے بادشاہ کی خوشنودی مزاج کے واسطے خاندان شاہی کی تاریخ لکھنا شروع کی مگر کچھ باتیں بادشاہ کو پسند نہ آئیں جس کی وجہ سے رصد خانہ توڑ دیا گیا اور کتاب کی طباعت بھی روک دی گئی اور بہت سے اہل مطبع کانپور چلے گئے۔ مطابع کی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ اس عہد کا یہ ہے کہ لکھنؤ میں منشی نولکشور صاحب نے اپنا مشہور مطبع جاری کیا جس کی بدولت پُرانی پُرانی فارسی و عربی و نیز سنسکرت و ہندی کی وہ کتابیں چھپیں جو کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھیں اور اگر شائع نہ ہوتیں تو معدوم

ہوجاتیں۔ اس مطبع نے علم کے محدود دائرے کو وسیع کردیا اور اس کے فوائد ملک کے تمام طبقوں کو یکساں طور پر پہونچائے تعلیم و تعلم کی ارزانی ہوگئی۔ اس میں حدیث و تفسیر، قرآن شریف باترجمہ فقہ و اصول وغیرہ جملہ علوم اہل اسلام و نیز وید پران بیدک وغیرہ علوم اہل ہنود یکساں طور پر نہایت فراخدلی سے شائع کئے گئے قرآن شریف کے مترجم چھپنے سے لوگوں کو اس کے مطالب سے آگاہی ہوئی اور اس سے وہی فائدہ مسلمانوں کو ہوا جو بائبل کے ترجمے سے مسیحیوں کو پہونچا تھا۔

رسائل وجرائد واخبارات | طباعت کی آسانیوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ رسائل وجرائد واخبارات زبان اردو میں بہ کثرت جاری ہوئے جس سے پبلک کے معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور اُن کو دنیا بھر کی خبریں بے تکلف معلوم ہونے لگیں۔ ہندوستانی اخبارات سے جو لیتھو میں چھپنے لگے پبلک کے لیے تمدنی و اقتصادی معلومات کا ایک دروازہ کھُل گیا اور ترقیوں کی راہیں فراخ ہوگئیں۔ اور مضمون نویسوں کو علاوہ توسیع زبان کے یہ موقع بھی ملا کہ وہ اپنی زبان کو یورپی مضامین اور طرز کے موافق ڈھالیں۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اردو سرکاری زبان قرار پائی جس سے اُس کا نہ صرف مرتبہ بڑھا بلکہ عربی و فارسی کے وہ سب الفاظ اور مصطلحات جو اب تک اس زبان میں رائج تھے اُردو زبان میں منتقل ہوگئے اور رواج پاگئے۔ مغربی تمدن کے اثر نے بھی زبان کو طرح طرح کے فوائد سے مالا مال کیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فارسی کی تقلید میں جو عبارت اور لفظوں پر زور دیا جاتا تھا وہ طریقہ متروک ہوکر زبان صاف اور سادہ ہوئی اور بجائے الفاظ کے نفس مطلب اور مضمون پر زور دیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ درسی کتابیں جو تعلیمی ضرورت سے انگریزی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں ان کا ترجمہ سوائے صاف اور سادہ زبان کے پیچیدہ عبارت میں ہو بھی نہیں سکتا تھا لہذا صاف اور سلیس عبارت میں ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ کلکتہ اور لاہور میں جو انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے گئے وہ سب اسی قبیل کے تھے۔ اور اب اردو فارسی سے بے نیاز ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی۔ اس اصلاح کو سرسید ایسے قابل بزرگ کے مساعی جمیلہ نے بہت تقویت پہونچائی۔ یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کی ایک بزرگ ہستی اور مسلمانوں کے ایک رہبر اور مصلح اعظم تھے جن کا کچھ مختصر حال آگے لکھا جاتا ہے۔

سر سید احمد خاں ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء جواد الدولہ عارف جنگ، سر سید احمد خاں بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ہندوستان کے مشہور لیڈر اور ایک فصیح البیان اور جلیل القدر مصنف فلسفی ریفارمر اور مدبر تھے۔

اُن کی قابلیت ان کی ہر دلعزیزی اور اُن کی مقناطیسی قوت کے اثر سے بہت سے قابل قابل اہل علم و فضل اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے جن کے ادبی کارناموں سے نہ صرف اُردو ادب مالا مال ہوا بلکہ وہ ایک طرز خاص کے موجد ہوئے اور ہندستان کے مسلمانوں کے طرز زندگی اور معاشرت پر اُن کی مساعی جمیلہ کا بہت گہرا اثر پڑا۔ چونکہ سید صاحب کی زندگی مختلف شعبوں اور مشاغل پر منقسم ہے لہٰذا اُن سب سے قطع نظر کر کے ہم یہاں کا ذکر صرف ایک ادیب اور قومی لیڈر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

سرسید مرحوم دلّی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان علو مرتبت اور اعزاز کے لحاظ سے ایک مشہور خاندان تھا۔ ان کے آباو اجداد جو ابتداً عرب کے رہنے والے تھے وامخان آئے اور وہاں کچھ دنوں قیام کر کے ہمدان اور ہرات پہونچے اُن کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں ہندستان آئے اور یہاں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوئے۔ عالمگیر ثانی نے سید صاحب کے دادا جواد الدولہ کا خطاب دیا تھا جو حُسن اتفاق سے خود سید صاحب کو بھی عنایت ہوا۔ سید صاحب کے والد میر تقی ایسے قانع بزرگ تھے کہ کہا جاتا ہے جب اکبر شاہ ثانی نے اُن کو عہدہ وزارت پر ممتاز کرنا چاہا تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سید صاحب کی والدہ نے جن کا نام عزیز النسا بیگم تھا۔ جو ایک روشن دل خاتون تھیں، سید صاحب کی پرورش کی، اور ان کو زمانے کی ضروریات کے موافق تعلیم دلائی۔ سید صاحب نے خوش نصیبی سے ایسا زمانہ پایا تھا جس میں غالب صہبائی۔ آزردہ شیفتہ۔ مومن وغیرہ کی طرح کے زندہ دل ارباب کمال موجود تھے مرزا غالب اور سید صاحب میں اس قدر ارتباط تھا کہ سید صاحب اُن کو چچا کہتے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں سید صاحب دلّی میں بعہدہ سررشتہ داری مقرر ہوئے اور یہ اُن کی پہلی ملازمت تھی ۱۸۳۹ء میں نائب میر منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہوئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دلّی کے صدر امین رہے اور اسی زمانے میں اپنی مشہور و معروف کتاب آثار الصنادید لکھی۔ جس میں دلّی کے مشہور مقامات اور آثار قدیمہ اور نیز اپنے زمانہ کے دلّی کے تمام کاملین اور فقرا، علما اور شعرا وغیرہ کا ذکر کیا ہے

جوادالدولہ عارف جنگ سر سید احمد خان بہادر ایل-ایل-ڈی

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

اس کتاب کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور فرنچ میں گارسن ڈ تاسی نے ترجمہ کیا۔ جو سنہ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ سید صاحب نے سنہ ۱۸۴۲ء میں ایک کتاب موسوم بہ "جلاء القلوب" جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا حال ہے۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں "تحفہ حسن" سنہ ۱۸۴۵ء میں "تحصیل فی جرح السائل" (ترجمہ معیار العقول) سنہ ۱۸۴۶ء میں "فوائد الافکار" اور "قول متین" سنہ ۱۸۴۹ء میں کلمۃ الحق سنہ ۱۸۵۰ء میں راہ سنت سنہ ۱۸۵۲ء میں سلسلہ ملوک ہند جس میں دلی کے بادشاہوں کے مختصر حالات راجہ جدھشٹر کے وقت سے لکھے ہیں۔ اور سنہ ۱۸۵۳ء میں ترجمہ کیمیائے سعادت تصنیف کیں سنہ ۱۸۵۵ء میں سید صاحب بجنور منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے تاریخ بجنور لکھی۔ آئین اکبری کی تصحیح و تحشی کا فخر بھی سید صاحب کو حاصل ہے۔ مسٹر بلاکمین جنھوں نے آئین اکبری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ سید صاحب کی کاوش کے معترف اور اُن کی تصحیح کے معترف ہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی سید صاحب نے مختلف طریقوں سے امداد کی۔ اور جب ان کو ایک علاقہ اُن کی خدمات کے صلے میں پیش کیا گیا تو انھوں نے اُس کے لینے سے انکار کر دیا۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں اُنھوں نے اپنا مشہور پمفلٹ "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کیا جو سنہ ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب "وفادار مسلمانان ہند" کے نام سے شائع کی۔ برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی ایشیاٹک سوسائٹی کی فرمائش سے تصحیح کی۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں ان کی تفسیر بائبل موسوم بہ "تبیین الکلام" شائع ہوئی جس کو قدیم روش کے مسلمانوں نے ناپسند کیا اور اس پر نکتہ چینی کی مگر اہل یورپ نے اس کی بڑی قدر کی۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں سید صاحب بدل کر غازی پور آئے جہاں سائنٹیفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس سوسائٹی کے قیام کی غرض یہ تھی کہ مشہور اور مستند انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اہل اسلام یورپ کے خیالات اور وہاں کے تمدن سے واقف ہوں۔ ڈیوک آف آرگائیل جو اس زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ ہند تھے اس سوسائٹی کے مربی (پیٹرن) اور لفٹنٹ گورنران پنجاب و بنگال اس کے وائس پیٹرن بنائے گئے ایک زمانے میں یہ سوسائٹی بہت مشہور و مقبول تھی اور اس کے ممبروں نے نہایت عمدہ عمدہ رسالے مختلف مضامین مثلاً تاریخ جیوگرفی زراعت و فلاحت اقتصادیات پر لکھے۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں وہ علی گڑھ آئے

اور اُن کے ساتھ سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہوکر آگئی ۱۸۶۱ء میں انھوں نے ایک انگریزی اسکول مراد آباد
میں اور ۱۸۶۴ء میں اسی طرح کا ایک اسکول غازی پور میں قائم کیا تھا اور مختلف مقامات میں انگریزی تعلیم
کے فوائد اور برکتوں پر لکچر دیے تھے ۱۸۶۶ء میں انھوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام برٹش انڈین ایسوسی ایشن
تھا اور نیز اپنی سائنٹیفک سوسائٹی کا ایک ماہوار رسالہ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے نکالا جس
میں وہ خود بھی مختلف قسم کے مضامین پر کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں کے بھی اچھے اچھے مضامین
اس میں ترجمہ کرا کے شائع کئے جاتے تھے ۱۸۶۶ء میں ان کا بنارس کو تبادلہ ہوگیا۔ مگر اُن کے ادبی
اور تعلیمی کاموں میں اس سے کسی قسم کا حرج واقع نہیں ہوا۔ اسی عرصہ میں انھوں نے ایک
ہندستانی یونیورسٹی قائم کرنے کی بھی کوشش کی تھی اور گورنر جنرل کو اس مضمون کا ایک میموریل
بھی بھیجا تھا اور اُن کے اس خیال کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر کی گئی تھی ۱۸۶۶ء میں رسالہ
"احکام طعام یا اہل کتاب" تصنیف ہوا جس سے مذہبی لوگوں میں ایک قسم کی شورش پیدا ہوگئی اور
سید صاحب ان باتوں کی وجہ سے بہت بدنام ہوگئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے مسٹر محمود کے ساتھ (جو بعد
کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہوگئے تھے) ولایت گئے اور اہل یورپ کے طرز معاشرت اور اخلاق و عادات
اور نیز ان کے سیاسی اور تعلیمی انتظامات کا مطالعہ خوب کیا۔ اسی زمانے میں سر ولیم میور کی مشہور کتاب
"لائف آف محمدؐ" (سوانحعمری آنحضرت صلعم) کا ایک دلیرانہ جواب انھوں نے لکھا اور نیز مسلمانوں کے
واسطے ایک رہائشی کالج ولایت کے آکسفورڈ اور کیمبرج کالجوں کے انداز پر ہندوستان میں کھولنے
کا خیال پیدا ہوا۔ ولایت میں اُن کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس
آئے۔ یہاں آکر انھوں نے اپنا مشہور و معروف ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جس کے مطالعہ
سے مسلمانانِ ہند کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا اس سے مسلمانوں کو وہی فوائد پہونچے
جو اڈیسن اور اسٹیل کے رسائل "ٹیٹلر" اور "اسپکٹیٹر" سے اہل انگلستان کو حاصل ہوئے تھے اس کے
جاری کرنے کی یہ غرض تھی کہ مُسلمانوں کے خیالات علی الخصوص مذہبی خیالات میں وسعت اور ترقی
پیدا ہو اور وہ مغربی علوم کی طرف مائل ہوں جس سے اُن کے تمام معاشرتی اور تمدنی معاملات میں

ضرور اصلاح ہو جائے گی۔ اس میں مختلف قسم کے مضامین مذہب معاشرت اور تعلیم پر لکھے جاتے تھے اور لکھنے والے خود سرسید نواب محسن الملک نواب وقار الملک اور مولوی چراغ علی ایسے بزرگ تھے جو اپنے خیالات کو نہایت صفائی کے ساتھ آزادی سے ظاہر کر دیتے تھے۔ اس رسالہ کی یہ بڑی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے دل سے یہ غلط خیال کہ اسلام علوم دنیاوی اور اصلاح کا دشمن یا مخالف ہے نکل جائے اور اُن کو یہ معلوم ہو جائے کہ کن اسباب سے اس قسم کے خیالات اُن کے پیش رووں کے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نقصان پہونچانے والے اور تکلیف دہ رسوم و قیود کو ترک کریں وہ اپنے افلاس و ادبار کا احساس کریں اور کٹھ ملّاؤں کے پنجے سے نجات پا جائیں۔ اسی زمانے میں ایک تفسیر قرآن بھی سید صاحب نے تصنیف فرمائی جس کی چھ جلدیں شائع ہوئیں۔ مگر یہ نصف قرآن تک پہونچی۔ پہلی جلد ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوئی تھی اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی باتوں پر جن کا حوالہ قرآن شریف میں ہے بائبل کے قصص سے روشنی ڈالی گئی ہے جہاد۔ دوزخ و بہشت۔ معراج وغیرہ پر جو دیگر اقوام نے اعتراضات اور نکتہ چینیاں کی ہیں اُن کا شافی جواب دیا گیا ہے۔ بعض تاویلات اور ضعیف و غیر مستند احادیث سے احتراز کی ہدایت کی گئی ہے اور جو شکوک کہ علوم مادّی کے پڑھنے سے قرآن کی الہامی کتاب ہونے میں پیدا ہوتے ہیں وہ رفع کئے گئے ہیں مگر ان دونوں چیزوں سے قدیم روش کے مذہبی پیرو سید صاحب کے سخت مخالف ہو گئے ان کو کافر، ملحد، نیچری کے خطابات دیے گئے۔ اکثر اخبارات اور رسائل صرف اسی غرض سے جاری کئے گئے کہ سید صاحب اور اُن کے جدید خیالات کا خاکہ اُڑایا جائے اُردو کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ میں اُن کے کارٹون نکلے اور تمسخر آمیز مضامین نظم و نثر ان کے نسبت لکھے گئے مگر سید صاحب اپنے مشاغل میں سرگرم رہے اور اس مخالفت کا اُن پر مطلق اثر نہ پڑا۔ آخر عمر میں اُن کو سوائے اپنے محبوب کالج کی ترقی کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ ۱۸۷۶ء میں وہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور بقیہ عمر تعلیمی اور سیاسی مشاغل میں گزار دی۔ بالآخر ۱۸۹۸ء میں ایک طویل عمر پا کر اور ایک کامیاب زندگی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تمام ہندستان کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

سید صاحب کا طرز تحریر یقیناً سید صاحب اُردو جرائد نگاروں میں ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کا قلم

بہت زبردست اور اُن کا تبحر علمی بہت اعلیٰ تھا۔ اُن کا طرز تحریر زوردار مگر صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں ہو۔ کچھ غلطیاں بھی اس میں نکلیں گی مگر سید صاحب قواعد صرف و نحو کی پابندی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے وہ مقررہ قواعد انشا پردازی سے بالکل بے نیاز تھے مگر یہی چیز اُن کی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہونچانے کے بجائے اُس میں اور اضافہ کرتی تھی۔ اُن کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید میں اردو میں بھی برتی جاتی تھی ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں "مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو" پر سید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال اُن کی تمام تحریروں کا ہے۔ ان کی عبارت اُن کے ادائے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوتی اُن کو زبان پر عبور حاصل ہو نثر اُردو لکھنے میں وہ ایسے مشاق تھے کہ ان کے پیشتر کوئی اُن کا ہم پایہ نہیں تھا۔ مولانا حالی تو اُن کو نثر اُردو کا مورثِ اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب میں یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں ادا کر سکتے تھے اور نیز اپنے مضامین کے حُسن و قبح کو بھی نہایت زوردار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے مگر سید صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہی اس کا نقش اول غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔

سید صاحب کے رفقائے کار دنیا کے تمام بڑے لوگوں کو سب سے بڑی پہچان یہی ہو کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں بھی اپنا ہی ایسا جوش و خروش اور صداقت و راست بازی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال سید صاحب کے حواریوں کا تھا جن کی زبردست جماعت نے اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ہندستان میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ خاص خاص لوگ جو اس جماعت میں شامل ہونے کا فخر رکھتے تھے یہ ہیں :-

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد اور مولوی زین العابدین۔ ان میں سے اکثر اصحاب کے کچھ مختصر حالات اس کتاب میں

قلمبند کئے گئے ہیں حالی قومی شاعر تھے۔ مولوی نذیر احمد اپنے نصیحت آمیز افسانوں اور ناولوں کے لیے مشہور ہیں۔ شبلی اور ذکاء اللہ فن نقد اور تاریخ کے امام تھے۔ مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے بیش بہا اور گراں قدر مضامین نے ادب اردو کو ہمیشہ کے لیے ممنون احسان کیا ان تمام بزرگوں کی مساعی جمیلہ جو مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے وقف تھیں نہایت بارآور اور کامیاب ثابت ہوئیں اور ان کی تصانیف سے زبان اردو میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

محسن الملک نواب سید مہدی علی خاں بہادر ۱۸۳۷ء میں اٹاوہ میں پیدا ہوئے معمولی درسیات سے فراغت کرکے بعہد ایسٹ انڈیا کمپنی دس روپیہ ماہوار پر کلارک مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے ۱۸۵۷ء میں اہلمد پھر سررشتہ دار اور ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار سرکاری مقرر ہوگئے اپنے خدمات کی انجام دہی میں انھوں نے انتہا درجہ کی قابلیت اور کارگزاری کا ثبوت دیا۔ اور اسی اثنار میں دو کتابیں اردو میں ایک قانون مال اور دوسری قانون فوجداری کے متعلق تصنیف کیں جن کو اس زمانے میں شہرت ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کا مقابلہ کا امتحان کامیابی سے دے کر ۱۸۶۷ء میں مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی قابلیت کی شہرت دور دور پہونچی تھی۔ چنانچہ سر سالار جنگ اول نے ان کو حیدرآباد طلب کیا اور ۱۸۷۴ء میں وہ مالیات کے افسر اعلیٰ (انسپکٹر جنرل) مقرر ہوئے قیام حیدرآباد کے زمانے میں انھوں نے اکثر کام نہایت مفید انجام دیے مثلاً محکمہ بندوبست و پیمائش میں بہت مفید اصلاحیں کیں اور بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکریٹری یعنی اعلیٰ معتمد مال اور ۱۸۸۴ء میں فنانشل و پولٹیکل سکریٹری کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے اور سرکار نظام سے محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ کا خطاب پایا۔ سفر انگلستان بھی کیا تھا اور گلیڈسٹون سے ملاقات کی تھی۔ بالآخر پولیٹیکل سازشوں کے سبب سے اپنے عہدہ سے علحدہ ہوکر اور آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پاکر علی گڈھ چلے آئے جہاں بقیہ عمر کالج کے انتظام اور سرپرستی اور تعلیمی خدمات میں صرف کی۔

سید صاحب سے اُن سے بہت قدیم تعلقات تھے۔ مشہور ہے کہ جب سید صاحب شرع شروع میں

مذہب میں کچھ دست اندازیاں کر رہے تھے تو عام مسلمانوں کی طرح یہ بھی اُن کو کافر ملحد سمجھتے تھے مگر بعد کو جب اُن کی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو اُن کے بہت بڑے مداح اور معاون ہو گئے چنانچہ "تہذیب الاخلاق" میں اکثر بیش بہا مضامین انھیں کے قلم سے ہیں جو ایک مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی غرض اصلی صرف یہ ہی کہ زمانۂ حال کے مسلمان جو نکبت و فلاکت کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں اپنے بزرگان سلف کے قدم بہ قدم چلیں اور اپنے آپ کو ہر حیثیت یعنی تعلیم و اخلاق و سیاست کے اعتبار سے کامیاب بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مضامین اُن کے تبحر علمی وسیع النظری اور انصاف پسندی کے شاہد عادل ہیں مولانا حالی نے بہت سچ لکھا ہے کہ "سید مہدی علی مسلمانوں کے دلوں کو اُن کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا دلا کر اُبھارتے تھے اور جو کچھ کہ انھوں نے سرسید کی تائید میں لکھا وہ بڑے استدلال و استناد سے لکھا۔ اکثر ان کے مضامین جو ایک اچھی خاصی کتاب کے برابر ہیں بڑی تلاش اور محنت سے لکھے گئے ہیں"۔ اسی طرح مولانا شبلی بھی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "کہ میدان ادب میں وہ کسی طرح بڑے سے بڑے نثار سے پیچھے نہیں رہی اور اُن کا ایک خاص طرز تحریر ہی"۔

ان کے طرز تحریر کے خصوصیات یہ ہیں کہ عبارت نہایت زوردار ہوتی ہی مگر اُس پر بھی صفائی اور سلاست اور حُسنِ بیان میں فرق نہیں پڑتا۔ اگر کہیں پُرانے طرز کی تقلید میں عبارت آرائی اور رنگینی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے صنائع بدائع اور استعارات و تمثیلات بُرے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ حُسنِ عبارت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کی پُرتکلف عبارت وہ زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ ان کے زیادہ تر مضامین صاف سادہ اور سلیس ہیں۔ علاوہ مضامین مذکورۂ بالا کے اُن کی کوئی مشہور تصنیف سوائے "آیات بینات" کے نہیں ہے اور یہ ایک مذہبی رنگ کی کتاب ہے۔ کہا جاتا ہی کہ مولوی ظفر علی خاں نے ڈریپر کی مشہور کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" کا ترجمہ نواب صاحب موصوف ہی کی فرمائش سے کیا تھا نواب صاحب نے ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا اور سرسید کے قریب دفن ہوئے۔

نواب وقار الملک
۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۷ء

خلافت علی گڈھ کے خلیفۂ ثانی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین شیخ فضل حسین کے صاحبزادے تھے امروہہ (یوپی) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ایک

کمبوہ خاندان سے تھے۔ شروع میں کسی اسکول میں پڑھاتے تھے اور زمانہ قحط میں امروہہ میں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں پھر رفتہ رفتہ سررشتہ دار اور منصرم صدر الصدور ہو گئے اور سرسید کے ساتھ کام کرتے رہے سرسید ہی کی سفارش سے حیدر آباد پہونچے جہاں سر سالار جنگ کے حکم سے ناظم دیوانی کے عہدے پر ممتاز ہوئے اور اپنی قابلیت تن دہی سے اور دیانت سے حکام اعلیٰ کو مطمئن اور خوش رکھا۔ سازشوں کی وجہ سے ان کو بھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا مگر پھر جلد بلا لیے گئے اور دوبارہ انھوں نے نہایت عمدہ اور مفید اصلاحیں سرکاری کاموں میں کیں جس کے صلہ میں معزز خطاب "وقار الدولہ وقار الملک" کا سرکار آصفیہ سے عنایت ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بقیہ عمر قومی کاموں میں علی الخصوص علی گڈھ کالج کی اصلاح و ترقی میں صرف کردی۔ نواب صاحب موصوف ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر اور "تہذیب الاخلاق" کے مہتمم بھی ہو گئے تھے تصانیف آپ کی چند قیمتی مضامین ہیں۔ جو "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے اور ایک انگریزی کتاب "فرنچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" کا اردو ترجمہ "سرگزشت نپولین بونا پارٹ" ہے جس کی تالیف میں منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد نے بھی کچھ حصہ لیا تھا اور ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے چھپ کر شایع ہوا۔

مولوی چراغ علی
۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۵ء

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد بخش تھا انھوں نے میرٹھ سہارن پور اور پنجاب میں سرکاری ملازمت کرکے انتقال کیا اور اپنے بعد چار لڑکے چھوڑے جن میں چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ چراغ علی ابتدائی تعلیم سے فراغت کرکے ضلع بستی کے محکمہ خزانہ میں مبلغ بیس روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ کے ڈپٹی منصرم اور پھر سیتاپور کے تحصیلدار ہوئے۔ ۱۸۷۷ء میں سرسید کی کوشش سے حیدر آباد گئے جہاں نواب محسن الملک کی ماتحتی میں نائب معتمد مال بمشاہرہ چار سو روپیہ مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے ریونیو اور پولٹیکل سکریٹری کے معزز عہدہ پر بمشاہرہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ممتاز ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی نہایت بیدار مغز متدین غیر متعصب اور راستباز شخص تھے کتب بینی کا ان کو

اس قدر شوق تھا کہ مقامات دور دراز مثلاً مصر و شام سے کتابیں منگواتے تھے۔ ابتدائے عمر سے مضمون نگاری کا شوق تھا جس میں مذہبی رنگ غالب تھا۔ کبھی کبھی عیسائیوں یا پادریوں سے بھی مقابلہ ہو جاتا تھا جس میں یہ مذہب اسلام کی خوبیوں کو نہایت شد و مد سے ثابت کرتے تھے، یہ مطالعۂ کتب کے عاشق اور پابندیٔ اصول کے ایک پیکر مجسم تھے ان کی تصانیف کثرت سے ہیں، علاوہ ان کتابوں کے جو ملازمت حیدر آباد کے زمانے میں حیدر آباد کے انتظامی معاملات اور سرکاری رپورٹوں وغیرہ کے متعلق انھوں نے لکھیں کتب ذیل جو عام دلچسپی کی ہیں مشہور ہیں۔ تحقیق الجہاد و مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں کیا کیا۔ اصلاحات کیں۔ رسول برحق۔ اسلام کی دنیاوی برکتیں۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ ان کے علاوہ ان کے مضامین تہذیب الاخلاق اور وہ خطوط جو "مجموعۂ رسائل" کے نام سے چھپے ہیں اردو اور انگریزی پمفلٹ بھی ہیں جو مسائل اختلافی پر لکھے گئے تھے۔ مولوی صاحب موصوف علاوہ ایک متبحر فاضل اور جید عالم ہونے کے فن مناظرہ میں ایک بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے، اور ان کو مشکل مسائل میں دل نشین جواب دینے کا ایک خاص سلیقہ تھا۔ اور عبارت بھی نہایت زوردار لکھتے تھے ہر چند کہ اس میں ادبی شان کم ہوتی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد
متوفی ۱۹۱۰ء

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں دلّی میں پیدا ہوئے ان کے والد مولوی باقر علی جنھوں نے شمالی ہند میں مضمون نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی ذوق کے دلی دوست تھے۔ اسی وجہ سے آزاد کی ابتدائی تعلیم اُستاد ذوق کے سایۂ عاطفت میں ہوئی انھیں کی بابرکت صحبت میں انھوں نے شعر گوئی اور فن عروض سیکھا آزاد پرانے دلّی کالج کے تعلیم یافتہ تھے جس سے مولوی نذیر احمد مولوی ذکاء اللہ ماسٹر پیارے لال آشوب ایسے لائق اور ہونہار لوگ پڑھ کر نکلے اُستاد ذوق کے ساتھ یہ بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے اور بڑے بڑے شعرا سے روشناس ہوتے تھے اور انھیں ادبی سرچشموں سے ان کا ذوق سخن سیراب ہوتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کے بعد آزاد اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور سرگرداں پھرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ ان کے والد کا انتقال غدر میں ہو چکا تھا۔ استاد کا کلام اور کچھ خود ان کا کلام جو پہلے کا تھا۔ غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ ہنگامہ غدر رفع ہونے کے بعد آزاد نے کسب معاش کے مختلف ذرائع اختیار کئے۔ کچھ دنوں تک ایک فوجی اسکول میں ماسٹر رہے مگر چند دنوں کے بعد اس کام کو چھوڑ دیا۔ آخرکار پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور مولوی رجب علی کے ذریعہ سے پنڈت من پھول

لفٹنٹ گورنر کے میر منشی سے ملے جن کی سفارش سے سررشتہ تعلیم کے محکمہ میں پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم ہوگئے چھوٹے عہدے کی وجہ سے اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ بڑے بڑے افسران سرکاری سے ملیں جو ان کی لیاقت اور قابلیت کا لحاظ اور قدر کر کے ان کو کسی اعلیٰ عہدے پر پہونچائیں اتفاق سے ماسٹر پیارے لال آشوب کے ذریعہ سے جو ان کے بہی خواہ اور دوست تھے میجر فلر صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تک رسائی ہوگئی جو علوم والسنہ مشرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ میجر صاحب نے لفظ ایجاد کو مؤنث لکھا تھا جس کی نسبت تذکیر و تانیث کا کچھ شبہ تھا۔ ماسٹر پیارے لال نے آزاد کو بلایا اور ان سے اس کی بابت دریافت کیا گیا۔ انھوں نے "ایجاد" کو مذکر کہا۔ اور جب سند مانگی گئی تو یہ شعر سودا کا پڑھا سے ہائے یہ کس بھبڑدے کا ایجاد ہے ، نسخہ میں معجون زرنباد ہے۔ اس وقت سے میجر صاحب کی خدمت میں ان کی رسائی ہوگئی اور کچھ ترقی بھی ہوگئی سب سے پہلے یہ اردو فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور ہوئے چنانچہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ اردو کی پہلی۔ دوسری اور تیسری کی اور قصص ہند اس زمانے کی ان کی مشہور تصانیف ہیں جو مدرسوں میں نہایت مقبول ہوئیں اور انھیں تصانیف کی بدولت پنجاب میں اسکولی تعلیم بہت رائج ہوئی۔ آزاد کو یہ بھی فخر حاصل ہو کہ انھوں نے انجمن پنجاب کے قیام میں بہت بڑا حصہ لیا جس کی وجہ سے صوبہ پنجاب میں اردو کی ترقی اور ترویج ہوئی جب میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم مقرر ہوئے جن کو زبان اردو کا محسن سمجھنا بالکل بجا ہی تو ۱۸۷۴ء میں آزاد نے کرنیل صاحب موصوف کو اس بات پہ آمادہ کیا کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک خاص مشاعرہ قائم کیا جائے جس کی غرض یہ ہو کہ اردو شاعری کی مبالغہ آمیز اور پر تصنع روش بدل جائے اور اس میں حقیقت اور اصلیت کی روح پیدا کی جائے ۱۸۶۵ء میں وہ کسی سرکاری کام سے کلکتہ اور پنڈت من پھول کی معیت میں ایک سفارتی مشن پر کابل و بخارا گئے تھے۔ ایران وہ دو مرتبہ گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۸۳ء میں زبان فارسی سے اُن کو ایک خاص لگاؤ تھا اور اسی وجہ سے اس کا مطالعہ انھوں نے خاص طور پہ کیا تھا اور ایران کے قیام نے ان کو جدید فارسی سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ انھیں وجوہ سے ان کی وہ تصانیف جو زبان فارسی کے متعلق ہیں دلچسپی اور معلومات سے پُر ہیں۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو "اتالیق پنجاب"

(ایک سرکاری اخبار) کا سب ایڈیٹر بمشاہرہ چھہتر روپیہ ماہوار کیا تھا۔ اور ایڈیٹر رائے بہادر پیارے لال آشوب تھے۔ جب تھوڑے عرصہ کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا اور "پنجاب میگزین" اس کی جگہ نکلا تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ان کے بعد مولانا حالی کچھ دنوں اس عہدے پر متعین رہے آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر بھی ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کے جوبلی کے موقع پر اُن کی قابلیت کے صلہ میں اُن کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ دماغی محنت اور سفر ایران کا تعب اور اپنی پیاری بیٹی کی بے وقت موت کی وجہ سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور جن کو نہایت عمدہ تعلیم دلائی تھی اُن کے قوائے دماغی پر بہت بڑا اثر پڑا جس کی وجہ سے ۱۸۸۹ء میں کچھ جنون کے آثار معلوم ہونے لگے جس سے وہ کسی ادبی کام کے لائق نہیں رہے۔ آخر عمر تک یہی حالت جنون کی رہی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی۔

تصانیف آزاد کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔ فارسی ریڈریں (۲ حصے)، قدیم اُردو ریڈریں (۳ حصے) اُردو کا قاعدہ۔ قواعد اُردو۔ قصص ہند۔ جامع القواعد نئی اُردو ریڈریں (۳ حصوں میں) آبحیات۔ نیرنگ خیال۔ سخندان فارس۔ قندپارسی نصیحت کا کرن پھول۔ دیوان ذوق۔ نظم آزاد۔ دربار اکبری نگارستان فارس۔ سیاک دنماک، جانورستان۔

ریڈریں اور اسکولی کتابیں اُردو اور فارسی ریڈریں اور ابتدائی رسائل صرف ونحو طلبائے اسکول اور مبتدیوں کے واسطے لکھے گئے تھے۔ ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے اور فی الحقیقت طلباء کے واسطے وہ بہت مفید اور کچھ عرصہ تک وہ داخل درس رہی بھی ہیں علی الخصوص قصص ہند جس میں تاریخ ہندوستان کے مشہور مشہور حالات و واقعات عجیب دلچسپ بلیغ اور پُرزور عبارت میں لکھے گئے ہیں۔ یہ لاجواب کتاب جماعت طلباء میں اور نیز پبلک میں بیحد مقبول ہے۔ اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بچے اس کو دلچسپ واقعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور پڑھے لکھے اس کی عبارت کے دلدادہ ہیں۔ جملوں کا توازن۔ عبارت کی چستی الفاظ کی شکوہ۔ اور مضامین کی ترتیب اس کی مخلص کتابوں سے اس کا درجہ بلند کر دیتی ہے۔

آب حیات مولانا آزاد کا شاہکار اور ان کی بہترین تصنیف آبحیات ہے۔ اس میں مشہور مشہور شعراء کے

مختصر حالات مع اُن کے نمونہ کلام اور تنقید کے درج ہیں۔ اور زبان اُردو کی تاریخ اور اُن تغیرات کا بھی ذکر ہے جو زبان اُردو میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں۔ حقیقت میں اس کتاب کی تصنیف سے ایک بہت بڑی کمی پوری ہوگئی اس وجہ سے کہ گو کہ اس سے قبل اکثر تذکرے اور مجموعۂ اشعار موجود تھے۔ مگر وہ قابل اعتنا نہ تھے اور نامکمل بھی تھے بعض کا تو یہ حال تھا کہ مشہور مشہور شاعروں کا حال صرف چند سطروں میں لکھ دیا اور ان میں بھی آدھے سے زیادہ محض کلمات توصیف وتحسین۔ ادب اُردو آزاد کا ممنون ہے کہ انھوں نے ایک باقاعدہ اور مفصل تذکرہ شعرا ترتیب دیا جس کے واسطے یقیناً اُن کو بڑی محنت اور کاوش کرنا پڑی ہوگی۔ وہ ایک ایسا خزانۂ معلومات ہے کہ جس سے مابعد کے مصنفین بہت کچھ مدد لے سکتے ہیں اور لیتے رہے ہیں۔ علاوہ اس خوبی یعنی گنجینۂ معلومات ہونے کے اُس کی اصلی خوبی اُس کی بے مثال طرز عبارت ہے کہ جس کی نقل کی سب کوشش کرتے آئے ہیں مگر کما حقہ کوئی نہیں کر سکا۔ الحق آزاد نے آبحیات لکھ کر ادب اُردو میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جو مثل حالی کے سادہ اور عاری از زیب وزینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ثقیل اور وزنی ہے وہ ایک زوردار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو احاطۂ بیان سے باہر ہیں اور صرف دل اُن سے لطف اُٹھاتا ہے مگر اُسی کے ساتھ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش وشوق میں تاریخی مواد کو غور وخوض سے نہیں دیکھا غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سربہ فلک عمارتیں کھڑی کر دیں۔ اور بعض جگہ کتاب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے واقعات میں کمی وبیشی اور تبدیلی تک کو جائز رکھا۔ مگر زمانۂ حال کے تجسس وتلاش اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ آبحیات کے اکثر بیانات غلط یا کم از کم مشکوک ضرور ہیں۔ اکثر جگہ جانبداری کا الزام بھی مصنف پر عائد ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے اُستاد ذوق کی بیحد تعریف وتوصیف اور ان کے حالات میں شغف اور مرزا غالب کے کمالات سے نسبتاً بے پروائی بلکہ جگہ جگہ ان پر درپردہ چوٹیں۔ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا۔ انشا کے آخری زمانے کے عبرت انگیز غیر موثق حالات وغیرہ یہ اور اسی قسم کی باتیں جو اب اثنائے مطالعہ پر نظر آئی ہیں آبحیات کے اکثر بیانات کے متضاد اور مخالف واقع ہیں۔ پھر بھی اگر اس قسم کی دو ایک غلطیاں نکل آئیں تو اس سے ہماری رائے میں کتاب کی اصل خوبی اور قدر وقیمت میں کوئی زیادہ فرق

نہیں آتا۔ اسی کتاب سے تنقید کا صحیح معیار اُردو میں قائم ہوا۔ حالی کی یادگارِ غالب کو اسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیمی تذکرہ کے۔ بحیثیت ایک خزانہ واقعات و حکایات کے۔ بحیثیت غیر قابلِ تقلید ہونے کے یہ کتاب آپ اپنی جواب ہے اور آیندہ بھی اس کا جواب مشکل معلوم ہوتا ہے۔

نیرنگِ خیال | یہ بھی ایک جدید رنگ کی کتاب ہے جس میں خیالی افسانوں اور خواب وغیرہ کے پردہ میں عمدہ اخلاقی نتائج نکالے ہیں۔ یہ دو حصوں میں ۱۸۸۰ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس قسم کے فرضی افسانے اور حکایات ہر زمانہ اور ہر قوم میں لوگوں کے مطبوعِ خاطر رہے ہیں۔ یونانی اور رومی لوگوں کو ان کا بہت شوق تھا۔ انگریزی میں اڈیسن جان بنین اور سپنسر کے ایلیگری (خیالی قصے) مشہور ہیں اور فارسی میں مثنوی مولانا روم اور انوارِ سُہیلی سنسکرت میں ہتوا پدیش اور عربی میں اخوان الصفا وغیرہ۔ ہمارے خیال میں آزاد نے اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے اور اس سے ان کی یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر لیٹر نے ان کو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب دی تھی اور اس کا خاکہ تیار کر دیا تھا۔ مگر یہ بڑی قابلِ تعریف بات ہے کہ مولانا آزاد باوجود انگریزی کم جاننے کے اس اتباع میں کامیاب ہوئے یہ کتاب اُن کے خاص طرزِ تحریر میں لکھی گئی ہے۔ مگر نفسِ مضمون سے زیادہ طرزِ بیان بہت دلچسپ ہے۔

سخندانِ فارس | ادبِ فارسی کے متعلق یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے۔ دراصل یہ ایک قیمتی رسالہ علم فلالوجی پر ہے جس میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کو متحد الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اہلِ ایران کے رسوم و رواج کا بھی ذکر ہے اور اُن کا مقابلہ ہندوستان سے کیا ہے۔ خود مُصنف کے سفرِ ایران اور ان کے علمی مکاشفات کے حالات بھی درج ہیں۔ مثل مولانا شبلی کی شعر العجم کے یہ ایک مکمل کتاب نہیں کہی جا سکتی مگر پھر بھی بہت مفید اور ایک ذخیرۂ معلومات ہے۔

قندِ پارسی اور نغمیت کا کرن پھول | قندِ پارسی ایک مفید کتاب ہے جس سے زمانۂ حال کی فارسی کے حاصل کرنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اس میں مولانا کے سفرِ ایران کے بھی بہت کچھ حالات درج ہیں۔ نغمیت کا کرن پھول جو ایک مکالمہ اور نصائح کے پیرایہ میں ہے بچوں اور عورتوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کی عبارت بہت صاف و سلیس ہے۔

دیوان ذوق اس کتاب کی ترتیب تالیف سے مولانا آزاد نے ادب اُردو کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور اپنے اُستاد کے کلام کو گمنامی سے بچا لیا ہے۔ تذکرہ آبِ حیات میں انھوں نے نہایت مؤثر اور دردناک لہجہ سے اور تفصیل کے ساتھ اُستاد کے کلام کا ضائع ہو جانا اور پھر اُن اجزائے پریشاں کو بڑی محنت اور دقتوں سے جمع کرنا بیان کیا ہے۔ دیوان کے شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے اور بعض بعض غزلوں کے ساتھ ان کے حالات تصنیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور پہلے کے مطبوعہ کلام سے ایک بیّن اضافہ بھی اس میں موجود ہے ان دلچسپ نوٹوں سے نہ صرف اشعار کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے بلکہ اس میں ایک "رومان" کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بعض لوگوں نے الحاق کلام پر شک بھی ظاہر کیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس قسم کے شکوک بے بنیاد ہیں اور ان پر زیادہ نہ خیال چاہیے۔

دربارِ اکبری یہ مہتم بالشان تصنیف اکبر بادشاہ کے عہد اور ان کے اراکین سلطنت کے حال میں ہے اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر نظرِ ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہدِ اکبری کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

دیگر تصانیف "سیاک دنماک"، "جانورستان" اُس زمانے کی تصانیف ہیں جبکہ مولانا صحیح الدماغ نہ رہے تھے۔ اول الذکر ایک غیر مربوط مجموعہ متصوفانہ خیالات کا ہے جو اُسی عالم میں لکھے گئے تھے۔ اس سے کتنا بڑا شوق تصنیف و تالیف کا پایا جاتا ہے کہ باوجود تعطل دماغ کے بھی جب کبھی چند لمحے سکون کے ملتے تھے تو وہ اُن کو ادبی کارناموں میں صرف کرتے تھے۔ اسی زمانے اور اسی حالت کی تصنیف "جانورستان" بھی ہے جس میں کچھ جانوروں کے حالات اور ان کی آوازوں کا بیان ہے۔ "نگارستانِ فارس" جو بعد ان کے انتقال کے شائع ہوئی ایران و ہندوستان کے فارسی شعرا کا ایک مختصر تذکرہ ہے جس میں رودکی سے لے کر حزیں اور واقف و آرزو تک تقریباً ۶۳ شعرا کے حالات مع ان کے نمونہ کلام کے درج ہیں۔ اس کی زبان بہت صاف و سادہ مگر مثل آبِ حیات کے پُرلطف نہیں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ اُن کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہو۔ آخری کتاب جو ان کے نام سے ان کے پوتے نے شائع کی ہے "آکہیات" ہے۔

آزاد کا مرتبہ، اُردو نثاروں میں اُردو نثر نگاروں میں آزاد کی ایک بہت وقیع اور بہت نمایاں ہستی ہے۔ بحیثیت

بانی تحریک جدید ہونے کے بحیثیت جدید طرز کے شاعر کے بحیثیت ایک فارسی اسکالر کے جو قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کے بھی بڑے ماہر تھے۔ بحیثیت ایک مروج تعلیم کے جن کی وجہ سے پنجاب میں انگریزی کے ساتھ اردو فارسی کی تعلیم نے بھی بڑا رواج پایا۔ بحیثیت ایک اعلیٰ مضمون نگار کے۔ بحیثیت ایک زبردست ناقد کے۔ بحیثیت ایک مشہور پروفیسر اور مصنف کے۔ بحیثیت حامی اُردو کے۔ بحیثیت ایک زبردست مقرر کے آزاد اپنے زمانہ میں عدیم المثال تھے۔ مگر وہ چیز جس نے اُن کو زندۂ جاوید کر دیا وہ اُن کا خاص طرز تحریر ہے جو لاثانی ہے اور جس کی تقلید محال ہے۔ زبان اُردو نے اُن کی ذات میں اپنا ایک بہت بڑا مددگار اور حامی پایا تھا۔ ان کے طرز تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اور دور از کار صنائع بدائع جن کا آج کل بہت رواج ہے اُس میں نہیں پائے جاتے اُن کی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ معاشرہ کی سادگی اور بے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کا حسن و خوبصورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے۔ وہ تصنعات اور تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اُس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے۔ آزاد کا مقابلہ انگریزی انشا پردازوں میں ڈی کوئنسی۔ لیمب اور اسٹیونسن سے جو صاحبان طرز خاص تھے بخوبی ہو سکتا ہے اپنے زمانے میں بھی آزاد بہت ہر دلعزیز اور مقبول ہو چکے تھے اور اُن کے معاصرین ان کو نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے چنانچہ حالی نے آبحیات اور نیرنگ خیال کی تقریظوں میں ان کی بہت تعریف کی ہے اور شاعری کے طرز جدید کا اُن کو بانی قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا شبلی ان کو اُردو کا ایک بہت بڑا ہیرو سمجھتے تھے اور ان کی موت پر اُن کو خدائے اُردو کہہ کے یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ بھی ان کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔

آزاد ظریف الطبع۔ نہایت مہذب ذہین اور تعصب سے بالکل آزاد تھے۔ وہ سریع الغیظ مگر جلد معاف کرنے والے تھے بعض معاصرین سے جنگ رہتی تھی جس کا انجام بحث و مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

حالی | خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر بحیثیت شاعر کے حصۂ نظم میں ہو چکا ہے۔ یہاں بحیثیت معزز نثار کے

ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔ تریاق مسموم مطبوعہ سنہ ۱۸۶۸ء، علم طبقات الارض کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ، مجلس النسا (۲ حصوں میں) مطبوعہ سنہ ۱۸۷۴ء، حیات سعدی مطبوعہ سنہ ۱۸۸۶ء مقدمہ شعر و شاعری۔ یادگار غالب مطبوعہ سنہ ۱۸۹۶ء، حیات جاوید یعنی سر سید مرحوم کی سوانح عمری مطبوعہ سنہ ۱۹۰۱ء مضامین حالی یعنی ان مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپے ہیں۔

ابتدائی تصانیف | "تریاق مسموم" پانی پت کے ایک شخص کے اعتراضات کا جواب ہے جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا اور جس نے اسلام پر اعتراضات کیے تھے۔ اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں محض اس لیے دلچسپ ہے کہ اس سے ان کی ذکاوت اور طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ "طبقات الارض" ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو خود فرانسیسی سے کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر لیٹنر کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ "مجلس النسا" ایک انعامی رسالہ ہے جس کے صلہ میں مولانا کو مبلغ چار سو روپیہ کا انعام لارڈ نارتھ بروک وایسرائے ہند نے عطا کیا تھا یہ عورتوں کے واسطے بہت مفید ہے اور لڑکیوں کے اسکولوں میں ایک عرصہ تک بحیثیت درسی کتاب کے داخل رہی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے الفاظ و محاورات ہیں جو شریف گھرانے کی عورتیں بولتی ہیں۔

حیات سعدی | حیات سعدی یعنی شیخ سعدی شیرازی کی سوانح عمری اس سے مولانا نے اردو نثاروں کی صف اول میں جگہ پائی اور ان کی سوانح نگاری کی قابلیت اور اسلوب بیان کا پتہ چلا۔

مقدمہ شعر و شاعری | مولانا کے دیوان کے شروع میں یہ معرکۃ الآرا مقدمہ ہے جس نے اردو کی ادبی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور مولانا کی شہرت کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ اس میں دو سو سے زیادہ صفحات ہیں اور گو کہ دیوان کے ساتھ چھپا ہے مگر اس کو دیوان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک نہایت قابلانہ تنقیدی مضمون نفس شاعری کے آئڈیل دانتہائی نقطۂ خیال، پر ہے۔ اس کی تصنیف سے تبحر، تحقیق، تلاش اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں یونانی و رومی انگریزی و عربی نقادان فن شعر کے خیالات شعر کی بابت قلمبند کیے گئے ہیں گو چند کہ نہایت مجمل اور غیر مربوط طریقے سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یورپین شاعری میں مولانا حالی تہ تک غوطہ نہیں لگا سکتے کیونکہ اس بحر کے وہ شناور نہیں ہیں سنسکرت کی شاعری کو بوجہ عدم واقفیت زبان بالکل

چھوڑ دیا ہے مگر باوجود ان سب کے کتاب ایک ذخیرۂ معلومات ہے اور اس وجہ سے کہ اس قسم کے فن نقد میں سب سے پہلی تصنیف ہے نہایت قابل قدر ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی جو مغربی تعلیم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اس کے مطالعہ سے قدیم طرز کے شعراء کے سامنے جدید معلومات اور تخیل کے دروازے کھل گئے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی تقلید میں زمانہ موجودہ کے اکثر دواوین کے ساتھ اکثر مقدمات لاطائل شائع ہوتے رہتے ہیں جن کا ماخذ درحقیقت یہی مقدمۂ شعر و شاعری ہے اور کسی جدید بات کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

یادگار غالب | مولانا کی سب سے زیادہ ہردلعزیز تصنیف یادگار غالب ہے جس سے بہتر کوئی کتاب اس طرز کی اب تک نہیں نکلی، اس میں مرزا غالب کی زندگی کے حالات و واقعات ان کے لطائف و ظرائف وغیرہ نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیے ہیں اس کے بعد ان کے ہر قسم کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے بڑی خوبی یہ ہے کہ چونکہ مصنف مرزا صاحب کے شاگرد تھے لہذا اکثر واقعات چشم دید لکھے ہیں مشکل اشعار کے معانی بھی سمجھائے ہیں اور ان مواقع کا بھی بیان ہے جب وہ اشعار کہے گئے تھے جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اس تصنیف کے ذریعہ سے حالی نے اپنے اُستاد غالب کی شاگردی کا حق اسی طرح ادا کر دیا جس طرح کہ آزاد نے دیوان ذوق کو ترتیب دے کر ذوق کو زندۂ جاوید بنا دیا دونوں اپنے اپنے استادوں کے شاگرد رشید اور دل سے چاہنے والے تھے۔ "یادگار غالب" تنقیدی کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے تنقید گو کہ اعلیٰ درجہ کی ہے مگر پھر بھی جوش عقیدت مندی کہیں کہیں جادۂ انصاف سے ہٹا دیتا ہے۔

حیات جاوید | حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے خود انھوں نے حیات ابدی پائی یہ ایک بہت مفصل اور جامع ضخیم کتاب ہے اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور مختلف الاحوال کثیر الاشغال زندگی کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ درج ہیں کہ اس کو زبان اردو میں یہی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے جو باسویل کی مشہور کتاب "ڈاکٹر جانسن کی لائف" کو انگریزی میں ہوا ہے۔ سرسید بحیثیت ایک لیڈر اور ریفارمر اور اہل قلم کے دکھائے گئے ہیں۔ سرسید کے ساتھ ان کے اکثر شرکائے کار کے بھی حالات اس میں درج ہیں۔ یہ ایک مہتم بالشان تصنیف ہے لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے یہی وجہ ہے

شمس‌العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد ایل-ایل-ڈی

مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا اُن کی توجیہ کر دی گئی ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس زمانے کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ سوانح نگاری اور فن تنقید ہمارے یہاں ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور زیادہ تر قطع و برید سے بجائے نفع کے نقصان کا احتمال ہے۔

مضامین حالی | وہ مضامین ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اخبارات و جرائد میں علی الخصوص تہذیب الاخلاق میں چھپوائے ہیں۔ ان کے علاوہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ بھی اُنھوں نے ترتیب دے کر چھپوایا ہے۔

طرز تحریر | مولانا کی عبارت نہایت صاف سادہ زبردست اور زوردار ہوتی ہے۔ مگر اس میں آزادی کی سی شوخی اور رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی نازک اور لطیف ظرافت نہیں ہوتی۔ حالی گو کہ صاحب طرز نہیں مگر بہترین نثار ہیں۔ وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مطلب کا خیال رکھتے ہیں صنائع بدائع کی نہ ان کے یہاں کثرت ہے اور نہ ان کا بیجا استعمال وہ کرتے ہیں محض لفاظی اور عبارت آرائی وہ کبھی نہیں کرتے اور عبارت کی ظاہری آرائش سے وہ قطعاً احتراز کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کی عبارت بہت سلجھی ہوئی اور صاف ستھری ہوتی ہے۔ گو کہ وہ بلند پروازی نہیں کرتے مگر زور بیان اور فصاحت سے اُن کی عبارت مالا مال ہوتی ہے۔ جدید نثر اردو نے اُن کو اپنا بہت بڑا حامی اور مددگار پایا اور اُنھوں نے مرزا غالب اور سر سید کے طرز تحریر کو زندہ رکھا۔ ان کی تصانیف آئندہ نسلوں کے واسطے بہترین نمونہ سمجھی جا سکتی ہیں۔

مولانا نذیر احمد ۱۸۳۱ء تا ۱۹۱۲ء | شمس العلماء خان بہادر مولانا نذیر احمد موضع ریہڑ ضلع بجنور میں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے ان کا خاندان علم و فضل کے لیے مشہور تھا۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ اور ان سے اُنھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ پڑھا اور دلی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی عبد الخالق کے شاگرد ہوئے جن کی پوتی سے اُنھوں نے عقد بھی کیا۔ دلی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے اصرار سے وہ دلی کالج میں داخل ہوئے اور وہاں ادب عربی اور فلسفہ و ریاضی وغیرہ میں تکمیل حاصل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انگریزی بھی شروع کی۔

مگر والد کی مخالفت کی وجہ سے چھوڑنا پڑی۔ اس زمانہ میں ان کے ہم سبق حالی، آزاد، منشی کریم الدین مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب تھے۔ مثل اُس زمانے کے اور بڑے لوگوں کے مولوی نذیر احمد نے بھی زندگی کی ابتدا ایک چھوٹی سی ملازمت سے کی یعنی وہ پنجاب میں کسی مقام میں بیس پچیس روپے ماہوار کے ٹیچر مقرر ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے کسی میم کی جان بچائی تھی جس خدمت کے صلے میں ایک تمغہ اور کچھ زر نقد سرکار سے ملا اور انسپکٹر مدارس کے درجے پر ترقی ہوئی۔ اس کے بعد اُن کا تبادلہ الہ آباد میں ہو گیا اور یہیں انھوں نے تھوڑی سی انگریزی سیکھ لی۔ کیونکہ ان کو نہایت شرم و حجاب معلوم ہوتا تھا کہ جو زبان حاکم و محکوم کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے اُس سے وہ محروم ہیں۔ اپنی طبّاعی اور ذہانت سے انھوں نے چھ مہینے کے اندر انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی اور بعد کو کتب بینی سے وہ اس قابل ہو گئے کہ ۱۸۶۱ء میں انڈین پینل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر منجملہ دیگر اشخاص کے وہ بھی مقرر ہوئے۔ ان کا ترجمہ (مجموعہ تعزیرات ہند) ایسا مقبول ہوا اور پسند آیا کہ اس کے بعد وہ تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ انھوں نے نجوم کی بھی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا جس کو اُس زمانے کے رزیڈنٹ کشمیر نے لکھا تھا۔ اور مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام پایا تھا۔ اُن کی قابلیت کا شہرہ سُن کر سر سالار جنگ اوّل نے اُن کی خدمات گورنمنٹ سے اپنے یہاں منتقل کرا لیں اور افسر بندوبست بمشاہرہ آٹھ سو روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ اسی عرصہ میں انھوں نے قرآن شریف بھی حفظ کیا۔ اور بعد کو سر سالار جنگ کے ایما سے انگریزی ملازمت چھوڑ کر حضور نظام کی مستقل ملازمت اختیار کر لی جس میں وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ممبر مال بمشاہرہ سترہ سو روپیہ مقرر ہوئے اور اُن کے بیٹے اور اعزہ کو معقول اور اچھے اچھے عہدوں پر دی گئیں۔ سر سالار جنگ کے حکم سے انھوں نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا اور سر سالار جنگ کے صاحبزادے نواب لائق علی خاں اُن کے شاگرد تھے۔ ایک عرصہ تک اپنے عہدہ کے فرائض منصبی انجام دے کر ملازمت سے دست کش ہو گئے اور بقیہ عمر اپنے وطن مالوف دہلی میں یاد الٰہی اور تصنیف و تالیف کے مشغلے میں بسر کی۔ ۱۹۱۲ء میں ایک نہایت کامیاب و مصروف زندگی کے بعد اِس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی اور ملت و قوم کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے

مولانا موصوف سرسید کی اُس جماعت کے ایک معزز فرد تھے کہ جنھوں نے اپنی تصنیف و تالیف اور اپنے لکچروں کے ذریعہ سے اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں بڑی اعانت کی تھی۔

تصانیف | مولانا کی تصانیف بہ کثرت ہیں جن میں سے حسب ذیل بہت مشہور ہیں (از قسم ناول و حکایات) مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ ابن الوقت۔ محصنات۔ ایامیٰ۔ رویائے صادقہ۔ منتخب الحکایات (کتب مذہبی و اخلاقی) ترجمہ قرآن شریف۔ ادعیۃ القرآن۔ دہ سورہ۔ الحقوق و الفرائض مطالب القرآن۔ امہات الامۃ۔ اجتہاد (متفرق کتابیں) صرف صغیر۔ رسم الخط۔ موعظہ حسنہ۔ افسانۂ غدر۔ نصاب خسرو۔ چند پند مبادی الحکمۃ۔ مائیغنیک فی الصرف۔ مجموعۂ لیکچر اور انگریزی قانونی کتابوں کے ترجمے مثلاً تعزیرات ہند قانون شہادت وغیرہ۔

مولانا کثیر التصنیف اور سریع التصنیف دونوں تھے اُن کی اکثر کتابیں مثلاً مایغنیک فی الصرف۔ مبادی الحکمۃ۔ منتخب الحکایات۔ رسم الخط وغیرہ اسکول کے طلبا کے واسطے لکھی گئیں اور واقعی ان کے واسطے بہت مفید ہیں۔ سرکاری ایکٹوں کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کیے گئے۔ مجموعہ تعزیرات ہند یعنی پنیل کوڈ کے ترجمہ کو ان کا ایک کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ اس مشہور قانون کے ترجمے کے واسطے پہلے مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ مقرر ہوئے تھے پھر سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کے حکم سے مولوی نذیر احمد ان کے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ اور اُنھوں نے بڑی محنت و جانفشانی اور بڑی قابلیت سے یہ کام انجام دیا۔ اُن کے تمام قانونی تراجم نہایت عمدہ اور صحیح ہیں جس میں اکثر جگہ نہایت مناسب اور ٹھیک الفاظ مشکل الفاظ انگریزی کے لیے اردو میں وضع کیے گئے ہیں جو اب زبان زد خلائق ہوگئے ہیں قانون شہادت یعنی ایوی ڈنس ایکٹ کا ترجمہ لیروں کی کتاب سے کیا گیا ہے "افسانۂ غدر" اڈورڈ صاحب کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انھوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعض دلچسپ سوانحات کو قلمبند کیا ہے۔ ان کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی چھوٹی مختصر کتابیں اور رسائل ہیں جو قیام حیدرآباد کے زمانے میں وہاں کے عمّال کے لیے بطور ہدایت نامہ لکھے گئے تھے مگر چھپے نہیں۔

کتب مناظرہ متعلق مذہب | اُس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائی واعظوں سے جن میں سے بعض دین اسلام کو

چھوڑ کر مسیحی ہو گئے تھے اکثر مباحثے رہتے تھے اور بڑے بڑے لوگ مثلاً سر سید۔ مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک وغیرہ اُن میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک عیسائی مبلغ احمد شاہ نامی نے امہات المومنین کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں پیغمبر اسلام کی ازواج مطہرات کی نسبت کچھ بیجا الزامات قائم کئے تھے۔ مولوی نذیر احمد نے اس کے جواب میں "امہات الاُمّہ" لکھی جس کی بعض لوگوں نے تو بہت قدر کی مگر بعض نے سخت بُرا سمجھا اور اُس کے بارے میں اتنا اختلاف بڑھا کہ اس کی جلدیں آخر میں جلادی گئیں اور وہ دوبارہ بعد ترمیم چھاپی گئی۔ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کا اُردو ترجمہ قرآن شریف ہے جو نہایت آسان اور بامحاورہ زبان میں کیا گیا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کو بڑا نفع پہونچا جو قرآن شریف کو ازبر بلامعنی سمجھے یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس سے پیشتر جس قدر ترجمے قرآن شریف کے ہوئے تھے اُن کی زبان قدیم تھی اکثر الفاظ متروک ہو گئے تھے اور ترجمہ تحت اللفظ تھا اسی وجہ سے مقبول عام نہ تھا مولانا نے چار عالموں کی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت و جانکاہی سے تین برس کے عرصہ میں پورا کر دیا۔ مگر اس میں بھی اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی متانت قائم نہ رہی اور اصل الفاظ کا مطلب اُردو الفاظ و محاورات کے بیجا تصرف سے جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافہ تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر میں انھوں نے ادعیۃ القرآن۔ وہ سورہ اور الحقوق والفرائض تصنیف کیں جن میں سے آخر الذکر ایک بہت جامع اور مکمل کتاب ہے۔ اُن کی آخری تصنیف جو نامکمل رہ گئی "مطالب القرآن" ہے یہ اب چھپ گئی ہے۔ مولانا کے پاس ایک مطبع بھی تھا جس کا نام شمسی پریس تھا اسی میں ان کی تصانیف چھپا کرتی تھیں۔

اخلاقی ناول سب سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت کو ترقی ہوئی اُن کا ناول مراۃ العروس ہے جو ایک معزز مسلمان خاندان کی پرائیوٹ زندگی کا ایک قصہ ہے۔ اس کی تصنیف اُس وقت ہوئی تھی جب مولانا ڈپٹی کلکٹر تھے۔ قصہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم کے ذریعے کیونکر بدل گئی۔ یہ کتاب مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں مقبول ہے اور عورتیں اُس کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔ اس کی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے

تعجب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عورتوں کی خاص زبان اس قدر صحیح اور با محاورہ لکھنے پر کیونکر قادر ہوئے
اس کتاب کو پبلک میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور گورنمنٹ نے بھی ایک ہزار جلدیں خریدیں اور
ایک ہزار روپیہ لائق مصنف کو انعام دیا۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر دیسی زبانوں میں ہوگیا ہے
دوسری کتاب "بنات النعش" ہے جو مراۃ العروس کے بعد اور اسی طرز پر عورتوں کی تعلیم کی غرض سے
لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی نہایت مفید اور دلچسپ باتیں عام معلومات اور مبادی سائنس کے متعلق اکثر جگہ
مکالمہ کی صورت میں درج ہیں۔ اس کی بھی پبلک اور گورنمنٹ دونوں نے بڑی قدر کی۔ اس کے بعد
"توبۃ النصوح" کا نمبر ہے جو مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے۔ اس میں مختصر طور پر انھوں نے
قصہ کے طریق پر یہ دکھلایا ہے کہ ایک فاسق و فاجر شخص جس کا نام نصوح ہے سخت ہیضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے
اور ایک خواب دیکھتا ہے اس کے بعد بیدار ہو کر خوف خداوندی سے لرز جاتا ہے اور پابند شرع ہو کر
تمام منہیات سے توبہ کر لیتا ہے۔ اس کی بیوی اور بعض اور اعزہ بھی اس کے ہم خیال ہو جاتے ہیں مگر اس کا
بڑا لڑکا اس کی راہ پر نہیں آتا اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس میں مولانا نے ضمناً اولاد کی بری اٹھان
کے برے نتیجے اور کمسنی میں ان کی سخت گیری اور نگرانی کی اہمیت کو بڑی خوبی سے دکھلایا ہے "ابن الوقت"
میں ایک ہندوستانی شخص کا حال لکھا گیا ہے جو غدر کے زمانے میں اپنی خدمات کے صلے میں ایک
بڑے عہدے تک پہونچ جاتا ہے۔ اور انگریزوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے انھیں کی طرز
معاشرت اختیار کر لیتا ہے۔ اور یوروپین سوسائٹی میں شامل ہو کر اپنے ہندوستانی عزیزوں اور دوستوں
کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر بعد کو جب اس کے انگریز دوست سب چلے جاتے
ہیں تو وہ کدھر ہی کا نہیں رہتا اور آخر کار بڑی دقت سے پھر اپنی ہی قوم و جماعت کے لوگوں میں ملنے کی
کوشش کرتا ہے۔ اس کتاب کی نسبت بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں مصنف نے خود اپنی ہی سرگزشت
ایک افسانہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے "ایامیٰ" میں انھوں نے بیوہ عورتوں کی شادی پر بہت زور دیا ہے
اور ہندوستان میں ان کی افسوسناک حالت کو بیان کر کے شرعاً ازدواج ثانی کے جواز کو ثابت کیا ہے
"محصنات" میں تعدد ازدواج کا نقصان دکھایا ہے۔ "رویائے صادقہ" میں اہل اسلام کے کچھ مذہبی عقائد کی

بحث ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت میں کی گئی ہے۔ مذکورۂ بالا سب کتابیں نہایت اخلاق آموز اور نصیحت خیز ہیں۔

لیکچر اور تقریریں | مادر مصنّت سے کنارہ کشی کے بعد مولانا نے اپنی تقریریں اور لیکچر شروع کر دیئے تھے۔ ہمارے خیال میں آپ کا پہلا پبلک لیکچر ۱۸۸۸ء میں ہوا تھا وہ انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مدرسہ طبیہ دہلی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں پُرزور تقریریں کرتے تھے۔ سر سید مرحوم کے اثر سے وہ ہر اسلامی اہم اجتماع میں شریک ہوتے تھے اور سامعین کو اپنی پُر مغز تقریروں سے محظوظ کرتے تھے وہ نہایت خوش بیان اور طلیق اللسان مقرر تھے اور یہ بھی ان کا قاعدہ تھا کہ اپنی وسیع معلومات اور دلچسپ حکایات اور علی الخصوص اپنے ظرافت آمیز طرز بیان سے سامعین کو بہت محظوظ کرتے تھے اُن کا مجموعہ لیکچر چھپ گیا ہے اور مختلف انواع مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں عقائد مذہبی تعلیم و حریت نسواں وغیرہ پر نہایت مبسوط بحث کی گئی ہے۔

بحیثیت شاعر کے | آخر عمر میں شاعری نے بھی طبیعت کو گدگدایا تھا اور شعر بھی کہہ لیتے تھے کبھی کبھی اپنے لیکچروں کو اپنے اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر ہم نہایت ادب سے اس بات کے کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ محض تبرک ہی تبرک ہوتے تھے اور شعریت اُن میں مطلق نہ تھی تدریجاً کچھ کلام میں ترقی ضرور ہوئی مگر اصلی جذبات شعریہ سے وہ ہمیشہ دُور رہے۔ اُن کا منظوم کلام چھپ گیا ہے۔ اور مجموعۂ بے نظیر کے نام سے موسوم ہے مگر اس سے ان کی قابلیت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔

اخلاق و عادات | مولانا نہایت سادہ مزاج مہذب اور بہت ظریف الطبع تھے زندگی نہایت سادگی بلکہ عسرت سے بسر کرتے تھے اسی وجہ سے جزرس مشہور تھے۔ مگر پھر بھی بعض بعض غریب طلبار کی امداد بہت فراخ دلی سے کرتے تھے۔ آخر عمر میں روپیہ جمع کرنے کے شوق میں تجارت شروع کر دی تھی جس سے اُن کی آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ تعلیم و تعلم کے وہ اس قدر شائق تھے کہ مرتے دم تک یہی اشغال جاری رکھے تھے علی گڑھ کالج کے وہ بڑے سرپرست اور معاون تھے ۱۸۹۷ء میں خطاب شمس العلماء ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا کی طرف سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری اور ۱۹۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ڈی۔ او۔ ایل یعنی ڈاکٹر آف اورنٹیل لرننگ (عالم علوم شرقیہ) کی ڈگری حاصل کی تھی اور

نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب نے جو بحیثیت چانسلر جلسہ کانووکیشن کے صدر تھے ڈگری دیتے وقت اُن کے علم و فضل و طباعی و ذہانت کی بہت تعریف کی تھی۔

طرز تحریر | مولانا کی عبارت بہت آسان اور صاف و سادہ ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ لے آتے ہیں اور کہیں رنگین عبارت اور صنائع بدائع سے اور بعض مواقع پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوبصورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ آزاد کی سی لطافت اور شیرینی اُن کے یہاں نہیں ہے۔ البتہ خاص چیز جو اُن کی نثر کا جوہر ہے وہ اُن کا ظریفانہ رنگ ہے جو اُن کی ناول لیکچر اور مضامین سب میں بدرجہ اتم موجود ہے اُن کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اُس میں بھکڑ پن مطلق نہیں ہے تا مولانا اپنے تمام معاصرین پر بہ لحاظ شہرت سبقت لے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ قوانین کے تراجم سے وہ گورنمنٹ اور پبلک میں روشناس ہوئے۔ قرآن شریف کے ترجمے سے مسلمانوں میں اُن کی شہرت ہوئی اور ناولوں وغیرہ کی وجہ سے گھر گھر میں اُن کا نام پہونچ گیا۔

مولوی ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۱ء | شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ قدیم دلی کالج کے مشہور شاگردوں میں تھے اور خود انھوں نے اپنی زندگی بچوں کی تعلیم و ترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔ ۱۸۳۲ء میں دلی میں پیدا ہوئے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا اور مرزا کوچک سلطان بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے۔ مولوی ذکاء اللہ بارہ برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوئے تھے جہاں مولوی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے لہٰذا ان تینوں میں عمر بھر رابطۂ اتحاد و محبت قائم رہا اور تینوں آدمی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے جب مولوی ذکاء اللہ کالج سے پڑھ کر نکلے تو پھر اسی کالج میں ریاضی کی تعلیم پر مقرر ہوئے جس کے بعد آگرہ کالج میں فارسی و اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ سات آٹھ برس تک تعلیمی لائن میں رہ کر ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمقام بلند شہر مرادآباد ہو گئے جس جگہ پر تقریباً گیارہ سال تک رہے ۱۸۶۹ء میں دلی نارمل اسکول کے مدرس اعلیٰ ہوئے اور ۱۸۷۲ء میں اورنٹیل کالج لاہور کی پروفیسری کے واسطے نامزد ہوئے۔ مگر قبل اس کے کہ اس نئے عہدہ کا چارج لیں میور سنٹرل کالج

الہ آباد میں عربی و فارسی کی پروفیسری ان کو مل گئی جہاں سے ۲۶ برس کی ملازمت کے بعد پنشن پائی اور تقریباً چوبیس پچیس برس پنشن سے بہرہ یاب ہو کر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

تصانیف | تصانیف کثرت سے ہیں۔ اور متعدد مضامین پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ ادب اخلاق۔ طبعیات۔ کیمیا۔ سیاسیات وغیرہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی تصانیف کی کیفیت یہ ہے کہ زیادہ تر اسکولوں کے طلبار کے لیے لکھی گئی ہیں۔ لہذا رنگینی و عبارت آرائی اور ایک ادبی شان ان میں بالکل نہیں ہے۔ مولوی صاحب بحیثیت ایک ریاضی داں اور مترجم اور مؤرخ کے مشہور ہیں۔ مگر ریاضی میں اُن کا پایہ بلند نہ تھا اور ان کی کوشش صرف انگریزی کتابوں کے ترجمے اور اُن کی شرحیں لکھنے تک محدود رہی۔ البتہ تاریخ میں انھوں نے ایک کارنمایاں ضرور کیا۔ ان کی تاریخ ہندوستان دس جلدوں کی ایک ضخیم کتاب اور قابل قدر تصنیف ہے گو اس میں ریسرچ سے کام کم لیا گیا ہے اور عامتہ الناس کے لیے ہے۔ مہمات عظیم میں اُن بڑی لڑائیوں کا ذکر ہے جو انگلستان اور دوسرے ملکوں میں کوئن وکٹوریہ کے عہد میں ہوئی تھیں ان کی ایک اور بھی عمدہ تصنیف ہے جس میں کوئن وکٹوریہ کے عہد کے حالات اور ترقیاں درج ہیں جو تین جلدوں میں ہے،، آئین قیصری میں کوئن وکٹوریہ کے عہد کی انتظامی تبدیلیاں جو ہندوستان میں ہوئیں اور فرہنگ فرنگ میں یوروپین شائستگی کی تاریخ اور کوئن وکٹوریہ اور اُن کے شوہر کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی کی سوانحعمری بھی اُن کی تصنیف ہے۔ آخر عمر میں ایک تاریخ اسلام لکھنے میں مشغول تھے مگر وہ ناتمام رہی۔ ان تمام کتابوں کا طرز تحریر نہایت صاف سلیس اور عبارت آرائی اور تصنع سے بالکل پاک ہے اور وہ سب اسکولوں میں پڑھانے کے قابل ہیں۔

مولوی صاحب میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اکثر مشہور جرائد اور رسالوں کے باقاعدہ مضمون نگار بھی تھے۔ مثلاً تہذیب الاخلاق۔ سائنٹیفک گزٹ علی گڑھ۔ رسالہ حسن۔ ادیب فیروز آباد۔ مخزن زمانہ خاتون وغیرہ۔ ان کی کثیر التصانیفی پر مولانا حالی نے یہ پھبتی کہی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے۔ جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔ ممکن ہے اس میں یہ بھی لطیف اشارہ ہو

خان بہادر مولوی ذکاءاللہ خان

مولوی سید احمد (دہلوی) مولف فرہنگ آصفیہ

کہ بنیے کے یہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔

گورنمنٹ نے ان کے علمی خدمات کی بڑی قدر کی تھی ترقی تعلیم نسواں کی کوششوں کے صلے میں ان کو ایک خلعت عطا ہوا اور دیگر علمی خدمات کے واسطے پندرہ سو روپیہ کا انعام اور خطاب خان بہادر شمس العلما عنایت ہوا۔ مولوی صاحب سرسید مرحوم کے گہرے دوستوں میں تھے اور ان کے تمام تعلیمی کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے۔

مولوی سید احمد دہلوی | مولوی سید احمد دہلوی اپنی مشہور و معروف اُردو لغت" فرہنگ آصفیہ" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے اُردو داں پبلک میں ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ دلی میں ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے باپ کا نام حافظ سید عبدالرحمن تھا جو مستند سادات سے تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کے موافق دیسی مکتبوں میں ہوئی۔ جب کچھ حرف شناس ہو گئے تو سرکاری اسکول اور نارمل اسکول میں تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد اپنی فطری طباعی اور مشاہیر اہل علم کی صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک چھوٹی سی فارسی نظم "طفلی نامہ" کے نام سے اور ایک انشا کی کتاب "تقویۃ الصبیان" لکھ ڈالی ۱۸۶۹ء میں ان کی کتاب "کنز الفوائد" نکلی جس پر سرکار سے دو سو روپیہ انعام ملا ۱۸۶۸ء سے انھوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فرہنگ آصفیہ کے واسطے مسالہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۷۱ء میں ان کی دوسری کتاب "وقائع درد نیہ" شائع ہوئی جس پر ان کو مبلغ ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام ملے اس رقم سے ان کی فرہنگ آصفیہ کی تیاری میں کچھ آسانیاں ہو گئیں۔ اس اثنا میں ڈاکٹر فیلن صاحب جو صوبہ بہار میں انسپکٹر مدارس تھے اُن کو بلا بھیجا اور اپنی اُردو اور انگریزی کی لغت کی تیاری میں ان سے مدد لینا چاہی۔ مولوی صاحب راضی ہو گئے اور فیلن کی ڈکشنری سات برس کی محنت شاقہ کے بعد ختم کی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا کام بھی کرتے رہے ۱۸۸۰ء میں انھوں نے مہاراجہ الور کا ایک سفرنامہ مرتب کیا۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ پنجاب کے سرکاری بکڈپو میں نائب مترجم کی حیثیت سے مقرر ہو گئے فیلن صاحب کی ڈکشنری کی تیاری کے زمانے میں انھوں نے اپنی کتاب ہادی النسا شائع کی جو

بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد ان کی حسب ذیل تصنیفات شائع ہوتی رہیں جو اپنے طرز میں سب نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ "تکمیل الکلام" پیشہ وروں کے اصطلاحات میں "تحقیق الکلام" اُردو زبان کے نکات کے متعلق "رس کھان" جس میں کچھ ہندی دوہے اور پہیلیاں اور گیت ہیں۔ "ریت بکھان" اہل ہنود کے رسم ورواج کے متعلق "ناری کتھا" ہندو عورتوں کی بولی۔ قواعد اردو۔ تعلیم نسواں اور عورتوں کے متعلق ان کی حسب ذیل کتابیں بہت مشہور ہیں۔ لغات النساء، تحریک النساء (لڑکیوں کی ریڈر) "بی راحت زمانی کا قصہ" عورتوں کو وقت کی قدر وقیمت سکھاتا ہے۔ "اخلاق النساء" بچوں کی پرورش اور تربیت کے متعلق "علم النساء زبان اور اُس کی ترقی کے متعلق "رسوم دہلی" جس میں دہلی کے مروجہ رسوم ورواج کا ذکر ہے۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں سیر شملہ جس میں شملہ کی تاریخ بھی داخل ہے۔ "اردو ضرب الامثال" "روزمرۂ دہلی" "رسوم اہل ہندوان دہلی" ان میں سے بعض اب شائع ہو رہی ہیں۔

فرہنگ آصفیہ

اس کتاب کی تیاری اور طباعت کی دقتوں اور پریشانیوں کے متعلق مصنف نے دیباچہ میں بہت طول دے کر لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اتنی بڑی تصنیف کے چھاپنے کے لیے ایک زرکثیر کی ضرورت تھی جس کی فراہمی سخت مشکل تھی۔ بالآخر خوش نصیبی سے ۱۸۸۸ء میں سر آسمان جاہ بہادر شملہ آئے جہاں مولوی صاحب بھی کسی اسکول میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب نے وزیر اعظم حیدرآباد کی خدمت میں حضوری حاصل کر کے اپنا مسودہ بطور نذر کے گزرانا جو سید علی بلگرامی کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور انعام کا وعدہ کیا گیا۔ جب ۱۸۹۲ء میں کتاب ختم ہوئی تو اس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا گیا۔ اور اس کے سلسلے میں مصنف صاحب کو حیدرآباد متعدد دفعہ جانا پڑا آخرکار وہ اپنی امیدوں میں کامیاب ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن اور پانچ ہزار انعام دیا گیا۔ اسی طرح گورنمنٹ پنجاب نے بھی اس کی قدر افزائی میں بہت کچھ حصہ لیا۔ فی الحقیقت یہ کتاب لغات اردو کی کتب میں ایک خاص درجہ امتیاز رکھتی ہے اور ایک بڑی تحقیقات اور جانکاہی کی یادگار ہے۔

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء
تعلیم اور ابتدائی مشاغل

مولانا شبلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور ترین وقابل ترین بزرگوں میں تھے نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ اگر کوئی شخص ایک شاعر۔ فلسفی۔ مؤرخ

ناقد۔ ماہر تعلیم۔ متکلم۔ واعظ۔ ریفارمر۔ جریدہ نگار۔ فقیہ۔ محدث سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انھوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم و فنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا اور اس شعر کے صحیح مصداق بن گئے تھے سہ وَلَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِی الْوَاحِدِ۔ مگر ان سب میں ادب، تاریخ اور ریسرچ میں ان کا رتبہ بہت بلند تھا۔ ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ حبیب اللہ (جو وکیل تھے) کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی۔ ابتدائی کتابیں مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے پڑھیں اور جب عربی و فارسی میں کچھ دستگاہ ہو گئی تو مولانا فاروق چریا کوٹی کے سامنے جو اس وقت غازی پور میں ہیڈ مولوی تھے اور فلسفہ و ریاضی و ادب وغیرہ کے استاد مانے جاتے تھے زانوئے شاگردی تہ کیا انھیں سے انھوں نے عربی ادب اور معقولات پڑھی تھیں۔ پھر جذبۂ شوق نے ابھارا اور تلاش علم کے واسطے وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اعظم گڑھ سے رامپور پہونچے جہاں استاد زمانہ مولوی عبد الحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین صاحب محدث سے حدیث و فقہ کے اسباق لئے۔ لاہور میں ادیب کامل مولوی فیض الحسن صاحب سے حماسہ پڑھا۔ وہاں سے سہارنپور آئے اور تکمیل حدیث مولوی احمد علی صاحب سے کی۔ ۱۸۷۶ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی عازم حج بیت اللہ ہوئے اور راستے میں فور شوق اور جوش عقیدت سے ایک پُر زور قصیدہ فارسی کہا۔ بعد فراغت حج اعظم گڑھ واپس آئے اور سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا۔ شوق کتب بینی کا یہ حال تھا کہ کتب فروشوں کی دکان پر بیٹھ کر اکثر کتابیں دیکھا کرتے تھے[۱]۔ اس زمانے میں رد و ہابیہ میں

---

[۱] مولانا میرے حال پر ایک خاص نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے مجھ کو ان کے اس استغراق کتب بینی کا ایک چشم دید واقعہ ادھر جسکا ذکر اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ منشی نثار حسین مرحوم اڈیٹر "پیام یار" مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھی اُنکی چوک میں عطر کی دوکان تھی۔ جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دوکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے۔ یہاں اکثر ارباب کمال کا مجمع ہوتا تھا جس میں مولوی عبد الحلیم شرر۔ شوق قدوائی۔ لڈن صاحب خورشید۔ ابو صاحب جلیس۔ سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور اور بے تکلف احباب جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھکر خوش گپیاں کرتے۔ وزیر تمبولی کی خوش ذائقہ گلے پان اور حسین بخش ساقی کے معطر حقے سے اسباب کی ضیافت کی باتی۔ کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈاٹے عینک لگائے آنکھیں مچاتے

(باقی حاشیہ صفحہ ٦٦ پر ملاحظہ ہو)

بھی کچھ رسالے لکھے جس میں "اسکات المعتدی" جو عربی میں ہے زیادہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے امتحان وکالت بھی پاس کیا تھا اور اعظم گڑھ اور بستی میں کچھ دنوں وکالت بھی کی تھی اور آخر کار جب اس پیشے سے جی بھر گیا تو سرکاری ملازمت بھی چند دنوں کی تھی اور کہیں کے امین ہو گئے تھے۔ چند دنوں کے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی اور اب ہمہ تن خدمت علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ملنے کے لیے جو علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے علیگڑھ جانے کا اتفاق ہوا یہاں بتوسط خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خاں سے ملے جن کے ذریعہ سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریاب ہوئے اور ایک درخواست فارسی پروفیسری کی جگہ کے واسطے جو اسوقت خالی تھی گزرانی۔ جو منظور ہو گئی اور کچھ دنوں شہر میں قیام کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے بنگلے کے قریب رہنے کو جگہ مل گئی۔

قیام علیگڑھ | علیگڑھ کالج کی اس زمانے کی فضا اُس گلِ سرسبد کی شگفتگی کے لیے بہت مفید ہوئی ارباب کمال مثلاً سرسیّد اور مولانا حالی وغیرہ کی صحبت اور سرسیّد کے کتب خانے کی قربت سے مولانا نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ علیگڑھ کے مشہور اسلام دوست پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہو گئی مولانا نے اُن سے فرنچ سیکھی اور ان کو عربی سکھائی جس طرح سے مولانا نے نکات تنقید بطرز اہل مغرب آرنلڈ صاحب سے حاصل کئے ہوں گے اسی طرح انصافاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کی اکثر باتوں کے لیے مولانا کے ممنون ہیں۔

ابتدائی تصانیف | غالباً علیگڑھ ہی میں مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کی قدیم شان و شوکت اور اکابر سلف کے زرّیں کارنامے قلمبند کئے جائیں۔ اس مبارک کام پر سرسید نے بھی انکی ہمت افزائی کی یہاں سرسید کا کتب خانہ موجود ہی تھا جس میں دور دراز مقامات مصر و شام تک کی مطبوعہ کتابیں

اور ہنستے اس جلسے میں شریک ہو جاتے اور اپنی پُر لطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے۔ ایکدن جبکہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی وقت، ۸ بجے شام چوک میں بڑا مجمع تھا تعزیے مع جلوس و باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے۔ شور و غل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی۔ سب لوگ اس سیر میں مشغول مگر مولانا ڈکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مقابلے میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی، اسقدر مشغول اور منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے یہانتک کہ پوری کتاب ایسی حالت میں دس گیارہ بجے تک ختم کر دی۔ مترجم

دستیاب ہوسکتی تھیں۔ ۱۸۸۴ء میں مثنوی صبح امید کا ستارہ مولانا کے افق تصنیف پر جلوہ گر ہوا۔ جس میں اسلام کی شان شوکت۔ موجودہ مسلمانوں کی نکبت شکلا کت۔ اور ان کے ابھارنے کے لیے سرسیّد کی کوششوں کا ذکر نہایت پرزور طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک زمانے میں اس قدر مقبول اور علیگڈھ کالج کے طلبا کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اسکو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے تھے۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" جو ۱۸۸۶ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں لطور ایڈریس پڑھی گئی تھی ۱۸۸۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی جس سے لوگوں کو مولانا کی تاریخی معلومات اور تبحّر علمی کا پورا پتہ معلوم ہوا۔ اب دنیائے تصنیف میں ان کی شہرت بہت بڑھ گئی تھی۔ اُن کے دل میں خیال آیا کہ ایک مکمل اور مفصل تاریخ بلاد اسلام اور خلفائے عباسیہ کی مرتب کی جائے اور اسکا نام "ہیروز آف اسلام" (مشاہیر اسلام) انگریزی کی تقلید میں رکھا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے "المامون" اور "سیرۃ النعمان" لکھی اور "الفاروق" شروع کرنے والے تھے کہ ۱۸۹۲ء میں سفر روم و شام اختیار کیا جس میں پروفیسر آرنلڈ بھی ان کے ہمراہ تھے اور انھوں نے قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی۔ اس سفر کی زیادہ تر غرض تھی کہ "الفاروق" کی تیاری کے واسطے صحیح اور معتبر ماخذ کا پتہ لگایا جائے نیز یہ بھی کہ بلاد اسلامی کی شان و شوکت اپنی آنکھ سے دیکھی جائے۔ سفر سے واپسی کے بعد ان کا "سفرنامہ روم و شام" نکلا جس میں پورے سفر کے حالات نہایت دلچسپ طریقے سے قلمبند ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں جب کہ سرسید کا انتقال ہو گیا تو مولانا بھی دل برداشتہ ہو گئے اور اپنا سلسلہ کالج سے منقطع کر لیا اور اعظم گڑھ گئے۔ اب وہ "الفاروق" کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور ایک قومی انگریزی اسکول کی ترقی میں بھی بہت کوشش کی جس کا افتتاح ۱۸۸۳ء میں ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں سفر کشمیر پیش آیا۔ مگر اتفاق سے وہاں مولانا بیمار ہو گئے اور اسی حالت میں "الفاروق" اختتام کو پہونچی۔

قیام حیدرآباد | مولانا کا سفر حیدرآباد نواب وقار الامرا کی وزارت کے زمانے میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ مولوی سید علی بلگرامی کی کوشش سے ناظم محکمۂ تعلیم بمشاہرہ دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے جب کہ

تین سو روپیہ ہوگیا تھا مولانا یہاں چار برس رہے اور اس زمانے میں انھوں نے محکمہ تعلیم میں بہت کچھ ترقیاں کیں اور اس کے ساتھ اپنا سلسلۂ تالیف و تصنیف بھی برابر جاری رکھا۔ سید علی بلگرامی نے جو سلسلۂ "کتب آصفیہ" کا جاری کیا تھا اُس میں مولانا کی لکھی بعض کتابیں شامل ہیں۔ اسی قیام حیدرآباد کے عرصہ میں جب کہ مولوی عزیز مرزا صاحب کا دور دورہ تھا مولانا نے حیدرآباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کھولنے کی اسکیم تیار کی تھی اور "الغزالی"، "سوانح مولانا روم"، "الکلام"، "علم الکلام" اور "موازنۂ انیس و دبیر" یہ سب اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔

ندوۃ العلماء | ندوۃ العلماء کا قیام ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں ہوا تھا اُس کے قیام کی غرض اصلی یہ تھی کہ عربی مدارس کے لیے ایک مفید نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھ کر بنایا جائے نیز یہ کہ مسلمانان ہندستان کے آپس میں یا اُن کی جماعتوں میں جو جو اختلافات ہیں وہ رفع کیے جائیں[1] اس عمدہ خیال کے محرک مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب مرادآبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جو اس کے بانی اور ناظم اول تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے اکابر قوم مثلاً سر سید۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب وقار الملک سو روپیہ ماہوار ندوہ کو اپنے پاس سے دیتے تھے پھر مولانا شبلی کی تجویز ہوئی کہ اس جماعت کے تحت میں ایک مدرسہ کھولا جائے جو ضروریات وقت کا لحاظ رکھ کے طلباء کو تعلیم دے سکے چنانچہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں

[1] مقاصد ندوۃ العلماء جو مسودہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری صفحہ کے پشت پر درج ہیں حسب ذیل ہیں:۔
(۱) نصاب تعلیم کی اصلاح اور علوم دین کی ترقی اور تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔
(۲) علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلافی مسائل کے ردو قدح کا پورا پورا انسداد۔
(۳) عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات اس سے علیحدہ ہیں۔
(۴) ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم قائم کرنا جس میں علوم و فنون کے سوا عملی صنائع کی بھی تعلیم ہوگی۔
(۵) دینی امور میں فتویٰ دینے کے واسطے محکمہ افتاء کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم اور مفتی ہوں گے۔

اسی تجویز کے موافق دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھول لیے گئے۔ اور ۱۸۹۹ء میں وسار شاہجہانپور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطریق وقف ندوۃ العلماء کو حاصل ہوئی جس کو ندوۃ العلماء نے ٹھیکہ پر دیا[1] اور مبلغ سات سو روپیہ سالانہ اس کی آمدنی سے ملتا رہتا ہے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بھی بنیاد ڈالی گئی جس میں تقریباً دس ہزار کتابیں داخل ہو چکی ہیں اور علاوہ مطبوعات یورپ، مصر، قسطنطنیہ، ٹونس، طہران وغیرہ کے تقریباً ایک ہزار کتابیں قلمی اور اکثر نادرالوجود ہیں جو مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا مصنفین کے قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں اور اُن پر نامور علماء کے دستخط موجود ہیں۔ اس نوبت پر ایک افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ سر انٹونی میکڈانل جو اس وقت ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے ندوہ کے سخت مخالف ہو گئے۔ اور اُس کو سیاسی سازشوں کا ایک آلہ کار سمجھ کر نگاہ شک سے دیکھنے لگے۔ مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے بعض رسائل بھی جو بہت پر جوش لہجے میں لکھے گئے تھے اسی وقت نکلے اور ندوہ کے مقابلے پر ایک جنگجو جماعت جدید قائم کیگئی جس کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے غرضکہ جب لاٹ صاحب ولایت چلے گئے تو مولانا شبلی حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلماء کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پبلک اور گورنمنٹ کے دلمیں جو بدگمانیاں اور شکوک اسکی طرف سے پیدا ہوگئے تھے ان کے رفع کرنے میں بڑی کوشش کی۔ اس کام میں کرنل عبدالمجید خاں صاحب نے بھی ان کی بڑی مدد کی۔ ندوہ کی مالی حالت اسوقت ایسی خراب ہوگئی تھی کہ اسکے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا مولانا نے اس کو درست کرنے کیلئے اکثر دیسی ریاستوں کا سفر کیا اور رامپور سے مبلغ پانچسو روپیہ سالانہ اور بھوپال سے مبلغ ڈھائی سو روپیہ سالانہ اعانتی رقمیں مقرر ہوئیں اسی طرح ہز ہائینس آغاخان نے پانچسو روپیہ سالانہ اور نواب صاحب بہاولپور کی جدہ ماجدہ نے پچاس ہزار روپیہ تعمیر عمارت کیواسطے عنایت کیے۔ گورنمنٹ نے ایک وسیع اور خوشنما قطعہ آراضی دریائے گومتی کے کنارے لکھنؤ میں

---

[1] دارالعلوم ندوۃ العلماء کی گزشتہ تاریخ" مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کی جو مالی حالت بیان کی گئی ہے اس سے ندوۃ العلماء کی آمدنی حسب ذیل معلوم ہوتی ہے:۔ (۱) بھوپال سے تین ہزار روپیہ سالانہ جو ماہ بماہ ملتا ہے (۲) بہاولپور سے وظائف کی مد میں تین سو روپیہ سالانہ (۳) مسلمانان مدراس سے تقریباً دو ہزار روپیہ سالانہ اس رقم سے طلباء غیر مستطیع کو مدد دیجاتی ہے (۴) دولت آصفیہ حیدرآباد دکن سے تقریباً سو روپیہ ماہوار دفتر کے خرچ کے لئے۔

دارالعلوم کے واسطے عطا فرمایا نیز چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد انگریزی زبان اور علوم دنیوی کے لیے بھی منظور فرمایا۔ سرجان ہیوٹ صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کا سنگ بنیاد ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو رکھا۔ اس طرح مولانا کی کوششیں بارور ہوئیں مگر آپس کی نزاعیں ہنوز قائم رہیں کیونکہ علما کا آپس میں متحد الخیال ہونا سخت مشکل کام تھا۔ وہ لوگ مولانا پر بوجہ ان کی آزاد خیالی کے پورا اعتماد نہیں رکھتے تھے اسی وجہ سے مولانا کچھ بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ سے چلے گئے اور اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اسی اثنا میں ایک نہایت افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا کی ٹانگ ایک اتفاقیہ گولی کے لگ جانے سے زخمی ہوئی اور آخرکار مجبور ہو کر اس کو کاٹنا پڑا۔

ندوہ نے جو خدمات ملک کی انجام دیں گو کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ابھی وہ تکمیل کو پہونچیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ بہت قابل تعریف ہیں۔ سب سے بڑا کام اس نے یہ کیا کہ قدامت پسند عالموں میں جو ضروریات زمانہ سے بے خبر تھے ایک بیداری پیدا کر دی اور انکو بھی اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان کا قدیم نصاب بدلکر موجودہ زمانے کی ترقیوں کے حسب حال بنایا جائے۔ انگریزی زبان بھی داخل نصاب کی جائے۔ غیر مفید کتابیں اور علوم موقوف کیے جائیں اور ادب عربی و فارسی اور حدیث و تفسیر کی تحصیل پر زیادہ زور دیا جائے۔ ندوہ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا قیمتی قلمی اور نیز ہزارہا مفید مطبوعہ کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجے کا

---

[1] عزیز محترم عالیجناب نواب صفی الدولہ سید علی حسن خان بہادر عرف علی میاں صاحب جن سے مولانا مرحوم سے ربط محبت و یگانگت بہت بڑھا ہوا تھا اور جن کی نظر سے یہ مضمون گزر چکا ہے فرماتے تھے کہ "قیام دارالمصنفین کے متعلق میں نے مولانا کو نیم راضی کر لیا تھا کہ لکھنؤ میں کھولا جائے مگر ان کی خواہش تھی کہ اُس کا تعلق ندوہ سے نہ ہو اور یہ ایک بالکل علیحدہ چیز رہے اس کے واسطے بعض مواقع لکھنؤ میں دیکھے گئے اور مولانا نے دو ایک جگہوں کو پسند بھی کیا۔ پھر مولانا بمبئی تشریف لے گئے میں بھی وہاں موجود تھا وہاں اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک موت کی خبر سنکر دفعتاً الہ آباد اُن کو آنا پڑا یہاں سے وہ بضرورت اعظم گڈھ گئے اور مجھ کو لکھا کہ دارالمصنفین یہاں قائم کرنے کا ارادہ ہے اس کے افتتاح میں تم بھی شریک ہو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنا باغ وغیرہ اس کے واسطے وقف کر دیا ہے اور بعض اور لوگوں نے اپنی جائدادیں دی ہیں میں نے کہا کہ بہت بہتر ہوتا کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں قائم ہوتا یہ سنکر فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے یہاں اس کو بالفعل رہنے دیجیے جب موقع آئے گا تو لکھنؤ میں منتقل ہو جائے گا۔

مولانا شبلی نعمانی

مولوی سعید انصاری

مولانا عبدالسلام ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی

مولوی ابوالحسنات ندوی

کتب خانہ قائم کیا۔ قرآن شریف کے صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھ میں لیا تھا مسلمانوں کے عہد حکومت ہندوستان سے متعلق جو تاریخی غلطیاں ناواقفیت سے لوگوں میں مشہور ہو گئی ہیں ان کو رفع کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے قانون وقف و میراث کے متعلق جو پیچیدہ مسائل قانونی اکثر پیش آجاتے ہیں ان پر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قائم کیا جس کا اثر ممالک دور دراز تک پڑا۔ ایک خاص رسالہ "الندوہ" بادارت مولانا شبلی و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شروانی نکالا گیا جس میں نہایت عمدہ اور قابلیت کے مضامین شائع ہوئے۔ مگر حق یہ ہے کہ مولانا کے انتقال سے ندوہ کو جو نقصان عظیم پہونچا اس کی تلافی اب بہت مشکل ہے۔

دار المصنفین اعظم گڑھ لکھنؤ سے واپسی کے بعد مولانا ہمہ تن اپنی محبوب اور مایۂ ناز تصنیف "سیرۃ النبی" کی تکمیل میں مصروف ہوگئے اور شعر العجم کا پانچواں حصہ بھی اسی وقت تمام کیا۔ مولانا چونکہ تالیف و تصنیف کے عاشقوں میں تھے لہذا مصنفین کی ایک جماعت قائم کرنے کا خیال جو بہت عرصہ سے ان کے دل میں جاگزیں تھا خدا کرکے وہ اب پورا ہوا جس کے واسطے انھوں نے اپنی ذاتی جائداد یعنے ایک مکان اور باغ اور نیز اپنا قیمتی کتب خانہ وقف کر دیا۔ اس کے علاوہ ندوہ میں ایک درجہ تکمیل بھی کھولا جس میں عربی و فارسی کے منتہی طالب علم ریسرچ کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

قابلیت اور خدمات کا اعتراف ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغہ مجیدی ان کو عنایت کیا تھا اور اسی کے قریب برٹش گورنمنٹ نے خطاب شمس العلماء عطا کیا۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف کمیٹیوں کے ایک معزز رکن تھے۔ مثلاً ترقی علوم مشرقیہ کی کمیٹی جو بمقام شملہ سر ہارکورٹ بٹلر کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ کمیٹی بابتہ نزاع مابین زبان اردو و ہندی اور کمیٹی اتحاد ہندو مسلم جس کو گورنمنٹ نے منعقد کیا تھا۔

اخلاق و عادات مولانا شبلی ایک نہایت سچے اور باعتبار خلیق و متواضع آدمی تھے۔ ان کی ایک زبردست شخصیت تھی۔ گفتگو نہایت شیریں اور دلچسپ و پُر از معلومات ہوتی تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ روپیہ کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اور جو کچھ ملتا تھا نہایت آزادی سے خرچ کرتے تھے۔

ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے۔

تصانیف | مولانا کی تصانیف بہت کثرت سے ہیں۔ جن میں حسب ذیل مشہور ہیں سیرۃ النبی (صرف ۲ جلدوں کی تکمیل کر سکے) شعر العجم پانچ حصے۔ الفاروق۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔ الغزالی۔ الکلام علم الکلام۔ سوانح مولانا روم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ اورنگ زیب عالمگیر الجزیہ۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔ تاریخ اسلام و فلسفہ اسلام۔ حیات خسرو۔ تنقید جرجی زیدان۔ مقالات شبلی۔ مکاتیب شبلی۔ رسائل شبلی۔ (نظم میں)، دیوان شبلی اور دستۂ گل۔ مثنوی صبح امید مجموعۂ نظم اردو۔

مولانا بحیثیت مؤرخ کے | مولانا کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی قدیم شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید میں پیش کیا اور ایسے دلچسپ طریق سے لکھا کہ عوام و خواص سب اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں اور ہر نظر میں وہ نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ اس کی تالیف میں انتہا کے تجسس و تلاش اور عمیق مطالعہ سے کام لیا اور جدید طرق تنقید کے موافق غیر معتبر اور بیکار چیزوں کو ترک کیا۔ الفاروق۔ المامون۔ الغزالی۔ سیرۃ النعمان۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔ اور علی الخصوص ان کی معرکۃ الآرا تصنیف یعنی سیرۃ النبی جس کو انھوں نے ناتمام چھوڑا ایسی یادگار تصانیف ہیں جو ان کے تبحر علمی، وسیع تحقیق، عمیق مطالعہ، اور بے حد کد و کاوش کا پتہ دیتی ہیں۔

مولانا بحیثیت ناقد کے | مولانا علاوہ جلیل القدر مورخ کے ایک زبردست ناقد بھی تھے۔ شاعر شیریں مقال ہونے کے ساتھ قوت انتخاب۔ ذوق سلیم۔ رائے صائب بھی اعلیٰ درجے کی رکھتے تھے۔ اگر کسی شخص کو زمانۂ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جا سکے تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہیے۔ جس کی یکتائی پر پروفیسر براؤن ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے۔ یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اس کی اکثر غلطیاں نکالی گئیں اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جا رہی ہے مگر پھر بھی ہمارے نزدیک کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحر علمی میں اس سے کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ کتاب مذکور نظم فارسی کی

ایک مکمل تاریخ ہے اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان میں ہے "موازنۂ انیس و دبیر" بھی ایک بہت بیش بہا تصنیف ہے۔ اور گو کہ اس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابیں اس کے جواب میں نکلیں مگر پھر بھی اس کی اکثر باتیں کارآمد اور صحیح ضرور ہیں۔ آرٹیکل اور مضمون نگاری میں بھی مولانا ایک ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی اس قسم کی تحریریں نہایت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں کیونکہ اسمیں نہایت مفید اور کارآمد باتیں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے مکاتیب بھی بہت دلچسپ ہیں جس سے اُنکے ذاتی حالات اور نیز اُنکے معاصرین اور اس زمانے کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ "مقالات شبلی" اور "رسائل شبلی" اُنکے اخباری مضامین کا اور "مکاتیب شبلی" اُنکے خطوط کا مجموعہ ہے۔

طرز تحریر مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحت کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُنکی عبارت میں کبھی گنجلک نہیں ہوتی۔ اُس میں ایک خاک چمک اور تڑپ ہوتی ہے۔ سر سید مرحوم مولانا کو اُن کے طرز تحریر پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو لکھنؤ اور دلی دونوں کیلئے باعث رشک ہو۔ مولانا کے یہاں صنایع بدایع اور عبارت میں تکلف بہت کم ہوتا ہے۔ اور گو کہ اکثر جگہ فصاحت در زور بیان مضمون میں چار چاند لگا دیتا ہے پھر بھی نفس مطلب نہایت واضح رہتا ہے۔ یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ مختلف انواع تحریر کیلئے مولانا اسی کے مناسب حال انداز بیان بھی اختیار کرتے ہیں۔ بعض تکلف پسند طبیعتوں کو مثلاً وہ جن کی زبان کو آزاد کی اُردو کا چٹخارہ ہے ممکن ہے کہ مولانا کا رنگ روکھا پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو مگر کاروباری نثر کا وہ بے مثل نمونہ ہے۔ جو کہ دور موجودہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

جیسا کہ لکھا گیا مولانا کا مرتبہ بحیثیت ایک مورخ اور ناقد کے بہت بلند ہے انھوں نے اسلامی تمدن کی توسیع و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ اُن میں ہم نیشنلزم کی نئی روح جلوہ گر دیکھتے ہیں اور یہ ان میں سب سے بڑا کمال ہے کہ علوم مشرقی کو وہ مغربی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ندوۃ العلماء کے روح رواں اور دارالمصنفین کے بانی تھے۔ اپنے زمانے کی نمایاں ہستیوں و بلند شخصیتوں میں تھے اور دراصل انھیں کی روحانی برکت ہے جو دارالمصنفین کی مساعی جمیلہ کی کامیابی کا باعث ہے۔ اُنکے لائق شاگردوں سے ابدالآباد تک ان کا نام روشن رہے گا۔

سید سلیمان ندوی | مولانا سید سلیمان صاحب مولانا شبلی کے جانشین علوم مشرقی اور عربی و فارسی کے
جیّد فاضل ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم اُن سے اپنی زندگی میں بہت محبت کرتے اور ایک خاص نظرِ شفقت
وعنایت اُن پر رکھتے تھے۔ اور اسی وقت وہ اپنی ذہانت و قابلیت و طباعی سے اُن کے اور شاگردوں سے
ممتاز تھے۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی روایات کو جاری رکھا اور بالفعل انھیں کی نگرانی اور اہتمام میں
حلقہ دار المصنفین عربی اور فارسی کی نایاب کتابوں سے ترجمہ و تالیف کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے
وہ المعارف کے ایڈیٹر بھی ہیں جو زبان اُردو کا مشہور مجلّی علوم اہل اسلام کی اشاعت کے لیے مخصوص
ہے اور اس کے مضامین سے اُن کی مضمون نگاری اعلیٰ قابلیت اور تحقیق علمی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا
دار المصنفین اور معارف دونوں کی روح رواں ہیں۔ انھوں نے بلاد اسلامی اور یورپ کا سفر بھی کیا
ہے۔ اور سیرۃ النبی کا بقیہ حصّہ اُسی شان و شوکت سے ختم کیا ہے۔ سیرۃ العائشہ۔ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ
وغیرہ آپ کی مقبول اور مفید تصانیف سے ہیں۔

مولانا سلیمان صاحب کے علاوہ مولانا حمید الدین۔ مولانا عبد الباری۔ مولانا عبد الماجد
دریا آبادی۔ پروفیسر نواب علی اور مولانا عبد السلام۔ دار المصنفین کے پرجوش اور معزز ارکین ہیں
مولانا حمید الدین صاحب علاوہ انگریزی کے زبان فارسی و عربی کے مستند فاضل اور علم القرآن اور
ادب عربی میں ایک خاص بصیرت رکھتے ہیں۔ مولوی عبد الباری نے برکلے کے فلسفہ کا بہت سلیس
ترجمہ اُردو میں کیا ہے اور بعض فلسفیانہ تصانیف بھی اُن کی ہیں۔ مولوی عبد السّلام اور مولوی
عبد الماجد کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں۔

اس موقع پر یہ لکھنا بےمحل نہ ہوگا کہ شعبہ دار المصنفین اپنے سامنے ایک درخشندہ مستقبل رکھتا ہے
اور اگر اس نے اپنی موجودہ رفتار ترقی جاری رکھی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اردو کی تکمیل میں
یہ بہت بڑا حصّہ لے گا۔ مگر ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھمات سے
احتراز کرے تاکہ تمام بہی خواہان اُردو کو اس سے سچّی ہمدردی رہے۔ اور اس طرح یہ بھی نہ چاہیے کہ
تمام مغربی و دیگر علوم مشرقیہ سے قطع نظر کر کے اپنی توجہ صرف علوم اسلامی کی نشر و اشاعت پر محدود رکھے

مولوی عبدالسلام ندوی | مولوی عبدالسلام صاحب کی ذات پر دار المصنفین کو جس قدر ناز ہو کم ہے۔
وہ وقتاً فوقتاً معارف میں نہایت اعلیٰ درجے کے مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ سیرت عمر بن عبد العزیز
اسوۂ صحابیات، شعر الہند حصہ اول و دوم۔ ابن یمین۔ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ سنا ہے کہ مولانا شبلی
کی زندگی کے حالات بھی مرتب کر رہے ہیں مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئے۔ شعر الہند میں جو نظم اردو کی
ایک بسوط تاریخ ہے اُن اثرات و حالات کو جو مختلف اوقات میں نظم اردو پر مترتب ہوئے ہیں مفصل اور
نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب
کو تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب
کا نام اسم غیر مسمیٰ ہے نیز اس میں بعض ضروری باتوں میں فرد گزاشتیں بھی ہو گئی ہیں اور اکثر اُن لوگوں کا ذکر
بھی نہیں جنھوں نے زبان اُردو کی ترقی میں بہت کوششیں کی ہیں۔ ان اعتراضات کا یہ جواب دیا جا سکتا
ہے کہ اس کتاب میں نظم اُردو کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ بہر حال کچھ بھی ہو کتاب کارآمد اور مفید
ضرور ہے اور مثل مولوی حکیم عبد الحی صاحب مرحوم کے گل رعنا کے جو قدیم طرز کا تذکرہ ہے اس میں بعض
خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔

مولوی عبدالماجد دریا آبادی | مولوی عبدالماجد صاحب بی، اے، دریا آبادی خلف الصدق مولوی عبدالقادر
ڈپٹی کلکٹر مرحوم سنہ ۱۸۹۳ء آپ کا سال ولادت ہے۔ ابتدائی عربی اور فارسی تعلیم سے گھر پر فراغت کر کے
زبان انگریزی سیتاپور ہائی اسکول میں پڑھنا شروع کی اور انٹرینس پاس کر کے کیننگ کالج لکھنؤ میں
داخل ہوئے جہاں سے سنہ ۱۹۱۲ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی پھر درجہ تکمیل پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز
کے لیے علیگڈھ کالج میں داخل ہوئے مگر والد کے انتقال کے سبب سے وہاں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر سکے
لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں مشغول ہو گئے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ
یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے تعلق ہو گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ تعلق ترک کر دیا گو اب بھی گورنمنٹ
نظام کے وظیفہ خوار ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے کچھ نہ کچھ ادبی کام کرتے رہتے ہیں۔ مولانا
سیاسیات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور سیاسی حلقوں میں ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں

ہفتہ وار اخبار "سچ" آپ کی ادارت میں نکلتا ہے۔

مولانا کو ادبی دنیا میں ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ کتب ذیل آپ کی تصانیف سے مشہور ہیں فلسفہ جذبات۔ فلسفہ اجتماع۔ تاریخ اخلاق یورپ مکالمات برکلے یعنی برکلے کی مشہور کتاب "ڈائیلاگز" کا اُردو ترجمہ۔ پیام امن۔ بحر المحبت (مثنوی مصحفی) زود پشیمان (ناٹک) سائیکالوجی آف لیڈرشپ (انگریزی میں) تصوف و اسلام۔ فلسفیانہ مضامین (اس میں وہ چند مضامین داخل ہیں جو الناظر میں چھپے تھے) مولانا کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہے اور فلسفیانہ کتابیں و مضامین نہایت سلیس اور دلچسپ اردو میں لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے آپکے انگریزی کے ترجمے نہایت صاف بامحاورہ اور رنگین ہوتے ہیں۔ مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" جو غیر مطبوعہ تھی، آپنے نہایت محنت اور عرق ریزی سے چھپوائی اور اس پر ایک مفید اور بلیغ مقدمہ لکھا ہے۔ آپ کبھی کبھی اپنے مقررہ مسلک یعنی فلسفہ و تصوف اور سنگین اصناف سخن سے ہٹ بھی جاتے ہیں اور تفنن طبع کے طور پر ہلکی و سبک چیزوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اسی آخر الذکر صنف میں آپکا ڈراما "زود پشیمان" ہے جو ہر چند کہ اسٹیج کے لائق نہیں مگر پڑھنے میں بہت لطیف اور دلچسپ ہے۔ آپکو شعر گوئی میں بھی کافی شہرت حاصل ہے گو کہ کم کہتے ہیں مگر جس قدر کہتے ہیں زیادہ تر متصوفانہ رنگ میں ہوتا ہے۔ موجودہ اخبارات و رسائل مثلاً معارف الناظر۔ اُردو۔ ہندوستانی ریویو۔ ماڈرن ریویو۔ وغیرہ یہ سب آپ کے اعلیٰ مضامین کے مرہون منت ہیں آپ کے مضامین معلومات سے پُر ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتدال پسندی اور پختگی اور علمیت آپکے کلام کا خاص جوہر ہے۔ قوت تنقید آپکو خدائے تعالیٰ نے بہت اعلیٰ درجے کی دی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ بالفعل آپ ملفوظات مولانا روم کو شایع کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپکی ذات ادب اُردو کیلئے باعث فخر ہے اور آپ کی تصانیف سے زبان کو خاص فوائد پہونچتے رہتے ہیں۔

جدید علوم کی ترویج
دلّی کالج کا قیام

دلّی کالج کے قیام سے جدید علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں خاص مدد ملی بقول مسٹر اینڈریوز کے "انیسویں صدی کے شروع میں جو ایک عجیب و غریب علمی روشنی

چمکی تھی اس کی وجہ زیادہ تر نئے نئے انگریزی علوم وفنون تھے جن کی تعلیم نے ہندوستانیوں کے واسطے ایک بالکل طلسمی منظر پیش کر دیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیندہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوگا۔ دلّی کالج میں جو کیمسٹری اور فزکس (کیمیا و طبعیات) کے نئے نئے تجارب طلبا کو دکھائے جاتے تھے ان سے وہ بغایت مسرور بلکہ مبہوت ہو جاتے تھے اور نہیں کہہ سکتے تھے کہ آیندہ وہ کیا دیکھیں گے۔ وہ بے تکلف خیال کرتے تھے کہ ہم لوگ ایک جدید دور کے باقی ہیں اور ترقی اور انکشافات کے وہ خواب دیکھا کرتے تھے۔ اس جدید علمی نور نے اس عہد کو منوّر کر دیا تھا جسمیں سلطنت مغلیہ کے دور آخر کا گرد و فراو رشان شکوہ بھی کچھ شامل تھے مگر یہ روشنی تھوڑے عرصہ تک قائم رہ کر بجھ گئی اور اسکے فنا ہونیکے اسباب میں غدر ۱۸۵۷ء کو بھی بڑا دخل ہے ۔"

دلی کالج ۱۸۲۸ء میں ایک درجہ انگریزی کا بھی کھل گیا تھا اور باوجود انگریزی سے سخت مخالفت کے طلبا کی تعداد کم نہ تھی۔ ۱۸۳۱ء کے رجسٹروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کالج میں تین سو طالب علم انگریزی پڑھتے تھے۔ اسکول اجمیری دروازہ کے قریب تھا مگر جب وہ ترقی کر کے کالج ہوا تو کشمیری دروازہ اور دریائے جمنا کے قریب آگیا۔ ۱۸۴۳ء میں اسکول اجمیری دروازہ سے منتقل ہو کر شاہی کتب خانہ میں آگیا۔ چونکہ جدید تعلیم سے لوگوں میں منافرت اور مخالفت پھیلی ہوئی تھی لہذا اسوقت طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ اچھے اچھے وظائف انہیں انگریزی کا شوق پیدا کرنے کے واسطے انکو دیے جاتے تھے۔ کالج میں مغربی علوم کے ساتھ ایک مشرقی صیغہ بھی تھا۔ ریاضی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ ادب اور زبان انگریزی کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے مگر مغربی علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ تھے۔ تعلیم زیادہ تر لکچروں کی مدد سے ہوتی تھی نہ کہ کتابوں سے کیونکہ کتابیں دور دراز مقامات سے آتی تھیں اور دقت سے ملتی تھیں اور ظاہر ہے کہ اسوقت جدید علوم کی کتابوں کے ترجمے بھی نہیں ہوئے تھے۔ لکچروں کو طلبہ نہایت شوق سے سنتے تھے۔ نئے نئے ریاضی کے مسائل سیکھ کر اور جدید تجارب کیمیاوی و برقی و مقناطیسی اپنی آنکھوں سے دیکھکر ان کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ ہم بالکل ایک نئی علمی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ پروفیسر رامچندر جو ایک زبردست شخصیت رکھتے تھے اور

مسٹر ٹیلر پرنسپل کالج اور پنڈت اجودھیا پرشاد جو دلی کے کشمیری پنڈت اور اسسٹنٹ پروفیسر تھے طلبہ کی تعلیم و ترقی میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ مشرقی صیغہ میں عربی و فارسی کی تعلیم زبان اردو کی ساطت ہوتی تھی اور یہ صیغہ طلبہ میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے بڑے زباندان و ماہر کالج میں فارسی پڑھاتے تھے ٹیلر صاحب و مولوی امام بخش صہبائی دونوں غدر میں مارے گئے۔

دلی کالج سے پڑھ کر مشہور لوگ نکلے جنھوں نے زبان اردو کی آیندہ توسیع و ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا مثلاً مولوی نذیر احمد۔ ماسٹر پیارے لال آشوب۔ مولانا آزاد۔ مولانا حالی۔ اور مولوی ذکاء اللہ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ دنیاوی ترقیاں بھی ان میں سے بعض نے بہت کیں چنانچہ مولوی شہامت علی ریاست اندور کے وزیر اعظم ہو گئے اور ڈاکٹر مکند لال شمالی ہند میں نہایت مشہور و معروف زمانہ حال کے طرز کے ڈاکٹر گزرے ہیں، ڈاکٹر چمن لال عیسائی ہو گئے تھے اور غدر میں مارے گئے۔ ۱۸۴۲ء میں دلی کالج کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن کھولی گئی جس کی روح رواں پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی تھے اس انجمن کی قابل ستائش کوششوں سے اکثر مفید کتابیں تیار ہوئیں جو دلی میں چھپیں اور طلبہ کے بہت کام آئیں ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی سے اور بعض فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں۔ دلی کی تقلید میں اور شہروں میں بھی مثلاً آگرہ اور لکھنؤ اور بنارس میں اسی قسم کی کتابیں تیار ہوئی تھیں جو انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں ان کے نام بلوم ہارٹ نے اپنی مرتبہ فہرست میں دیے ہیں۔ اسی قسم کے تراجم اور تالیفات سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا کہ نثر اردو بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو کر اس قابل ہو گئی کہ اُس میں کاروباری دنیا کی باتیں لکھی جائیں اور غیر زبانوں سے کارآمد ترجمے کیے جاویں۔ ۱۸۶۴ء میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب نے دلی میں ایک اور ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی جس کے وہ خود سکریٹری تھے۔ اس سوسائٹی کے انتظام میں بہت سے مفید لکچر دیے گئے اور نثر اُردو کا چراغ گو کہ ٹمٹماتا رہا مگر بجھا نہیں۔ آشوب ہی کی توجہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری اختیار کی اور انھیں نے مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزیں ترجمہ کر کر کے دیں تا کہ وہ ان کو اردو کا جامہ پہنائیں پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی کے مختصر حالات علیحدہ لکھے جاتے ہیں۔

پروفیسر رامچندر | یہ قدیم دلّی کالج میں ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے۔ ٹیلر صاحب پرنسپل کالج کے میل جول اور اثر سے عیسائی ہوگئے تھے۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے قدیم دلّی کالج کے انگریزی اسکول میں سب سے پہلے تعلیم پائی تھی۔ بہت ذکی اور ذہین آدمی تھے انھوں نے ریاضی کا ایک نیا مسئلہ دریافت کیا تھا جس کی وجہ سے ان کو اہل یورپ کے مشہور مہندسوں میں شہرت حاصل ہوگئی تھی مولوی نذیر احمد۔ مولانا آزاد۔ مولوی ذکاراللہ وغیرہ ایسے مشہور لوگ ان کے شاگرد تھے۔ مولوی ذکاراللہ کو علم ریاضی سے خاص مناسبت تھی اس وجہ سے وہ پروفیسر رامچندر کے بہت محبوب شاگرد تھے۔ اور اسی وجہ سے ان دونوں میں ایک فنّی محبت اور ارتباط عمر بھر قائم رہا۔

پروفیسر رامچندر کی نسبت لکھا ہے کہ نہایت بے خوف۔ راست باز۔ راسخ الاعتقاد شخص تھے۔ چونکہ ہندو مذہب چھوڑ کر عیسائی ہوئے تھے لہٰذا تمام تعلقات ذات و برادری کے منقطع ہوگئے تھے اور بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑی تھیں اور اسی وجہ سے مزاج میں ایک قسم کی سختی اور خشونت پیدا ہوگئی تھی جو کبھی کبھی مباحثے اور مناظرے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی مگر پھر بھی رحم دل اور معاملے کے پکّے تھے غدر کے زمانے میں ان کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ ایک شاگرد نے اس سے ان کو مطلع کیا۔ چنانچہ وہ کچھ دن ایک مکان میں چھپے رہے بعد کو بھیس بدل کر نکل گئے کچھ دنوں بعد جب شہر میں امن و امان ہوگیا تو واپس آئے اور انہی کوشش سے اپنے بعض دوستوں کو بھی شہر میں بلوالیا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب ریاست پٹیالہ کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوگئے تھے وہ "تذکرۃ الکاملین"، کے مصنف ہیں جس میں روم اور یونان کے مشہور فلاسفروں اور شعرار کے مختصر حالات انگریزی اور عربی کتابوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۴۵ء میں چھپی تھی بعد کو ۱۸۴۸ء میں مطبع منشی نولکشور میں چھپی۔ اس میں بعض انگریزی شعرار اور فلسفی بعض فارسی شعرار اور بعض مشہور اہل ہند مثلاً والمیک۔ شنکر اچالج اور بھاسکر جوتشی کے حالات بھی درج ہیں۔ یہ پروفیسر صاحب "اصول علم ہیئت" اور "عجائب روزگار"، کے بھی مصنف ہیں۔ یہ کتابیں ۱۸۴۷ء و ۱۸۴۸ء میں تیار ہوئی تھیں انکی زبان بہت صاف اور سلیس ہے اور ان کے نثر کے نمونے مولوی غلام یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب

"سیر المصنفین" میں دیے ہیں۔

مولوی امام بخش صہبائی صہبائی قدیم دلّی کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاقی جرأت کے آدمی تھے۔ زبان فارسی میں ان کو کمال حاصل تھا اور اُس زمانے میں کہ جب کہ فارسی کا دور دورہ تھا اک خاص عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے سر سید مرحوم کو "آثار الصنادید" کی تصنیف میں بہت مدد دی تھی۔ طلبہ میں بہت ہر دلعزیز تھے اور اُن کی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پر بڑا اثر تھا۔ فن شعر میں استاد مشہور تھے اور قلعہ کے اکثر شاہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے متعدد کتابیں اُن سے یادگار ہیں۔ زمانہ غدر میں مارے گئے اور اُن کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

مولوی غلام امام شہید مولوی غلام امام شہید شاہ غلام محمد کے بیٹے انیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے لکھنؤ کے نامبرآوردہ شاعروں میں ہیں چونکہ نعت بہت کہتے تھے اس وجہ سے مدّاح نبی اور عاشق رسول کے لقب سے مشہور ہیں قتیل و مصحفی سے اصلاح لیتے اور فارسی نظم و نثر میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی کے شاگرد تھے۔ الہ آباد میں پیشکار تھے ملازمت سے دستکش ہونیکے بعد ریاست حیدرآباد سے ایک معقول رقم بطور وظیفہ کے آخر عمر تک ملتی رہی۔ نواح لکھنؤ، حیدرآباد دکن، مرادآباد۔ رامپور اور آگرہ میں کثرت سے شاگرد چھوڑے۔ سر سالار جنگ اول، نواب کلب علی خاں اور دیگر روسا عہد ان کی بڑی عزت کرتے تھے "مجموعہ میلاد شریف" "انشائے بہار بے خزاں" اور چند قصائد و غزلیات ان سے یادگار ہیں۔ تاج گنج آگرہ کا حال پرانے رنگ کی نثر میں انھوں نے خوب لکھا ہے

منشی غلام غوث بیخبر خواجہ غلام غوث بیخبر کا اصل وطن کشمیر تھا جہاں ان کے بزرگ معزز عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان کے والد خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبّت اور وہاں سے نیپال آئے جہاں خواجہ غلام غوث کی ولادت سنہ ۱۲۲۴ھ میں ہوئی۔ یہ اپنے والدین کے ساتھ بہت کم سنی میں جب کہ انکی عمر صرف چار برس کی تھی بنارس آئے یہاں کچھ قدیم رنگ کی تعلیم حاصل کر کے سنہ ۱۸۴۱ء میں اپنے ماموں خان بہادر

مولوی سید محمد خاں کی ماتحتی میں جو نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی تھے ملازم ہوگئے وہ لارڈ النبرا گورنر جنرل کی ہمراہی میں قلعہ گوالیار کی جنگ میں بھی شریک ہوئے تھے اور بعد اختتام جنگ ایک اعزازی خلوت سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ اپنے ماموں کے انتقال کے بعد ان کے عہدہ میر منشی پر فائز ہوئے جہاں عرصہ دراز تک نہایت قابلیت کے ساتھ خدمات منصبی انجام دیکر ۱۸۸۵ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ خواجہ صاحب کو علاوہ خطاب خان بہادری کے بہت سے انعامات اور خلعت اور طلائی تمغہ قیصر ہند سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ مرزا غالب کے بڑے دوستوں میں تھے چنانچہ مرزا کے اکثر دلچسپ خطوط ان کے نام "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" میں موجود ہیں "فغان بیخبر" اور "خوننابہ جگر" اُن کی گرانبہا تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بہت کبر سنی میں انتقال کیا۔ ان کی تقریظ شہید کی "بہار بیخزاں" پر پرانے طرز و رخوشامدانہ رنگ میں ہی۔ خواجہ صاحب عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے مگر تقریظوں وغیرہ میں وہی قدیم رنگ برتتے یعنے مقفیٰ اور مسجع عبارت فارسی کی تقلید ہیں۔

شمس العلما سید علی بلگرامی

شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی۔ بلگرام کے ایک مشہور خاندان کی آپ یادگار تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے بہت معزز و ممتاز تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستان میں ایک نمایاں شہرت اور قابلیت سے تعلیم ختم کرکے تکمیل کیلئے انگلستان گئے جہاں آپنے ہندوستان سے بھی زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ آپکے اخراجات سفر کے متکفل سر سالار جنگ بہادر تھے آپ کو مختلف زبانیں سیکھنے کا خاص شوق تھا چنانچہ عربی و فارسی و سنسکرت میں کامل مہارت حاصل کرنیکے علاوہ یورپ کی مختلف زبانیں اور نیز ہندوستان کی اکثر زبانیں مثلاً بنگلہ مرہٹی تلنگی خوب جانتے تھے۔ آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی مشہور کتب "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" سے ہے۔ جس میں اول الذکر فرنچ مستشرق لیبان کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ آپنے ایک ڈاکٹری کتاب کا بھی ترجمہ کیا ہے علاوہ تصنیف و تالیف کے آپ علیگڈھ کالج کے معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے آپ

مذکورۂ بالا دونوں کتابوں کی وجہ سے مصنفین زبان اُردو کی صف اول میں جگہ پانیکے مستحق ہیں کیونکہ یہ دونوں کتابیں علمیت اور قابلیت کے علاوہ آپکی قدرت زبان پر پوری گواہی دیتی ہیں۔

سید حسین بلگرامی

آنربیل نوبیل نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سی۔ آئی۔ ای۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مذکورۂ بالا کے برادر بزرگ ہیں اور گو کہ علمی اور ادبی قابلیت میں چھوٹے بھائی بڑے بھائی پر فوقیت رکھتے ہوں مگر پبلک اور سیاسی زندگی میں نواب صاحب کو ڈاکٹر صاحب موصوف پر یقیناً فضیلت حاصل ہے آپ ایک عرصۂ دراز تک حیدر آباد دکن میں دولت آصفیہ کے اکثر معزز عہدوں پر ممتاز رہ کر سکریٹری آف اسٹیٹ ہند کی کونسل میں منتقل ہو گئے۔ افسوس ہے کہ آپ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی معرکۃ الآرا یادگار نہیں چھوڑی صرف چند مضامین اور وہ ایڈریس جو علیگڈھ ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھے گئے تھے اور "رسائل عماد الملک" کے نام سے چھپ گئے ہیں ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں یہ کتاب تقریباً چار سو صفحہ کی ہے اور اسکے اکثر مضامین سے علی الخصوص ترقی تعلیم کے مضامین سے آپکی قیمتی رائیں بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ "ہوا اور پانی" کا مضمون علی الخصوص بہت عمدہ اور قابل قدر ہے اور سائنٹفک ہونے کے باوجود غیر ضروری اصطلاحات سے پاک ہے۔ دائرۃ المعارف کا قیام جس کا مقصد کمیاب اور مفید عربی کتابوں کا شائع کرنا تھا آپ ہی کی مبارک کوششوں کا نتیجہ ہے آپنے بہت کچھ وقت قرآن شریف کے انگریزی ترجمے پر بھی صرف کیا مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہا۔

مولوی عزیز مرزا

مولوی عزیز مرزا بی، اے اس زمانے کے نہایت قابل اور مشہور نثاروں میں شمار کئے جاتے تھے ۱۸۸۸ء میں علیگڈھ کالج سے بی، اے کی ڈگری حاصل کر کے حیدر آباد میں ملازمت اختیار کی یہاں مختلف جگہوں پر رہنے کے بعد ہوم سکریٹری کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے یہ نہایت قابل تعریف بات ہے کہ وہ اپنے عہدے کے اہم فرائض منصبی کی انجام دہی میں بھی تنا وقت نکال لیتے تھے جس کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور مشاغل علمیہ میں صرف ہوتا تھا۔ تصانیف حسب ذیل ہیں:- (۱) نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن کے انگریزی سفر نامہ انگلستان کا ترجمہ جو "گلگشت فرنگ" کے نام سے مشہور ہے (۲) شاہان بہمنی کے مشہور وزیر خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں کے

شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی

مولوی محمد عزیز مرزا بی اے۔ ایم آر اے ایس

حالات زندگی موسوم بہ "سیرۃ المحمود" (۳) کالیداس کا مشہور ڈراما "وکرم اروسی" کا اردو ترجمہ جس کے شروع میں فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں سنسکرت ڈراما کی اصل اور نوعیت کے متعلق بہت سی مفید باتیں لکھی ہیں۔ ان کو پرانے سکے جمع کرنے کا بھی شوق تھا چنانچہ انکا مجموعہ سکہ جات بہت اعلیٰ درجے کا خیال کیا جاتا تھا۔ اکثر جرائد اور اخبارات میں جو مضامین لکھتے تھے وہ "خیالات عزیز" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔ ان کو بھی علیگڈھ کالج کی ترقی بلکہ عموماً مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری ہو گئے تھے جسمیں نہایت ہوشیاری اور قابلیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ طرز تحریر نہایت سلیس اور دلکش ہے۔ بیجا لفاظی اور تطویل سے بہت بچتے ہیں۔ اپنے زمانے کے مشہور نثر نگاروں میں خیال کیے جاتے تھے۔

مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو

زمانۂ موجودہ کے مشہور افاضل اور مصنفین میں مولوی عبدالحق صاحب قابل مدیر رسالہ "اردو" اور آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کا اسم گرامی خاص طور پر نمایاں ہے۔ سچ پوچھیے تو جس قدر زبان اردو کی ترویج و ترقی اس وقت دکن میں ہے وہ آپ ہی کی ذات بابرکات کی بدولت ہے۔ آپ ہی انجمن مذکور کے روح رواں اور آپ ہی کے ہاتھ میں اس کے کل کاروبار کی عنان ہے۔ انجمن نے آپ ہی کے زیر ہدایت و سرپرستی نہایت مفید اور عمدہ کتابیں خواہ از قسم تالیف یا تراجم بکثرت شایع کی ہیں اور اکثر مطبوعات انجمن پر مفید اور فاضلانہ مقدمے اور دیباچے ہیں وہ آپ ہی کے رشحات قلم کے نمونے ہیں جن سے آپ کی تحقیقات علمیہ اور معلومات کا پورا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ جو مضامین آپ رسائل وغیرہ میں لکھتے رہتے ہیں وہ بھی نہایت موقر اور پُر از معلومات ہوتے ہیں۔ الحق آپ کی آپ کی ذات ہمارے لیے بہت غنیمت اور یقیناً آپ کی شخصیت بہت زبردست ہے۔ آپ نے تمام عمر ادب اردو کی خدمت میں

سلہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن عکسی تصاویر اور نقشوں کے ساتھ مصنف مرحوم کے لائق فرزند کی طرف سے نظامی پریس بدایوں سے حال میں شایع ہوا ہے۔ ۱۲

صرف کردی اور اسی کی بدولت ہم کو آج یہ دن نصیب ہوا کہ صدہا پرانے قلمی نسخے جو گوشۂ گمنامی میں بڑے پڑے ضایع ہو جاتے آج زیب قرطاس ہو کر ہماری آنکھوں کو روشن کر رہے ہیں اور قدیم تاریخ نظم و نثر اردو سے جسقدر ہم اس وقت بہرہ مند ہیں وہ کبھی زیادہ تر آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہی ایک عرصہ دراز تک آپنے نظام گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم میں کام کیا۔ مثل اکابر سلف کے آپ حد درجہ منکسر المزاج اور خاموش کام کرنے والوں میں ہیں اور اسی وجہ سے اپنی زندگی کے حالات تک نہ دینے سے گریز فرماتے ہیں۔ قوت نقد آپ میں بہت زبردست ہے آپ کی تنقیدات ہمیشہ غیر جانبدارا او منصفانہ ہوتی ہیں۔ اردو نثاروں میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور سب سے بڑی خوبی آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ کبھی عمدہ ہندی الفاظ کو نہیں چھوڑتے بلکہ ان کو اپنی عبارت میں نہایت خوبی اور استادی کے ساتھ کھپاتے جاتے ہیں۔ البتہ آپ کی عبارت کا مثل مولانا آزاد وغیرہ کے کوئی خاص طرز نہیں۔ جو لوگ آزاد کے طرز اور انکی شوخیوں کو پسند کرتے ہیں انکو ضرور آپ کی عبارت روکھی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوگی مگر اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ آپ کو زبان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی تحریر کا رنگ اگر کسی سے ملتا ہے تو وہ مولانا حالی ہیں بلکہ زمانہ حال کی ضروریات اور جدت طرازیوں کا لحاظ رکھا جائے تو ان پر آپ سبقت لیگئے ہیں علاوہ دیگر کمالات کے جس سے آپ متصف ہیں سب سے بڑی صفت آپ میں یہ ہے کہ آپ نے اس عہد میں اپنے اثر سے لوگوں کے دلونمیں زبان کا خاص شوق پیدا کر دیا ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم

مثل مولوی عبدالحق صاحب کے مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم بھی زمانہ موجودہ کے نامور نثاروں اور محسنین زبان اردو میں ہیں۔ آپ مشہور خاندان سادات سے ہیں جنھوں نے پانی پت میں توطن اختیار کر لیا تھا جہاں آپ کے پدر بزرگوار حاجی مولوی فریدالدین صاحب کو شاہ شرف بوعلی قلندر کے مزار پر انوار کی تولیت کا شرف حاصل تھا۔ مولوی صاحب موصوف ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے لاہور گئے جہاں آپ نے ادب عربی کی تکمیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کی اور معقول و منقول مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھا۔ زبان انگریزی میں انٹرنس کا امتحان

مولوی عبدالحق بی-اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو

پاس کیا اور فارسی میں منشی فاضل کا درجہ حاصل کیا۔ ابتدا میں قانون کی طرف کچھ میلان خاطر تھا مگر اس خیال کو ترک کر کے ریاست بھاولپور میں صیغہ تعلیم میں کوئی جگہ حاصل کی جہاں کچھ عرصہ تک قیام کر کے رامپور ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ کے قدر دان و مربی جنرل عظیم الدین خان کے قتل کا ناگوار واقعہ پیش آیا تو ترک تعلق کر دیا۔ کچھ دنوں اپنے وطن پانی پت میں مطب بھی کھولا تھا اور ایک دواخانہ بھی قائم کیا تھا اس کے بعد مولانا حالی کی وساطت سے سر سید مرحوم کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ وہ آپ کو دیکھکر بہت خوش ہوئے اور آپ کی وجاہت اور قابلیت کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا سلیم صاحب سر سید کے پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے اور عام طور پر انکی تصنیفات اور مضمون نگاری میں اعانت کرنے لگے۔ سید صاحب کے ساتھ انکے مرتے دم تک رہے۔ اس کے بعد اپنا رسالہ "معارف" نکالا جو کچھ عرصہ تک کامیابی سے چلا پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے علیگڈھ گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر ہو گئے مگر تھوڑے دنوں بعد بوجہ علالت کے اس کو ترک کر دیا اسکے بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر ہوئے مگر مسجد کانپور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے کی وجہ سے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی پھر اخبار زمیندار کے اسٹاف میں بحیثیت جائنٹ اڈیٹر داخل ہوئے لیکن جب اسکی ضمانت ضبط ہو گئی تو ان کو بھی اپنے تعلقات اخبار سے منقطع کرنا پڑے۔ انکی مضمون نگاری اور ترجمہ کی شہرت نے حیدر آباد کے دار الترجمہ کی طرف انکو گھسیٹا جہاں انکی مشہور کتاب "وضع اصطلاحات" تصنیف ہوئی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو پہلے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اردو مقرر ہوئے مگر چار برس کے بعد پورے پروفیسر ہو گئے۔

آپ کا طرز تحریر نہایت زوردار سلیس اور معنی خیز ہے کہیں کہیں آپ جذبات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ آپ اس زمانے کے اکثر مشہور جرائد اور رسائل میں مفید مضامین لکھتے رہتے ہیں علی الخصوص آپکے مضامین "تلسی داس کی شاعری"، "اردو دیوالا" اور "عرب کی شاعری" جو رسالہ "اردو" میں چھپے تھے نہایت اعلی درجے کے اور قابل پڑھنے کے ہیں۔ ایک بڑی صفت آپکی تحریر میں یہ ہے کہ آپ غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کے زیادہ شائق نہیں بلکہ مثل مولانا حالی کے ہندی کے شیریں الفاظ

سُریلے الفاظ اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ آپکی قابل قدر تصنیف "وضع اصطلاحات" نہایت مفید اور اعلیٰ درجے کی کتاب ہے جس سے آپکے تبحر علمی اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اسمیں زبان اُردو کی اصل کا نہایت غور سے مطالعہ کیا گیا ہے اور جدید سائنٹفک اور ٹکنیکل الفاظ و محاورات وضع کرنے کیلئے نہایت مفید قواعد قائم کیے ہیں[۱۵]۔

شیخ عبدالقادر | شیخ عبدالقادر صاحب زبان اور ادب اُردو کے مستقل محسنوں میں ہیں۔ اب سے تقریبًا باون ترپن برس پیشتر لدھیانہ میں پیدا ہوئے جہاں آپکے اسلاف قانون گویوں کے معزز خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین لدھیانہ کے محکمہ مال ملازم تھے۔ جس وقت اُن کا انتقال ہوا شیخ صاحب کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ زمانہ طالب علمی نہایت ناموری اور کامیابی سے ختم کرکے سنہ ۱۸۹۴ء میں فورمین کرسچین کالج لکھنؤ سے بی، اے کی ڈگری اوّل درجے میں حاصل کی جسکے بعد پنجاب "آبزرور" کے اڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۸۹۸ء میں چیف اڈیٹر ہوئے سنہ ۱۹۰۴ء میں اخبار سے تعلق ترک کرکے بیرسٹری کے واسطے انگلستان روانہ ہوئے جہاں حسب معمول تین برس رہے اور اسی عرصہ میں ولایت کے اکثر مشاہیر سے ملنے اور پبلک معاملات کو بغور مطالعہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ بعد حصول ڈگری اکثر ممالک یورپ اور بلاد اسلامی کا سفر کیا جس سے معلومات میں اضافہ اور خیالات میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ہندوستان واپس آکر پہلے دہلی میں کام شروع کیا تھا مگر دو برس بعد لاہور آگئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل اور پبلک پراسیکیوٹر مقرر ہوئے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ عہدہ ترک کرکے لاہور میں پھر بیرسٹری شروع کی اور اب ان کا شمار درجہ اول کے بیرسٹروں میں ہونے لگا سنہ ۱۹۲۱ء میں ہائیکورٹ کے جج عارضی طور پر ہوئے اور پھر ایک سال تک اڈیشنل جج بھی رہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر ڈپٹی پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ بھی ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیمات مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۲۶ء میں لیگ اقوام کے ساتویں اجلاس مقام جنیوا میں ہندوستان کیطرف سے بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ ان مناصب جلیلہ اور ادبی خدمات سے

---

[۱۵] افسوس ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہوگیا۔ ۱۲

صاف ظاہر ہے کہ جس قدر امیدیں آپ کے کامیاب زمانہ تعلیم میں آپ کی ذات سے وابستہ تھیں وہ سب پوری ہوئیں۔

شیخ صاحب کو زبان اُردو کے ساتھ ایک خاص عشق ہے جب آپ انڈر گریجویٹ تھے تو آپنے اسی زمانے میں ایک سلسلہ لکچر زبان انگریزی میں زمانہ حال کے اُردو شعرا اور نثاروں پر دینا شروع کیا تھا جو ۱۸۹۸ء میں کتاب کی صورت میں شایع ہوا اور پبلک میں بہت مقبول ہوا۔ پنڈت بشن نرائن در آنجہانی نے بھی اُس کی بڑی تعریف کی تھی گو کہ اُس کے بعض نتائج اور رایوں سے اُن کو اختلاف بھی تھا۔

۱۹۰۱ء میں اُردو کا مشہور و معروف ماہواری رسالہ "مخزن" جاری ہوا جس نے ادب اُردو کی نہایت بیش بہا اور قابل قدر خدمات انجام دیں اور فی الحقیقت ہماری زبان پر اُسنے اپنا سکہ جما دیا اس رسالہ کے اکثر مضمون نگاروں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۱ء تک شیخ صاحب ہی اُسکے ایڈیٹر تھے بلکہ ۱۹۲۰ء تک وہی اُسکے آنریری ایڈیٹر رہے۔ اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوے کہ کتاب کی صورت میں شایع ہو کر داخل کورس ہوئے ۱۹۱۷ء میں شیخ صاحب نے "اُردو کانفرنس" کے اجلاس کلکتہ میں صدارت کی تھی اور بالفعل آپ "انجمن ارباب علم لاہور" کے صدر ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی

پنڈت صاحب ۱۸۷۶ء بمقام فیض آباد پیدا ہوے جہاں آپ کے والد پنڈت کنہیا لال زتشی پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ آپ کے والد کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہو گیا ۱۸۹۴ء میں آپنے بی، اے کی ڈگری کیننگ کالج لکھنؤ سے حاصل کر کے ۱۸۹۷ء میں امتحان ٹرننگ نہایت عزت کے ساتھ پاس کیا۔ پہلے کسی اسکول میں ٹیچر ہوئے پھر ۱۹۰۲ء میں امتحان ایم اے سے فراغت کر کے (جس میں آپ اوّل ہوئے تھے) ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۰ء تک ٹریننگ کالج الہ آباد کے پروفیسر رہے اور اسی عرصہ میں آپ اکثر مضامین انگریزی ہندوستان ریویو کو

اور اُردو مضامین زمانہ، ادیب، اور کشمیری درپن کو بھیجتے رہے ۱۹۱۶ء میں ہیڈ ماسٹری کے بعد انسپکٹر مدارس ہوئے ایک سال رجسٹرار بنارس یونیورسٹی اور ایک سال پرنسپل ٹریننگ کالج الٰہ آباد بھی آپ رہ چکے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں لوکل گورنمنٹ کے انڈر سکریٹری اور ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے واسطے قائم مقام اسسٹنٹ ڈائرکٹر صیغہ تعلیم رہے۔ بالفعل آپ جوبلی کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ گلدستۂ آذر اور "ایجوکیشن ان برٹش انڈیا" (تعلیم برٹش انڈیا میں) آپ کی تصانیف سے ہیں۔ اس کے علاوہ آپنے مرزا غالب اور چکبست وغیرہ پر نہایت فاضلانہ مضامین بھی لکھے ہیں اور اکثر ادبی مباحثوں میں نہایت ذوق و شوق سے حصہ لیا ہے آپ کو کتب بینی کا بیحد شوق ہے اور ناقد بھی آپ اعلیٰ درجے کے ہیں آپ کے ریویو نہایت منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں کبھی کبھی آپ نظم اُردو کے پرانے رنگ سے ناراض ہوکر زمانۂ حال کے زبردستی کے شاعروں کی خوب خبر لیتے ہیں۔

منشی دیا نراین نگم دنیائے جریدہ نگاری میں منشی دیا نراین نگم کے نام سے کون ناواقف ہے ۱۸۸۲ء میں بمقام کانپور ایک معزز کایستھ خاندان میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا منشی شیو سہائے صاحب ایک مشہور وکیل اور وائس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ تھے۔ نگم صاحب ۱۸۹۹ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی سال اپنا مشہور پرچہ "زمانہ" نکالا جو اب تک بفضلہ نہایت کامیابی سے جاری ہے ۱۹۱۲ء میں "آزاد" جاری کیا جو چند روز روزانہ رہکر اب ہفتہ وار ہوگیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں آپ آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔

بالفعل آپ مختلف مصروفیتوں کے مرکز ہیں جس میں معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی، اخباری، غرضکہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتیں شامل ہیں۔ سوشل رفارم (اصلاح معاشرت) کے معاملات میں آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال۔ اور سیاسیات میں آپ اعتدال پسند ہیں تعلیمی اور ادبی مشاغل میں خاصکر آپ کو توغل ہے اور بحیثیت ایک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے نوجوانوں کے لیے خضر طریقت ہیں کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھیں اور آپ کی کامیابی سے سبق حاصل کریں۔

شیخ عبدالقادر بی-اے- پی-ایچ-ڈی

لالہ سری رام صاحب ایم-اے-مؤلف خمخانۂ جاوید

آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے "زمانہ" کی بہبودی اور ترقی میں صرف کردی اسی وجہ سے وہ عرصہ
زائد بیس سال سے اس نمایاں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ "زمانہ" ہمارے صوبہ کا بہت
پُرانا ماہوار رسالہ ہے اور اس کا شمار اب اُردو کے اُن مخصوص چند پرچوں میں ہے جو فی الواقع زبان
کی سچّی خدمت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قابل ہندو اور مسلمان دونوں
بلا تفریق مذہب و ملّت مضامین لکھتے ہیں اس کی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں اور اس میں
معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہیں جو اپنے اصابت رائے کیواسطے
مشہور رہیں۔ خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہیں نہایت جچے تُلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے
ہیں مگر ہم کو افسوس اور شکایت ہے کہ اُن کے مضامین سے پرچہ زیادہ تر فیض یاب نہیں ہوتا۔ منشی صاحب
ہندوستانی اکاڈیمی کے ایک پُرجوش اور سرگرم ممبر بھی ہیں۔

لالہ سری رام دہلوی ایم۔ اے

لالہ سری رام صاحب ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی شہرت
اور عظمت کے واسطے یہ کیا کم ہے کہ اس کا سلسلہ جا کے اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل سے مِل جاتا ہے
لالہ صاحب کے آباؤ اجداد سلاطین مغلیہ کے عہد میں ہمیشہ معزز و ممتاز رہے ہیں۔ آپ کے پدر بزرگوار
آنریبل رائے بہادر مدن گوپال صاحب ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا کے اسم گرامی سے دلّی اور لاہور کا بچّہ
بچّہ واقف ہے اور آپ کے عم نامدار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب کو کون نہیں جانتا
کہ ایک مشہور و معروف استاد اور ماہر فن تعلیم صوبہ پنجاب میں گزرے ہیں اور خواجہ الطاف حسین حالی و مولوی
محمد حسین آزاد کے معاصر اور دوست تھے۔ لالہ صاحب موصوف ۱۸۷۵ء میں دلّی میں پیدا ہوئے اور
وہیں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے بارہ برس کی عمر میں والد کے ہمراہ لاہور گئے۔ ۱۸۹۵ء میں بی
اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۹۶ء میں ایم۔ اے اور منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے
اور لاہور امرتسر دلّی وغیرہ کی کرسی منصفی کو چند سال تک زینت دیتے رہے مگر دمہ کے موذی مرض
میں مبتلا ہو جانے سے ۱۹۰۷ء میں سرکاری ملازمت ترک کرنا پڑی اور علمی مشاغل اور اپنی

وسیع ریاست کے اہتمام و انتظام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آپ ایک اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ نہایت خوش تقریر خلیق اور ملنسار واقع ہوئے ہیں اور آپ کا خاندان ہمیشہ سے علم و فضل امارت و سخاوت اور پبلک خدمات کے واسطے ضرب المثل ہے اور اُس پر مولانا جامی کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

این سلسلہ از طلائے ناب ست　　　این خانہ تمام آفتاب ست

تذکرہ ہزار داستان المعروف بہ خمخانۂ جاوید

لالہ سری رام صاحب اس عدیم المثال تذکرہ کے مصنف ہیں جو افسوس ہے کہ اب تک اتمام کو نہیں پہونچا یعنے اس کی چار ضخیم جلدیں چھپ گئی ہیں اور تقریباً چار ہی ابھی باقی ہیں۔ یہ شعراء اُردو کے حالات کا خزانہ اور اُنکے منتخب کلام کا مجموعہ ہے اور اس کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اسکے ترتیب اور تدوین میں کسقدر وقت اور روپیہ صرف ہوا ہوگا اور کسقدر تحقیق و تلاش اور کسقدر محنت کرنا پڑی ہوگی۔ اسکی ابتدا کے حالات فاضل مصنف نے جلد اوّل کے دیباچہ میں مفصّل طور پر بیان کیے ہیں اسکی چار جلدیں سنین ذیل میں شایع ہوئیں یعنے جلد اول سنہ ۱۹۰۶ء جلد دوم سنہ ۱۹۱۰ء جلد سوم سنہ ۱۹۱۵ء اور جلد چہارم سنہ ۱۹۲۶ء میں اس لاجواب تذکرہ کو اگر معلومات کی کان کہیں تو بجا ہے اور اگر اس کو تاریخ الشعرا کی جان سمجھیں تو زیبا ہی اسنے صدہا بھولے بھٹکے شاعروں کو روشناس خلق کیا جسمیں بعض ایسے بھی ضرور ہیں کہ جنکا کلام ہم تک نہ پہونچتا تو کوئی زیادہ حرج نہ تھا۔ انداز بیان اسکا اسقدر متین اور مہذب ہے کہ اچھوں کا تو ذکر کیا بُروں کو بھی اچھا کر دکھایا ہے۔ بعض جگہ کچھ غلط بیانیاں بھی ہوگئی ہیں مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کو شاعر دکھایا ہے اور ان کا تخلص اشتیاق بتایا ہے جس کی غلطی سے مولانا حالی نے متنبہ کر دیا۔ اسی طرح تعشق کو انس کا بیٹا بتایا اور اس غلطی کو منشی احسن مرزا اشرؔ لکھنوی نے اپنی فاضلانہ تقریظ میں درست کر دیا مگر انسان انسان ہے اور الانسان مرکب من الخطاء والنسیان مشہور ہے۔ فاضل مصنف نے انتخاب کلام میں واقعی کمال دکھایا ہے کہ ہر شاعر کے صرف چوٹی کے اشعار منتخب کیے جو فی الواقع

بڑی سلامتی مذاق اور اصابت رائے کی دلیل ہے۔ عبارت اسقدر سلیس اور بامحاورہ فصیح و بلیغ کہ چشم بد دور کہنے کو جی چاہتا ہے اور مضامین اس درجہ اعلیٰ وارفع کہ نور علیٰ نور کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اتمام و اختتام کے بعد یہ تذکرہ بے نظیر بے عدیل الحق ہوگا اور نظم اردو کا انسائیکلوپیڈیا یعنے قاموس الاعظم کہلائے جانے کا بیشک مستحق ہوگا اور کیوں نہو یہ قابل مصنف لالہ سری رام صاحب کی عمر بھر کی محنت اور ہمارے عہد کی بہترین ادبی خدمت ہے تمام تذکرہ نویس اس زمانے کے اسکے مرہون منّت اور خوشہ چین ہیں اور سب سے بڑھکر مولف کتاب ہذا بالیقین ہے۔ اگر کسی کو تقریظوں کی بہار اور ریویو کے لآلی آبدار دیکھنا ہوں تو وہ اس کی جلدوں کے آخری صفحات پڑھے اور دیکھے کہ کن کن لوگوں نے کس کس انداز اور کس کس ادا سے نظم و نثر دونوں میں کیا کیا گلفشانیاں اور سحر بیانیاں کی ہیں۔ ہمارے نزدیک اتنی کثرت سے اور اتنے اعلیٰ درجے کے ریویو کسی ایک کتاب پر ہرگز نہ ہوے ہوں گے لالہ سری رام صاحب نے ۱۸۹۵ء میں دیوان انورا اور ۱۹۰۲ء میں مہتاب داغ اور ضمیمۂ یادگار داغ بھی نہایت عمدگی سے شایع کیا تھا ظاہر ہے کہ ایسے جامع تذکرہ کی فراہمی کے واسطے کتنی کتابیں کتنے صرف کثیر سے جمع کرنی پڑی ہونگی ع درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا۔ اسیوجہ سے موصوف کا کتب خانہ جس میں اکثر نادر قلمی کتابیں اور تصاویر بھی ہیں دیکھنے کے قابل ہے۔ اور آپ بالفعل اسی ادبی فضا میں بکمال فراغت ایک قابل رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور خواجہ حافظ کے اس شعر کے کم ازکم دوسرے مصرع کے ضرور مصداق ہیں[۱] ؎

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے　　　دو یار زیرک واز بادۂ کہن دو منے

دیگر نثّاران اُردو موجودہ زمانے میں اُردو نثّاروں اور ناقدان سخن کی اتنی کثرت ہے کہ ان تمام اصحاب کے مختصر حالات لکھنا بھی تطویل کا باعث ہوگا۔ لہٰذا یہاں بعض ارباب ادب کے صرف نام بتائے جاتے ہیں۔ اُن کے مفصل حالات مع موجودہ شعرا کے ذکر کے ایک دوسری کتاب میں جو ہم تیار کر رہے ہیں انشاءاللہ ضرور جگہ پائیں گے۔

[۱] نہایت افسوس سے سنا جاتا ہے کہ تھوڑے عرصہ سے لالہ سری رام صاحب سخت علیل ہیں خدا انکو صحت جلد عنایت کرے

(۱) پنڈت بشن نراین در آنجہانی۔ اُردو کے بڑے مبصر ہونے کے علاوہ شاعر شیریں سخن بھی تھے ادب اُردو پر اُردو اور انگریزی دونوں میں نہایت فاضلانہ تنقیدی مضامین لکھتے رہتے تھے علی الخصوص وہ مضامین جو سرشار کے متعلق ہیں۔ اور شیخ عبدالقادر کی کتاب "نیو اسکول آف اُردو لٹریچر" (جدید اُردو) پر جو فاضلانہ تقریظ لکھی ہے نہایت دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔

(۲) مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی ڈپٹی کلکٹر زمانہ حال کے نہایت خوش گو شاعر اور قابل سخن سنج ہیں اُن کے مضامین میر و سودا سے ہم نے بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ کلام نہایت سلیس صاف اور زوردار ہوتا ہے۔

(۳) احسن مارہروی فن تنقید میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں دیوان دلی کو نہایت قابلیت سے ایڈٹ کیا کتاب "اُردو لشکر" بھی ان کی تصنیف ہے جس میں نظم اُردو کی درجہ بدرجہ ترقی کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے خیالات آزاد اور زبان زوردار ہوتی ہے مگر بعض اوقات ذاتیات کی بحث سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہمارے نزدیک احتراز کرنا چاہیے۔

(۴) حامد اللہ افسر رشید احمد صدیقی۔ سید مسعود حسن رضوی اور جلیل احمد قدوائی یہ سب بانِ اُردو کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور ناقد ہیں۔

(۵) اسی طرح پروفیسر نامی۔ پروفیسر ضامن علی الہ آباد یونیورسٹی کے لکچرار اُردو بھی ادب اُردو میں بڑی بصیرت رکھتے ہیں۔

(۶) حسرت موہانی۔ نظم اُردو اور فن تنقید کے ایک استوار ستون ہیں۔ مضامین گو کہ مختصر لکھتے ہیں مگر اوریجنل اور بہت طبیعت داری کے ہوتے ہیں۔

(۷) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کثیر التصانیف ہیں مختلف مضامین پر صفائی اور سلاست سے مگر عام رنگ میں لکھتے ہیں۔

(۸) سلطان حیدر جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہیں جن کے مضامین سے الناظر کے صفحات کو زیب و زینت ہوتی ہے۔

(۹) سید سجاد حیدر یلدرم نثر افسانہ نما بہت خوب لکھتے ہیں۔ عبارت بہت دلفریب اور اسمیں ایک خاص نشتریت ہوتی ہے۔ ترکی جانتے ہیں۔ اور ایک ترکی ناول اور ایک ترکی ڈرامہ موسوم بجواز رم شاہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہی۔ اُنکا مجموعہ مضامین "خیالستان" مشہور ہے۔

(۱۰) مولانا ظفر علی خاں ادبی اور اخبار نویسی کی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ زبردست مضمون نگار اور محسن زبان ہیں۔ اُنکے اکثر تصانیف انجمن ترقی اُردو کے ذریعہ سے چھپ چکی ہیں۔ سیاسی مضامین لکھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔

(۱۱) مولانا ہاشمی فرید آبادی۔ ادبائے دکن میں خاص طور سے ممتاز ہیں۔ تصانیف بکثرت رکھتے ہیں۔

(۱۲) مہدی حسن بہت اچھے لفظی مصوّر اور صاحب طرز تھے۔ اُنکی کتاب افادات مہدی مشہور ہے افسوس کہ نوجوانی کی موت نے اُنکی ہونہار زندگی کو قطع کرکے آئندہ اُمیدوں کا خاتمہ کردیا۔

جدید نثر اُردو کے دو طرز زمانۂ حال میں نثر اُردو اتنی کثیر الاشکال ہے اور ادیبوں نے اسقدر علیحدہ علیحدہ طرز انشا اختیار کیے ہیں کہ اُن سب کا استقصا اور اُن پر رائے زنی کرنا دشوار ہی لہذا ہم یہاں صرف دو طرزوں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

پہلا طرز۔ عربی اُردو اور اسکے مقابلہ میں بھاشا آمیز اُردو اکثر لوگوں کا میلانِ طبع اس طرف ہے کہ عبارت میں مشکل و غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کیے جائیں تاکہ عبارت شاندار اور دقیع معلوم ہو۔ ممکن ہی کہ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی ہو کہ سرسید اور انکے رفقا اور مقلدین انکی تقلید میں نہایت سیدھی سادی مگر زور دار عبارت لکھنے کے عادی ہوگئے تھے۔ بعد کو بعض جدت پسند طبائع کو وہ روکھی پھیکی بدمزہ معلوم ہونے لگی تو اسمیں رنگینیت اور علمیت کی چاشنی پیدا کرنے کیلئے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ گویا اس طرز کو سرسید مرحوم کے طرز کا ردعمل کہنا چاہیے ہمارے خیال میں اس طرز کے مخترع مولانا ابو الکلام آزاد ہیں جنھوں نے اپنے مشہور اخبار الہلال میں اسکو بہت برتا مولانائے موصوف مذہب اور سیاسیات پر بڑے زبردست لکھنے والوں میں ہیں اور خود اُنکی تحریروں میں اس قسم کی خرابیاں اور لغزشیں نہیں ہوتیں جو اُنکے مقلدین کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جن کی

عبارتیں سوائے تسلسل لفاظ کے کوئی خوبی نہیں رکھتیں۔ یہ طرز تحریر اُس جماعت کو نہایت پسند آیا جو چاہتے ہیں کہ اہل اسلام کے مختص علوم مثلاً فقہ تفسیر حدیث وغیرہ کی نشر واشاعت ہو اور اس ذریعہ سے لوگوں میں مذہبی جذبات پیدا ہوں۔ اس کے بالمقابل اور اُسی کے جواب میں ایک فرقہ نے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرنا شروع کئے مگر غنیمت ہے کہ اس قسم کی تحریریں خواہ وہ کیسی ہی نیک نیتی پر محمول ہوں ایک مختصر جماعت تک محدود ہیں۔ اور بہی خواہانِ اُردو نے اس بدعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے

دوسرا طرز۔ خیالی یعنے ٹیگوری اُردو

طرز مذکورہ بالا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا طرز بھی مروج ہے جو خیالی اُردو کہا جاتا ہے۔ اسکو ٹیگوری اُردو بھی کہہ سکتے ہیں اسوجہ سے کہ یہ رابندر ناتھ ٹیگور کے اس طرز کا تتبع ہے جو انھوں نے اپنی تصانیف گیتان جلی وغیرہ میں اختیار کیا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ ٹیگور اور بعض مشہور انگریز انشا پردازوں کا حقیقی تتبع نہیں بلکہ اُن کے کلام کی محض نقل ہے جسمیں ان لوگوں کے محاسن کلام مطلق نہیں پائے جاتے۔ یہ نقال نہ تو اصلی تصوف سے واقف ہیں اور نہ اُنمیں حقیقی تخیل کی روح ہی ایسے لوگوں کی انشا پردازی سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر بالکل خام ہوتی ہے۔ اسمیں کسی قسم کا ادبی حُسن نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر مبالغہ آمیز و مطلق العنان اور سطحی ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات تو وہ مجذوب کی بڑسے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ان غیر منسلک پوتوں کو بسا اوقات اُنکے صناع قیمتی سچے موتی خیال کرتے ہیں۔ بعض وقت اس قسم کی تحریریں غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہونچ جاتی ہیں اس قسم کی نثر کی ابتدا افسانہ نویسی سے ہوئی۔ اس سے لوگوں کو بہت لطف آنے لگا اور نئی معلومات کے راستے کُھل گئے۔ مضامین میں وسعت اور تنوع اور عبارت میں ایک خاص شان اور رنگینی اس سے پیدا ہوئی۔ صاحب تحریر بے تکلف صاحب طرز بن بیٹھے اور اپنے مفروضہ شاعرانہ خیالات اور شاعرانہ انداز کو بلا عروض کے جھنجھٹ کے نثر کی صورت میں اکڑ اکڑ کر دکھلانے لگے تاکہ لوگ اُن کو نثار شاعر سمجھنے لگیں۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ کبھی تو عبارت عربی الفاظ اور ترکیبوں کا مجموعہ بن گئی کبھی جدت کے واسطے نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں تراشی گئیں اور کبھی ایک خاص زور اور انداز پیدا کرنے کے واسطے

معمولی صرفی نحوی ترکیبیں الٹ پلٹ کر عبارت ایک طرفہ معجون بنائی گئی مضامین میں بھی علیٰ ہذا القیاس
عجیب و غریب تغیرات ہوئے کبھی ان میں جدت اور رنگینی پیدا کرنے کے واسطے مشرقی اور مغربی (رومی
اور یونانی) دیو مالا چھائی گئی کبھی نیچر کی بے جان چیزیں جاندار تصور کر کے اسقدر جوش و خروش اور ایسے
مصنوعی شاعرانہ جذبات کے ساتھ اُن سے تخاطب کیا گیا کہ بعض اوقات اُس کو پڑھ کر یا سُن کر
بے اختیار ہنسی آتی ہے اور وہ ایک جھوٹی نمائش اور شعبدہ بازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ایسے
مضامین اور ایسی عبارت البتہ ایک استاد کے قلم سے تو فی الواقع رنگ و حسن و موسیقیت کا جلوہ زار
بن سکتی ہے مگر نو آموزوں کے ہاتھ میں وہ محض ایک گھروندا بن کر رہ جاتی ہے جسمیں سوائے الفاظ
کے معنے کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

پرانی اخباری دنیا | ۱۸۳۶ء میں پریس کو آزادی ملی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی
باقر حسین نے اُردو اخبار دلّی سے جاری کیا جو حقیقت میں اخبار یعنے خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا تھا بلکہ
ایک ادبی پرچہ تھا جس میں اکثر اوقات ذوق و غالبؔ و مومن اور دیگر معاصر شعرا کی غزلیں اور کبھی کبھی
ہم طرح غزلیں بھی درج ہوتی تھیں۔ کبھی اس میں زبان اور محاورات کی بحث ہوتی تھی ذوق کی وفات
کی تاریخیں اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ بھی اس میں چھپا تھا۔ گورنمنٹ اسکی سرپرستی کرتی تھی ۱۸۵۰ء
میں منشی ہرسکھ رائے نے جو ایک بھٹ نگری کایستھ تھے لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ برٹش انڈیا اور
دیسی ریاستیں دونوں میں بہت مقبول تھا مہاراجگان کشمیر و پٹیالہ اس پرچہ کی اور نیز اس کے
مالک کی بڑی قدر کرتے تھے پہلے وہ ہفتہ وار تھا مگر بعد کو ہفتہ میں دو مرتبہ اور پھر تین مرتبہ نکلنے
لگا۔ آخر میں اس کا زوال ہو گیا اور انھیں لوگوں کے ہاتھوں ہوا جنھوں نے اس میں کام سیکھا تھا یا
اس کے رقیب دوسرے پرچے نکالنا شروع کیے۔ منشی نولکشور صاحب بھی اس کے اسٹاف میں کام
کرتے تھے پھر شعلۂ طور اور مطلع نور کانپور سے۔ پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے۔ اشرف الاخبار
دلّی سے۔ وکٹوریہ اخبار سیالکوٹ سے قاسم الاخبار بنگلور سے کشف الاخبار بمبئی سے۔ کارنامہ لکھنؤ سے
اور جریدۂ روزگار مدراس سے نکلے اور چند دنوں کے بعد اکثر ان میں سے بند ہو گئے۔ اودھ اخبار

جس کو منشی نولکشور صاحب نے ۱۹۵۸ء میں جاری کیا تھا اب بھی نکلتا ہے۔ بلکہ اس کا شمار ہمارے صوبے کے اعلیٰ درجے کے اور مشہور روزانہ اخباروں میں ہے۔ شروع میں جب منشی صاحب موصوف کے زمانے میں یہ اخبار نکلتا تھا تو یہ زیادہ تر اُن خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے تاروں یا نوٹوں سے ترجمہ کرکے چھاپی جاتی تھیں اور اس کی کوئی معینہ پالسی کبھی نہ تھی سوائے اسکے کہ سیاسی شورش کے یہ ہمیشہ خلاف تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اُسکے بعد روزانہ ہوا۔ اس کا ساز و سامان و اسٹاف اعلیٰ درجے کا تھا۔ اسی کا ہمعصر شمس الاخبار تھا جو مدارس سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مسلمانوں کے واسطے مخصوص تھا۔ یہ کوئی مشہور پرچہ نہ تھا اور تھوڑے عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ ایک دوسرا مشہور پرچہ اخبار عام لاہوری جسکو پنڈت مکند رام نے نکالا تھا جو کوہ نور میں ملازم تھے اور ایک پنشن یافتہ سرکاری عہدہ دار اُس کے معاون تھے۔ یہ ایک خاص خبروں کا پرچہ تھا اور نہایت ارزاں تھا۔ کچھ دنوں گورنمنٹ اسکی سرپرست رہی اور ہر اسکول میں اس کے پرچے جاتے تھے مگر یہ سرپرستی اب موقوف ہو گئی۔ پہلے یہ بھی ہفتہ وار تھا اس کے بعد سہ روزہ اور دو روزہ ہوا۔ اس کی زبان اخباری زبان تھی۔ یعنے اس میں کوئی ادبی خصوصیت نہ تھی۔ مگر یہ بات قابل تعریف ضرور ہے کہ اس کی ارزانی قیمت نے لوگوں کے دل میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا۔ اودھ پنچ لکھنؤ ۱۸۷۷ء میں وجود میں آیا۔ یہ ظرافت کا پرچہ تھا اور اپنے عنفوان شباب میں نہایت کامیاب۔ لوگوں کو اس کا انداز اسقدر پسند آیا کہ ملک میں اس کے اکثر نقال پیدا ہو گئے۔ اس کی خاص خوبیاں یہ تھیں کہ آزادی سے لکھتا تھا ظریفانہ رنگ میں لکھتا تھا جس کی ملک میں بڑی ضرورت تھی۔ انشاپردازی اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی اور سب سے بڑھکر یہ کہ کسی خاص فرقہ یا جماعت یا کسی خاص مذہب کا طرفدار یا مخالف نہ تھا۔ منشی سجاد حسین مرحوم اسکے قابل ایڈیٹر تھے اور اکثر اس عہد کے قابل ظریف الطبع اصحاب اس کے نامہ نگار تھے۔ ہندوستانی کی ابتدا لکھنؤ میں ۱۸۸۳ء میں ہوئی یہ سب سے پہلا اُردو پرچہ تھا جس نے سیاسیات اور واقعات حاضرہ پر بالاستیعاب بحث کی۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کا پرچہ تھا اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں اور جزئی مناقشوں میں اپنا وقت ضایع نہیں کرتا تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہو گیا۔ اسکی زبان میں

ادبیت نہ تھی ممکن ہے کہ ترجمہ وغیرہ کی جلدی اس کا باعث ہوا سی شان کا پرچہ رفیق ہند تھا جو لاہور
سے نکلتا تھا۔ پیسہ اخبار ۱۸۸۵ء میں نکلا منشی محبوب عالم صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس کی ارزانی
قیمت اور مضامین کی عمدگی سے لوگ اس کو بہت زیادہ پڑھتے تھے اور اسی وجہ سے اس میں اشتہارات
بکثرت نکلتے تھے۔

ادبی اُردو رسالے | اس قسم کے رسالوں میں مولانا شرر مرحوم کا دلگداز بہت پرانا رسالہ ہے جو
اب بھی نکل رہا ہے۔ زمانہ کانپور کا ذکر منشی دیانراین صاحب نگم کے ذکر میں گزر چکا۔ ادیب الہ آباد
بھی نہایت عمدہ رسالہ تھا مگر افسوس ہے کہ تھوڑے دنوں میں اسکی عمر ختم ہو گئی۔ الناظر جسکے قابل
ایڈیٹر مولانا ظفر الملک صاحب علوی ہیں نہایت آزاد خیال اور بڑی قابلیت کا پرچہ ہے۔ ہزار داستان
لاہور میں صرف چھوٹے افسانے اور ناول نکلتے ہیں۔ ہمایوں لاہور اور شباب اُردو لاہور بھی اپنی صنف
میں عمدہ پرچے ہیں نگار لکھنؤ (جو پہلے بھوپال سے نکلتا تھا) ایک اعلیٰ درجے کا ادبی پرچہ ہے اور اپنے
خاص ایڈیٹر نیاز فتحپوری کی شخصیت کا پتا دیتا ہے معارف اعظم گڑھ اور اُردو اورنگ آباد یہ دونوں
زمانۂ موجودہ کے بہترین ادبی رسالے ہیں جن کے اکثر مضامین نہایت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ سہیل
علیگڑھ گو کہ حال ہی میں طلوع ہوا نہایت ہونہار رسالہ ہے اس کے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور اگر ترقی کرتا
رہا تو اُسکا شمار بہترین اُردو رسائل میں ہو جائے گا۔ مولانا حسرت موہانی کا اُردوئے معلیٰ ایک زمانے میں
بہت مشہور تھا مگر اب ویسا نہیں ہے۔ مرقع لکھنؤ اور اکبر الہ آباد سے نکلتے ہیں۔ مخزن نے ادب اُردو کی بہت
بیش بہا خدمات انجام دی ہیں مختصر یہ کہ سب رسائل کو نام بنام گنوانا بہت مشکل ہے۔ مگر اُن پرچوں میں
جو ایک زمانے میں شہرت رکھتے تھے اور اب بند ہو گئے دکن ریویو، حسن اور العصر قابل ذکر ہیں۔

اکثر اخبار نویسوں کے حالات ان کے نام کے تحت میں درج کیے گئے ہیں مولانا ظفر الملک۔ مولوی
بشیر الدین ایڈیٹر البشیر اور تاجور نجیب آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اسوجہ سے کہ یہ حضرات ادب اُردو
کی بہت قیمتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگر کسی کو اُردو روزانہ اخبار دنکے ایڈیٹر دنکے نام دیکھنا ہوں
تو ایک مختصر کتاب "اخبار نویسوں کے حالات" مولفہ محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین کا مطالعہ کریں۔

باب ۱۷

اردو ناول کی ابتدار

شررؔ اور سرشارؔ کا زمانہ

اردو کے پرانے قصے

"افسانہ گوئی کا شوق دنیا میں بہت قدیم اور انسان کے دل میں اس کا بہت گہرا اثر ہے۔" پرانے اردو قصے یا تو فارسی سے ترجمہ ہوئے یا سنسکرت سے بذریعہ فارسی تراجم کیلئے گئے یا اُنھیں دونوں چیزوں کو گھٹا بڑھا کر کچھ نئے قصے گڑھ لیے گئے تھے۔ یہ سب اپنی نوعیت میں مختلف ہیں بعض ہمت و شجاعت کے قصے ہیں بعض میں دیو اور پریوں کا ذکر ہے بعض اخلاقی ہیں اور بعض نہایت مخرب اخلاق۔ انداز بیان سب کا وہی ٹکا بندھا معمولی ہے۔ واقعات کا بیان قریب قریب یکساں ہے جن کو بار بار پڑھکر طبیعت اکتا جاتی ہے۔ عجائب و غرائب کا ذکر عام ہے۔ انسان دیووں اور پریوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہیں۔ طلسم سحر جادو ہر قصے میں کسی نہ کسی صورت سے موجود ہے بلکہ اکثر اسی پر قصے کا دارو مدار ہوتا ہے۔ انداز بیان عام طور پر سادہ اور سبق آموز ہوتا ہے مگر کیرکٹر نویسی کا کسی میں پتہ نہیں۔ اور نہ کوئی داخلی دلچسپی نہ کسی پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے، زیادہ تر حسن و عشق کے حالات، ساحروں اور جادوگروں کی لڑائیاں، جادوگروں کے شاہزادوں سے مقابلے، اور آدمیوں کا جانوروں کی صورت میں بدل جانا دکھایا جاتا ہے یہ سب کچھ ہے مگر روزمرہ کے واقعات سے وہ خالی ہیں۔

اقسام قصص

خاص اقسام قصص حسب ذیل ہیں (۱) الف لیلہ (۲) بوستان خیال (۳) داستان امیر حمزہ مع اس کے فروعات طلسم ہوشربا وغیرہ کے (۴) قصہ حاتم طائی و باغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصے جیسے بیتال پچیسی۔ کلیلہ دمنہ سنگھاسن بتیسی۔ گل بکاؤلی طوطا کہانی وغیرہ۔

مطبع منشی نول کشور لکھنؤ

اکثر اس قسم کے قصے مطبع منشی نولکشور میں چھپے ہیں جس کے بانی خود منشی نولکشور صاحب سی۔ آئی۔ ای تھے۔ اس مطبع نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اور اُسکی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور

منشي نول کشور
(سي-آئي-اي)

منشي بشن نراين صاحب بھارگو
مالک نولکشور پریس

نادر کتابونکی اشاعت مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم جدید کتابونکی پبلک مذاق کے موافق تیاری۔ اور نیز اسکولی کتابونکی تیاری سے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی صاحب موصوف ۱۸۳۶ء میں بستوئی ضلع علیگڑھ میں پیدا ہوے انکے دادا منشی بالمکند آگرہ میں سرکاری خزانچی تھے اور والد منشی جمنا داس بھی کاروبار کرتے تھے۔ منشی نولکشور ایک خود ساختہ آدمی تھے اور بچپنے ہی سے تجارت کی اعلی قابلیت رکھتے تھے ان کو اخبارات سے بڑا شوق تھا منشی ہر سکھ راے کی ماتحتی میں اخبار کوہ نور لاہور میں کچھ عرصہ تک رہے جہاں اُن کو چھاپہ خانہ وغیرہ کے حالات کا بہت وسیع تجربہ ہو گیا غدر کے بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آگئے جہاں ۱۸۵۸ء میں سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی میں اپنا مطبع کھولا۔ تقدیر نے یاوری کی اور انکے کام کو روزافزوں ترقی ہو گئی۔ انکی قابلیت اُن کی دیانتداری اُن کی پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کیا بلکہ ایشیا کے سب سے بڑے مطابع میں شمار کیا جانے لگا۔ منشی صاحب نے زر کثیر قیمتی نادر قلمی کتابوں کی خرید میں صرف کیا ان میں سے اکثر کو شائع کر کے پبلک کو بہت بڑا فائدہ پہونچایا۔ اس مطبع سے ہزارہا عربی فارسی سنسکرت اُردو ہندی کتابیں بڑے صرف اور بڑے تکلف سے چھپ کر شائع ہوئیں مختلف قسم اور مختلف ہدیے کے قرآن شریف شائع ہوئے جن سے اہل اسلام کو بہت بڑا نفع پہونچا۔ اودھ اخبار بھی ۱۸۵۹ء میں انھوں نے جاری کیا تھا جیساکہ اخبارات کے ذکر میں بیان ہوا۔ انکی موت ۱۸۹۵ء میں واقع ہوئی اور وفات کے وقت انھوں نے تقریبًا ایک کروڑ روپیہ کی جائداد اور کاروبار چھوڑا۔ اُنکے بعد ان کے لائق فرزند راے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب آنجہانی نے ادب اُردو ہندی کی بڑی خدمت کی۔ اور اب اُن کے ہونہار فرزند منشی بشن نرائن صاحب بھارگو اپنے والد کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ اور نولکشور پریس آپ کی کوششوں سے نہایت کامیابی سے ترقی کر رہا ہے۔

داستان امیر حمزہ صاحبقران | ایک جسیم اور ضخیم کتاب متعدد جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں شیخ ابو الفیض فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے واسطے تیار کی تھی اس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۷ سترہ اور تعداد صفحات ۱۸ سترہ اٹھارہ ہزار سے کم نہ ہوگی

سب سے مشہور دفتر اوّل مسمّٰے بہ نوشیروان نامہ دو جلدوں میں اور دفتر پنجم موسوم بہ طلسم ہوشربا سات جلدوں میں ہے اور مؤخر الذکر بہت مقبول عام ہے طلسم ہوشربا کی اول چار جلدوں کا ترجمہ میر محمد حسین جاہؔ اور آخر تین جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمرؔ کا ہے۔ ایک منظوم ترجمہ طوطارام شایاںؔ نے بھی کیا تھا نوشیروان نامہ کا ترجمہ منشی نولکشور صاحب کی فرمائش سے شیخ تصدق حسین داستان گو نے کیا تھا۔ اس کتاب میں ایک فرضی طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے جو پیغمبر اسلام صلواۃ اللہ علیہ والسّلام کے عم بزرگوار تھے جس میں ایک قصّہ سے سیکڑوں قصّے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔

بوستان خیال اس کی نو ضخیم جلدیں ہیں اور اس کے مصنف میر تقی خیالؔ سمجھے جاتے ہیں جو اصل میں گجرات کے رہنے والے تھے مگر آخر میں دلّی میں آگئے تھے۔ یہ قصّہ مصنف نے اپنی مشعوقہ کی دلچسپی کے لیے داستان امیر حمزہ کے رنگ میں تصنیف کیا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور وہ اُنھیں کے زمانے میں اور اُنھیں کے حکم سے اختتام کو پہونچی۔ اس کے تقریبًا چار ہزار صفحات ہیں۔ پانچ جلدوں کا ترجمہ اُردو میں خواجہ بدر الدین معروف بہ خواجہ امان دہلوی نے اور دو جلدوں کا ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی۔

ان سب کتابوں میں بڑا عیب یہ ہے کہ صحیح جذبات نگاری اور کیرکٹر نویسی ان میں مفقود ہے کوئی معیّن پلاٹ بھی نہیں ہے۔ چند مشہور لوگوں کے بعید از قیاس افسانے ہیں جن میں جنّات اور دیوزادوں سے لڑائی اور ساحروں سے مقابلہ کا ذکر ہے کبھی کبھی وہ سحر طلسم میں پھنس بھی جاتے ہیں مگر آخر میں فتحیاب نکلتے ہیں اور اپنی محبوبہ کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلاتے ہیں قصّہ کے تمام واقعات میں ایسی یکسانی ہے کہ جی اکتا جاتا ہے کوئی تنوّع اور جدّت نہیں اور روزانہ واقعات زندگی کا تو کہیں ذکر نہیں ہے۔ اکثر یہ قصّے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوے اور اب منشی نولکشور کے مطبع میں بڑے آب و تاب سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے ناول کی آفرینش میں بہت کچھ مدد دی یعنے اپنی مشہور کتاب فسانہ عجائب کی تصنیف سے لوگوں کے دلوں میں افسانہ کا شوق پیدا کر دیا یہ ضرور [illegible]

خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مترجم بوستان خیال

اس کی مصنوعی مقفیٰ اور مسجّع عبارت نے کہیں کہیں مطلب کو گنجلک کر دیا۔ اور تسلسل بیان میں فرق ڈال دیا ہے۔ واقعات معمولی اور زبان نہایت پر تصنع اور پیچیدہ ہے۔

البتہ مولوی نذیر احمد صاحب کے بعض قصے موجودہ ناول کی حدود تک پہونچ جاتے ہیں گو کہ ان میں بھی موجودہ اصول ناول نویسی کی پوری پیروی نہیں پائی جاتی۔ وہ اول سے آخر تک نصیحت آمیز ہیں اور کسی معاشرتی یا تعلیمی مضمون یا کسی مذہبی مسئلہ پر ایک زبردست وعظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رویائے صادقہ، توبۃ النصوح، مراۃ العروس وغیرہ کی تہ میں کوئی نہ کوئی باقی سبق ضرور ہے جو بہت زور کے ساتھ سکھایا گیا ہے۔ بیشک مولوی صاحب نے یہ بہت بڑا کمال کیا کہ مافوق العادت اور حیرت انگیز چیزوں کو اپنی تصانیف سے ایک قلم خارج کر دیا اور معمولی واقعات زندگی کو ایک منظم پلاٹ کی صورت میں دلچسپی سے بیان کیا۔ ان کی قابل قدر تصانیف جو اُس زمانے کے رسم و رواج اور طرق و عادات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کی قوت استدلال و مشاہدہ کے شاہد عادل ہیں۔ زبان پر اُن کو پوری طرح قدرت حاصل ہے اور گو کہ اس میں کہیں کہیں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر بھی سلاست و روانی ان کے ناولوں کی خاص مابہ الامتیاز چیز ہے۔ سلسلۂ واقعات بھی وہ خوب قائم رکھتے ہیں گو کہ کہیں کہیں اس قاعدے کی خلاف ورزی سے قصے کے تناسب میں فرق پڑ جاتا ہے۔ کیرکٹر دلچسپ مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز ہیں۔

اودھ پنچ اور اُس کی ادبی خدمات

منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نکال کر ہندوستانی اخبار نویسی اور ادب اُردو پر احسان عظیم کیا۔ نثر کی ایک خاص شان پیدا کی مذاق ظرافت جس سے ابتک ہمارا ادب خالی تھا داخل نثر ہوئے۔ زبان میں بلیغ الفاظ شامل کر کے گرانقدری پیدا کی پُر زور طریقہ سے کتابوں کی تنقید کی۔ ناول نویسی میں ترقی کی۔ اودھ پنچ سب سے پہلا اخبار ہے جس نے ایک مقرر اور معین پالیسی اختیار کی۔ وہ محض خبر رسانی نہیں کرتا تھا بلکہ پبلک معاملات میں اپنی آزاد رائے رکھتا اور قومی حقوق کا تحفظ کرتا تھا اور ہندوستانی رؤسا کا ناصح اور محتسب بھی تھا وہ اصول کانگریس کا حامی، ہندو مسلم اتحاد میں ساعی، البرٹ بل کی تحقیر اور ایکٹ انکم ٹیکس کے پاس ہونے کا سخت

مخالف تھا لیکن اسی کے ساتھ سوشل معاملات میں بہت قدامت پرست سرسید اور ان کی تجاویز کا دشمن اور تعلیم نسواں اور پردہ کے توڑنے کا بھی سخت مخالف تھا۔ غرضکہ اس اعتبار سے جدید و قدیم رنگ کا ایک عجیب مجموعہ تھا اس کے اکثر نامہ نگار نہایت قابل اور فاضل لوگ تھے۔ مثلاً علاوہ خود منشی سجاد حسین مرحوم کے مرزا مچھو بیگ عاشق (جو ستم ظریف کے نام سے اودھ پنچ میں مضامین لکھتے تھے) تربھون ناتھ ہجر۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ احمد علی کسمنڈوی۔ اکبر الہ آبادی۔ نواب سید محمد آزاد۔ جن میں سے بعض کے کچھ حالات علیحدہ بھی لکھے جائیں گے۔

اودھ پنچ[۱] یوں تو ایک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اس کی ظرافت کا رنگ بدل جاتا تھا اور

---

[۱] اس زمانے میں لوگ اسقدر ٹھس ہوگئے ہیں اور مذاق و ظرافت کا اُن میں اسقدر فقدان اور اس فنِ لطیف کی اُن میں اتنی کمی ہوگئی ہے کہ اودھ پنچ ایسا بے مثل ہنسنے ہنسانے والا پرچہ جو مذاق کے پیرایہ میں نصیحت اور ظرافت کے ساتھ عبرت سکھاتا اور انشا پردازی کا بھی بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا اپنے سابق ایڈیٹر منشی سجاد حسین صاحب کے ساتھ خود بھی مرگیا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے حکیم ممتاز حسین عثمانی موجودہ ایڈیٹر کا کہ انھوں نے اس کو زندہ کیا اور اس کے تن بے جان میں نئے سرے سے جان ڈالی ایک معنی میں تو ہم حکیم صاحب موصوف کو منشی سجاد حسین مرحوم پر ترجیح دینگے اسوجہ سے کہ منشی صاحب مرحوم کے وقت میں تو بہت سے قابل اہل سخن اُنکے ہم مذاق اور یار و مددگار موجود اور اُن کا ہاتھ بٹانے کو ہر وقت تیار تھے پبلک بھی قدردان تھی۔ حساس تھی۔ باحمیت تھی۔ اودھ پنچ کے تازیانہ ظرافت سے لوگ اسی طرح ڈرتے تھے جیسے شوخ لڑکے ڈنڈے باز مولوی سے ڈرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک بدکردار شخص جب اپنا بدنما چہرہ صفحات اودھ پنچ کے مجلے آئینے میں دیکھتا تو اپنی ڈراونی صورت سے ڈر کر بُرے افعال سے توبہ کر لیتا اور اودھ پنچ کا خریدار بن جاتا تھا۔ اس طرح ہم خرما و ہم ثواب کے اصول پر خود اودھ پنچ کا بھی فائدہ ہوتا اور دوسروں کے اخلاق بھی درست ہو جاتے تھے ع وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔ مگر اب وہ باتیں نہیں ہیں لوگوں کے اخلاق بدل گئے اطوار متغیر ہوگئے۔ ظرافت کے قدردان اور اس سے فائدہ اٹھانے والے باقی نہ رہے۔ لوگوں سے حس اور اثر پذیری کا مادہ جاتا رہا۔ اور ظرافت کا انداز بھی بدل گیا۔ مگر پھر بھی بُری بھلی جیسی ہے ایسی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں اودھ پنچ کا نظیر و عدیل نہیں۔ وہ اپنی آپ مثال اور قلمرو ظرافت میں حاکم علی الاطلاق ہے۔ ہزار آفریں ہے اس کے فاضل ایڈیٹر کو کہ انھوں نے اس کی روایات قدیمہ کو قائم رکھا بلکہ زمانہ حال اور ضروریات کے مطابق مضامین کا معیار بلند کر دیا۔ پورا پرچہ بیچارے تن تنہا نکالتے ہیں اور ٹھیک وقت پر نکالتے ہیں جو ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں کے لیے قابل فخر اور قابل تقلید بات ہے۔ (باقی بر صفحہ ۱۰۳)

منشی سید محمد سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

پنڈت تربھون ناتھ ہجر

وہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر اتر آتا تھا۔ بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً وہ جو فسانہ آزاد۔ حالی داغ۔ گلزار نسیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات مہذب اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر جھگڑہ کا ایک میدان بن گئے ہیں مگر اقسام ذیل کے مضامین نہایت قابلیت اور شستگی کے ساتھ اس کے صفحات میں درج ہوتے رہے ہیں۔ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر محرم۔ چہلم۔ عید بقرعید۔ شب برات۔ ہولی۔ دیوالی۔ بسنت۔ عیش باغ کے میلے۔ ناچ رنگ کے جلسے اور دعوتیں۔ مشاعرے۔ اجلاس ہائے عدالت۔ مرغ و بٹیر کی پالیاں۔ الکشن کے مقابلے وغیرہ۔

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین مرحوم منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے تھے جو گورنمنٹ سے پنشن لے کر حیدر آباد دکن گئے اور وہاں سول جج ہو گئے تھے۔ منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کیننگ کالج سے پاس کر کے اور کچھ دنوں مختلف ملازمتیں کر کے

(بقیہ صفحہ ۱۰۲) اس موقع پر ہم ایک بات اپنے مکرم فاضل دوست سے ضرور گزارش کریں گے وہ یہ کہ وہ اپنے پرچہ سے "بو نصیبن" کا ذکر خیر اور ان کی بات چیت کا انداز ذرا کم کر دیں بلکہ اگر بالکل خارج کر دیں تو اور بھی اچھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض مقامات پر اس کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور اس جنس کی بھی مانگ ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ مولانا (سابق مسٹر) محمد علی اپنی مکہ شریف والی عبا اور عمامہ۔ دارم بر اپنو شم کے قاعدے سے پہن کر۔ اسمبلی کے اجلاس میں تشریف لے گئے پنڈت مدن موہن مالوی اُن کی اس نئی دھج کو دیکھکر کہنے لگے۔ کہ اخاہ مولانا محمد علی ہیں ہم تو سمجھے تھے کہ بیگم صاحب بھوپال آ رہی ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ اس جگہ جہاں عورتیں ہی عورتیں ہیں، اگر آپ مجھ کو بیگم صاحب سمجھے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بہر طور یہ اصول کہ اودھ پنچ کے بعض ناظرین عورتوں سے کم یا زیادہ مرتبہ نہیں رکھتے لہذا اُن سے ہم کلام ہونے کے لیے بھی "بو نصیبن" کی ضرورت پڑتی ہے ایک حد تک تو ضرور صحیح اور قابل تسلیم ہے۔ مگر جب اسمیں تجاوز ہو جاتا ہے اور سیاسی و علمی و معاشرتی جملہ معاملات میں جا و بیجا بو نصیبن یا اُن کی سہیلی منطق آرا بیگم دریائے لطافت کی پانوران کی طرح آن کر کود پڑتی ہیں اور وایسرائے لارڈ اردن سے لیکر شیخ حبیب اللہ صاحب تک سے سیاسی اور علمی مسائل میں اپنے خاص انداز میں ہمکلام ہونے لگتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یا اللہ ان باتوں کے واسطے کیا کوئی مرد دستیاب نہیں ہوتا تھا کہ عورتوں کی طرف سے اور انکی زبان میں یہ مطالب ادا کئے گئے۔ اور اس سے نفس مسئلہ اور اخبار کے ظریفانہ انداز میں کیا اضافہ ہوا۔ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں ابھی اس درجے کو نہیں پہونچی کہ ایسی عورتیں پیدا ہو گئی ہوں جو سیاسی اور علمی معاملات میں کوئی صائب رائے رکھتی یا اس کا اظہار کر سکتی ہوں۔ پھر اس نئی اپج سے اور اخبار پر ریختی منتو ہونے کا الزام عائد کرنے سے کیا فائدہ؟

سنہ ۱۸۷۷ء میں اپنا مشہور اخبار "اودھ پنچ" نکالا۔ ان کی ذاتی قابلیت طبیعت داری اور وسیع الاخلاقی
سے اُن کے بہت سے دوست ہم مذاق وہم مشرب پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار
بھی اُن کے اخبار میں مضمون نگاری کرتے تھے۔ مگر جب کہ وہ خود اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوے اودھ پنچ کی
نامہ نگاری چھوڑ دی جس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آگے آے گا۔ منشی سجاد حسین پہلے شخص ہیں جنھوں نے
ہندستان میں ایک ظریفانہ رنگ کا اُردو اخبار نکالا جس نے کہ ملک اور زبان دونوں کی معقول خدمت
انجام دی۔ منشی صاحب نہایت نیک دل صاف باطن اور غیر متعصب شخص تھے اور کبھی مذہبی رنگ کے
مضامین کو اپنے اخبار میں جگہ نہیں دیتے تھے۔ انکی تحریر کا ایک خاص انداز تھا جس میں واقفیت
اور معلومات کے ساتھ مذاق وظرافت اور لطائف وظرائف بکثرت ہوتے تھے عبارت میں بیساختگی
اور شستگی بہت نمایاں تھی۔ اُن کے وہ فرضی خطوط جو ہندوستانی رؤسا کے نام ہیں ایک عجیب انداز
کے ہیں اور ان میں ایک خاص طریقے سے نصیحت کی گئی ہے۔ منشی صاحب ایک زبردست ناول نگار
بھی تھے۔ چنانچہ اُن کے ناول حاجی بغلول۔ طرحدار لونڈی۔ پیاری دنیا۔ احمق الذین میٹھی چھری
کایا پلٹ۔ حیات شیخ چلی مشہور ہیں اور ان سب کی عبارت نہایت بلیغ اور دلچسپ ظریفانہ انداز میں
ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں مرض فالج میں مبتلا ہوے اور ایک عرصہ دراز تک جسمانی تکالیف اور آلام ومصائب
میں مبتلا رہ کر سنہ ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔ اور اودھ پنچ سابق سنہ ۱۹۱۲ء میں اُنکی زندگی میں بند ہو گیا تھا۔

مرزا مچھو بیگ عاشق مرزا محمد مرتضیٰ عرف مرزا مچھو بیگ عاشق تخلص مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے
شرفاے لکھنؤ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ بچپنے میں ورزش کا بڑا شوق تھا اور بانک پٹا وغیرہ اپنے نانا
سے سیکھا تھا۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔ نسیم دہلوی سے تلمذ تھا۔ بہت خوشگو اور رنگین طبع شاعر تھے
مگر نظم سے زیادہ نثر میں ان کو شہرت حاصل ہوئی جس میں وہ صفائی زبان صحت محاورہ اور بذلہ سنجی کے
لیے مشہور تھے۔ آخر عمر تک "ستم ظریف" کے لقب سے اودھ پنچ میں مضمون نگاری کرتے رہے اُن کے
مضامین پڑھنے کے قابل ہیں اور محاورہ اور صفائی زبان کے لیے اپنی آپ مثال ہیں۔ مطبوعہ تصانیف
نظم ونثر حسب ذیل ہیں ۱۔ گلزار نجات۔ میلاد شریف (منظوم) آفتاب قیامت (لکچر کے انداز میں ایک ظریفانہ نظم

شوق قدوائی

جوالہ آباد میں پڑھی گئی تھی) بہار ہند (اُردو محاورات کی ایک نا تمام لغت) مثنوی نیرنگ خیال بعض مضامین جو اودھ پنچ میں نکل چکے تھے اور "چشم بصیرت" کے نام سے علیحدہ شایع ہوئے ہیں۔ ان کا اُردو دیوان اُن کے صاحبزادہ مرزا محمد صدیق کے پاس ہے جو ہنوز شایع نہیں ہوا ہے۔ منشی بالمکند گپتا سابق ایڈیٹر بھارت متر کلکتہ اُن کے ایک مشہور شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نہایت ہشاش بشاش خلیق و متواضع اور وسیع الاحباب تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خودداری اور آزادی یہاں تک تھی کہ ملازمت سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اس وجہ سے کہ اس میں پابندی عائد ہوتی تھی۔ سیاسیات سے بھی شوق تھا چنانچہ ایک مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے کانگریس میں شریک ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ صفائی زبان اور بذلہ سنجی آپ کے خاص جوہر ہیں۔

ترکھبون ناتھ ہجر پنڈت ترکھبون ناتھ سپرو متخلص بہ ہجر پنڈت بشمبر ناتھ سپرو کے بیٹے تھے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم انگریزی سے فراغت کر کے اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا کچھ دنوں تک لکھنؤ میں وکالت بھی کی تھی۔ نہایت شریف الطبع ملنسار اور ہر دلعزیز تھے۔

نواب سید محمد آزاد نواب سید محمد آزاد آئی ایس او ۱۸۴۶ء میں بمقام ڈھاکہ پیدا ہوئے۔ مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دولتمند خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی اور یہ وہی شخص ہیں جن سے مرزا غالب سے "برہان قاطع" کے بارہ میں معرکے رہے ہیں۔ انگریزی گو کہ پرائیوٹ طور پر پڑھی تھی مگر اس زبان میں ان کو مہارت کامل حاصل تھی۔ ابتدائے ملازمت سب رجسٹراری سے ہوئی اور اسی لائن میں ترقی کرتے کرتے انسپکٹر جنرل رجسٹری کے معزز عہدہ تک پہونچے۔ بنگال کونسل میں دو دفعہ کرسی ممبری کو زینت بخشی اور امپیریل سروس آرڈر (آئی۔ ایس۔ او) کا نشان اعزازی آپکو عطا ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوئے پہلے آپ ایک فارسی اخبار "دوربین" میں بزبان فارسی مضامین لکھتے تھے مگر اس کے بعد اودھ اخبار، اودھ پنچ، آگرہ اخبار وغیرہ مختلف اخبارات و رسائل میں زبان اُردو میں لکھتے رہے ۱۸۸۰ء میں ان کا ناول "نوابی دربار" نکلا جس میں کہ مذاق کے پیرایہ میں پُرانے رنگ کے فاقہ مست نوابوں کا خوب خاکہ اُڑایا گیا تھا اور بہت مقبول عام ہوا آپ

انگلستان بھی گئے تھے اور وہاں سے جو خطوط بھیجے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ آپ کی کتاب موسومہ به "نئی لغت" ظریفانہ رنگ کی مقفیٰ نہایت دلچسپ کتاب ہے۔

جوالا پرشاد برق | منشی جوالا پرشاد متخلص به برق ایک نہایت ذہین اور قابل شاعر و نثار دونوں تھے ۱۸۶۲ء میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کھیری سے پاس کر کے ۱۸۷۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے ۱۸۸۲ء میں بی، اے اور ۱۸۸۳ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی ۱۸۸۵ء تک وکالت کر کے منصف ہو گئے جس میں ترقی کرتے کرتے قائم مقام ڈسٹرکٹ وسشن جج کے درجے تک پہونچے ۱۹۰۹ء میں گریفن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے ۱۹۱۱ء میں بعارضہ پلیگ اس دار فانی سے کوچ کیا۔ نہایت طبیعت دار اور ذہین شخص تھے۔ فسانۂ آزاد کی عبارت کے اس قدر دلدادہ تھے کہ خود بھی وہی طرز ایک حد تک اختیار کیا آپ کی مثنوی بہار، ایک نہایت اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے جو سر سید مرحوم کو بہت پسند تھی برق علاوہ شاعر خوشگو ہونے کے مترجم بھی اعلیٰ درجے کے تھے بنکم چندر چٹرجی کے اکثر مشہور ناولوں کے ترجمے آپ کے قلم سے نکلے ہیں مثلاً بنگالی دلھن، پرتاب، روہنی، مرنالنی، مار آستین وغیرہ۔ آپ کا ترجمہ اس قدر صاف سلیس بامحاورہ اور شیریں ہوتا ہے کہ مطلق ترجمہ نہیں معلوم ہوتا کتب مذکورہ بالا بہترین اردو ناول خیال کیے جاتے ہیں ان کے علاوہ شیکسپیر کے بعض ڈراماؤں کا بھی ترجمہ آپنے کیا تھا مگر افسوس کہ اُن میں سے اکثر شایع نہ ہو سکے۔

احمد علی شوق | منشی احمد علی شوق قدوائی اسیر مرحوم کے معزز شاگردوں میں تھے۔ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے۔ چند ناٹک نثر و نظم بھی آپ کی یادگار ہیں جسمیں "قاسم و زہرہ" اور "میکفرسن و لوسی" زیادہ مشہور ہیں۔ مثنویاں آپ کی بہت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں علی الخصوص "عالم خیال" جس کی زبان نہایت لطیف و شیریں ہے بیحد مقبول ہوئی، یہ کتاب ایک ستم رسیدہ عورت کی دکھ بھری داستان ہے جو اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی واپسی کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کر رہی ہے۔ اس کی عبارت فارسی اضافتوں سے خالی ہے، دیوان بھی آپ کا شائع ہو گیا ہے اور نہایت اعلیٰ درجے کا ہے۔ آپ فن عروض اور نکات ادبیہ سے پوری طرح واقف تھے اور نثر کے مضامین بھی صفائی اور صحت زبان کا بہت خیال

نواب سید محمد خان بہادر آزاد آئی-ایس-او

منشي جوالا پرشاد برق

رکھتے تھے آخر عمر میں ریاست رامپور سے تعلق ہو گیا تھا۔ آپ کی وفات حسرت آیات سے ممتاز شعرائے اردو کی صف میں ایک جگہ خالی ہو گئی جس کی خانہ پری مشکل ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ در متخلص بہ سرشار گزشتہ صدی کے آخر میں ایک عجیب زندہ دل باکمال شخص گزرے ہیں۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے صرف چار برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے چھوٹے بھائی پنڈت بشمبر ناتھ در ڈپٹی کلکٹر تھے جن کے بیٹے ریاست بلرام پور میں ملازم ہیں۔ سرشار کے صاحبزادے پنڈت نرنجن ناتھ در سرکاری خزانے میں ملازم تھے مگر جوانی میں انتقال کر گئے۔ سرشار عربی فارسی انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے انگریزی انھوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھی تھی مگر اس میں کوئی ڈگری نہیں حاصل کی سب سے پہلے ضلع اسکول کھیری میں ٹیچر ہوئے اور یہیں سے وہ "مراسلہ کشمیری" میں جو اس زمانے میں کشمیری پنڈتوں کا ایک ماہوار رسالہ نکلا کرتا تھا اور "اودھ پنچ" میں اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے۔ یہ آرٹیکل گو کہ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی اُن کی آیندہ تصانیف اور شہرت کا ایک سنگ بنیاد ضرور تھے۔ سرشار ترجمہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور وہ اپنا اس قسم کا کام سررشتہ تعلیم کے کسی رسالہ میں بھیجا کرتے جہاں وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اس کو بہت پسند کرتے اور اُن کی قابلیت کی داد دیتے تھے سرشار کبھی کبھی "مراۃ الہند" اور "ریاض الاخبار" میں بھی اپنے مضامین بھیجتے۔ ۱۸۷۶ء میں اُنھوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ اس میں اُنھوں نے اکثر سائنس کی اصطلاحات کا ترجمہ عمدہ اور سلیس اردو میں کیا ہے۔ اسی سال وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور یہ اس طور پر ہوا کہ ڈاکٹر گریفتھ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے ان کا تعارف منشی نولکشور صاحب مالک اخبار سے کرایا جن کو اس وقت اخبار کے لئے ایک قابل آدمی کی ضرورت تھی سرشار نے اپنی مشہور و معروف تصنیف فسانۂ آزاد کا سلسلہ اسی اودھ اخبار میں شروع کر دیا جو دسمبر ۱۸۷۹ء تک قائم رہا اور ۱۸۸۰ء میں "فسانۂ آزاد" بصورت ایک علیحدہ کتاب کے چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اسی عرصہ میں اودھ پنچ اور اودھ اخبار میں وہ مشہور معرکہ شروع ہوا جو عرصہ دراز تک قائم رہا۔ اودھ پنچ، اودھ اخبار اور

اس کے ایڈیٹر کو اپنے ظریفانہ انداز میں سیکڑوں صلواتیں سناتا تھا اور اس کا جواب بھی کلّہ بہ کلّہ پاتا تھا آخر بعض دوستوں کی کوشش سے مصالحت ہوگئی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا سرشار دو اور مباحثوں میں بھی شریک ہوئے تھے ایک بیان یزدانی میرٹھی اڈیٹر "طوطی ہند" اور دوسرا خواجہ الطاف حسین حالی کے ساتھ[۱] سرشار کی تصانیف سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں آخر الذکر ایک انگریزی ناول ڈان کوئی زوٹ کا ترجمہ ہے سنہ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے ایک سلسلہ موسوم بہ خمکدہ سرشار شروع کیا تھا اور اسی زمانے میں اُن کے ناول گورم دھم، بچھڑی دولہن، طوفان بے تمیزی، پی کہاں ہشّو بھی شایع ہوئے مگر ان میں اُن کا زور بیان کم ہے۔ حیدر آباد جانے سے قبل کچھ دنوں وہ الہ آباد ہائیکورٹ میں مترجم بھی ہوگئے تھے مگر قواعد دفتر کی سختی کے وہ متحمل نہ ہوسکے اور تھوڑے ہی دنوں میں ملازمت ترک کردی۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدر آباد گئے۔ اپنے قیام حیدر آباد کا حال ایک خط میں جو "کشمیری درپن" مارچ سنہ ۱۸۹۹ء میں شایع ہوا تھا اور جس کا ایک حصہ پنڈت برج نراین چکبست صاحب نے اُسی سے نقل کیا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"تقریباً چار برس ہوئے کہ میں ممبر کانگریس کی حیثیت سے مدراس آیا تھا میری خوش نصیبی مجھ کو حیدر آباد لائی جہاں ہندو مسلمان امیر غریب سب نے نہایت گرمجوشی سے مجھ کو لیا اور میرے اوپر بڑی عنایتیں کیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اپنے کلام نظم و نثر کی اصلاح کے لیے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کردیا ہے اس کے علاوہ خلعت خوشنودی اور فی شعر جو پسند خاطر ہوجاتا ہے ایک اشرفی عنایت فرماتے ہیں۔ حضور نظام مجھ سے پہلے ہی سے واقف تھے پہلے دن جب میں حاضر خدمت ہوا تو نذر گزرانی اور اپنی کچھ کتابیں بھی پیشکش کیں اعلیٰ حضرت نے ذرہ نوازی کی کہ ایک ٹکڑا دربار کے بیان کا میری سیر کہسار سے اور ایک مقام جام سرشار سے سماعت فرمایا میں نے ایک تاریخ شاہزادے کی ولادت کی

---

[۱] ہم کو یاد پڑتا ہے کہ یہ مباحثے سرشار سے نہیں بلکہ اودھ پنچ سے ہوئے تھے کیونکہ اودھ پنچ میں ایک سلسلۂ اعتراضات حالی پر ایک عرصہ دراز تک اس سُرخی سے چھپتا رہا "ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے ؛ میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے۔" اور آخر میں کچھ مضامین حالی کی تعریف میں بھی اس سرخی سے نکلے تھے "عیب حالی کے بہت تم نے گنائے اے پنچ ؛ اشک شوئی کو دو چار ہنر بھی کہہ دو۔"

مبارک باد میں بندگان عالی کی خدمت میں پیش کی جس کو اعلیٰ حضرت نے پسند فرمایا۔ میرا نام معزز درباریوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ منصب بھی ملے۔ اگر خدا نے چاہا تو میرا جدید ناول "گور غریباں" ایک ہفتہ کے عرصہ میں شایع ہو جائے گا۔"

کچھ عرصہ تک سرشار دبدبۂ آصفیہ کی ادارات کرتے رہے۔ اُن کا ناول چنچل اسی اخبار میں نکلتا تھا مگر پورا نہیں ہوا۔ "گور غریباں" جس کا ذکر ان کے خط میں ہے شائع نہ ہو سکا اور چنچل کوئی با وقعت تصنیف نہیں ہے۔ آخر عمر میں سرشار نے مے نوشی کی بڑی کثرت کر دی تھی اور یہی اُنکی قبل از وقت موت کا باعث ہوئی چنانچہ ان کا انتقال حیدرآباد ہی میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔

سرشار نہایت خوشگو شاعر تھے اسیر کے شاگرد تھے اور خوب کہتے تھے ۱۸۹۴ء میں اُنھوں نے اپنا ایک قصیدہ کشمیری کانفرنس میں پڑھا تھا اور ایک مثنوی تحفہ سرشار بھی لکھی ہے۔ جو اُس موقع پر کہی گئی تھی جبکہ پنڈت بشن نرائن در کی واپسی انگلستان پر پُرانے خیال کے کشمیری پنڈتوں میں ایک قسم کی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کی معقول باتوں سے لوگوں کی برہمی سفر ولایت کی نسبت ایک حد تک رفع ہو گئی۔

عام عادات و اخلاق سرشار حقیقی معنے میں آزاد مزاج تھے۔ قوت حافظہ بہت قوی پائی تھی اور تعصب اور مذہبیت سے بالکل بری تھے۔ باتیں بہت دلچسپ اور مزے کی کیا کرتے تھے اور طبعاً ظریف واقع ہوے تھے۔ شراب خواری نے اُن کے ساتھ بھی وہی کیا جو درگا سہاے سرور کے ساتھ کیا تھا یعنے ایک ہونہار زندگی کا جلد خاتمہ کر دیا۔ اُردو ناول کو انگریزی طرز پر لکھنے کا فخر انھیں کو حاصل ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ، ایک مشہور مصنف، اُردو کے زبردست زباندان، ظریف اور بذلہ سنج اور ایک طرز خاص کے موجد بھی تھے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُنکی شہرت کو کچھ تو لوگوں کے تعصب نے اور کچھ اُنکی ذاتی بے پروائی اور لاابالی پن نے کم کر دیا۔ اُنکی فسانہ آزاد اور دیگر تصانیف میں اکثر جگہ جو رطب و یابس اور درجہ سے گری ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں اُسکی وجہ یا تو اُن کے مزاج کی جلد بازی اور بے پروائی کہی جاسکتی ہے۔ اُنکی شراب نوشی کبھی اُن کے تخیل میں

پر لگا دیتی اور کبھی اس کے خمار سے اُن کا دماغ معطل اور بیکار ہو جاتا تھا۔ انھیں وجوہ سے نہ وہ کبھی اپنے مسودہ پر نظر ثانی کرتے اور نہ کبھی پروف پڑھنے کے عادی تھے۔ ہمیشہ برجستہ اور قلم برداشتہ لکھتے اور اگر کسی وقت پر قلم نہ ملتا تو تنکے سے کام نکال لیتے تھے۔ اسی بے پروائی اور بے اصولی سے اُن کے قائم کئے ہوے پلاٹ اُن کے دکھائے ہوے کیرکٹر اُن کے بیان کئے ہوے واقعات میں اکثر جگہ حد درجہ بے ربطی اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ جب کبھی اُن سے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شراب کی ایک بوتل پیش کرتے اور وہ اُس مضمون کو فوراً لکھ ڈالتے۔ مگر اس طبعی کمزوری کے ساتھ اُن میں خودداری اور آزادہ روی بھی اتنی تھی کہ کبھی کسی امیر و رئیس کی خوشامد نہیں کی، اور اپنی شہرت کے واسطے کسی دوسرے کے شرمندۂ احسان نہیں ہوے خود انکی قابلیت و طباعی اور ذہانت انکی شہرت کا حقیقی باعث تھی۔ آخر عمر میں البتہ وہ زمانے کے ہاتھ سے تنگ آکر حیدرآباد گئے تاکہ دولت آصفیہ کے زیر سایہ کچھ دنوں بفراغت زندگی بسر کریں۔ مگر بدنصیبی نے پرانی عادتوں کی طرح وہاں بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور آخر کار وہیں پیوند خاک اور غالب کے اس قطعہ کے مصداق ہوے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو	ہم سخن کوئی نہو اور ہمزباں کوئی نہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار	اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہو

تصانیف | اُن کے حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہیں:۔ فسانہ آزاد۔ سیر کوہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، گرم دھم، بچھڑی دولہن، ہُشّو۔ طوفان بے تمیزی۔ رنگے سیار۔ پی کہاں۔ شمس الضحٰی۔ والیس[1] کی کتاب رشیا، کا ترجمہ اُردو میں لارڈ ڈفرن کی کتاب "لیٹرز فرام ہائی لیٹی ٹوڈس" کا ترجمہ اُردو میں۔

فسانۂ آزاد | جیسا کہ اوپر بیان ہوا فسانۂ آزاد شروع میں اودھ اخبار کے کالموں میں نکلتا تھا۔ اسکی

---

[1] سر ڈونلڈ مکنزی والیس۔ لارڈ ڈفرن اور مارکوئیس آف لینسڈون کے پرائیوٹ سکریٹری نہایت قابل اور صاحب تصنیف اور بڑے سیاح تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کی دسویں ایڈیشن کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔

پنڈت رتن ناتھہ سرشار

پنڈت بشن نرائن در

اشاعت نے دنیائے اُردو میں ایک عجیب ہلچل ڈالدی جب یہ اخبار میں نکلتا تھا تو لوگوں کو اتنا اشتیاق ہوتا تھا کہ دوسرے پرچہ کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ پنڈت بشن نرائن در آنجہانی اس کتاب کی نسبت یوں رقم طراز ہیں :۔

"قصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے مگر ڈھائی ہزار گنجان صفحے پڑھتے چلے جائیے ذرا بدمزہ نہیں ہو جیے گا بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائے گا محض اس وجہ سے کہ عبارت آرائی غضب کی ہے۔ طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان۔ تازہ اور نیچرل تمثیلی اور واضح۔ پھر اُسکے ساتھ جابجا پُر لطف ظرافت۔ پھڑکتے ہوئے فقرے۔ مزیدار شوخیاں۔ ترکی بترکی جواب۔ حماقت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھکر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجائیں گے۔ آزاد اصل قصہ کا ہیرو ایک دولتمند نوجوان دنیادار شخص بہت حسین اور طرحدار۔ تعلیم یافتہ۔ کئی زبانوں سے واقف سپاہی پیشہ۔ ظریف شاعر۔ عاشق مزاج۔ چھچھے دار باتیں کرنے والا۔ اور ہر اچھی صورت پر مرنے والا۔ ایک طرف اعلیٰ سوسائٹی کی زیب و زینت دوسری طرف ایک بھٹیاری کا عاشق جاں باختہ۔ بیگمات کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے گھورنے والا۔ اتفاقاً یہ میاں آزاد ایک حسین دولتمند حُسن آرا نام پر لٹو ہوتے ہیں اس سے عشقبازیاں کرتے ہیں۔ آخر وہ اُن کے ساتھ اس شرط پر عقد کرنے کے لیے راضی ہوتی ہے کہ پہلے وہ ٹرکی جائیں لشکر اسلام میں نام لکھائیں۔ روسیوں سے نبرد آزمائی کریں۔ آزاد اپنی معشوقہ کے احکام کی بجا آوری خوشی خوشی کرتے ہیں۔ اور بقول شخصے بندھا خوب مار کھاتا ہے، ہل ہانکتے کودوں پھانکتے ٹرکی جاتے ہیں روسیوں سے لڑتے ہیں اور مظفر و منصور واپس آتے ہیں۔ اپنی جانبازیوں کے بدلے اپنی معشوقہ سے ایفائے وعدہ چاہتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ہے اصل قصہ اور جہاں تک قصہ کے پلاٹ کا تعلق ہے۔ اس سے بدتر اور بے مزہ تر شاید ہی کوئی قصہ انسانی دماغ سے نکلا ہوگا۔ مگر اسی قصہ کو رتن ناتھ در کی زبان سے سنئیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نگارخانۂ چین میں چلے جارہے ہیں جس کی دلکش جیتی جاگتی تصویریں لفاظ کا جادو تخئیل کی کثرت۔ مناظر کی چوبچالی ایسی ہے کہ جب اس آئینہ خانہ سے گزرتے ہیں تو کچھ یقین کچھ شک

کرتے ہوئے ایک طلسم کوہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زبردست بازیگر نے اپنے کرتبی ڈنڈے سے یہ سارا سماں ہمارے سامنے کھینچ دیا ہے۔

مندرجہ بالا ریویو لفظاً لفظاً صحیح ہے۔ فسانۂ آزاد کو پلاٹ کے تناسب کیرکٹر نگاری کے اسلوب اور قصہ کی تدریجی ترقی اور دلچسپی کے لحاظ سے نہ پڑھنا چاہیے۔ اصل قصہ کو ایک کھونٹی سمجھنا چاہیے جس پر نرالے واقعات ٹنگے ہوئے ہیں اور انھیں علیحدہ علیحدہ واقعات کے پڑھنے میں سارا لطف آتا ہے۔ وہ ان کا مذاق و ظرافت دلچسپ کیرکٹر وہ شوخیاں اور حاضر جوابیاں یہی سب باتیں کتاب کی جان ہیں فسانۂ آزاد میں مثل ڈوماکے ناولوں کے ساری عمدگی اور دلچسپی اشخاص قصہ کی باتوں میں ہے نہ کہ نفس قصہ کے بیان میں۔ سرشار مکالمہ کے استاد ہیں اور کیرکٹر نگاری کی خوبیاں طول طویل بیان سے نہیں بلکہ خود ان اشخاص کی گفتگو سے نہایت کامیابی سے دکھلاتے ہیں۔

سرشار کی مرقع نگاری سرشار مثل مرزا رجب علی بیگ سرور کے پُرتکلف اور مقفی عبارت نہیں پسند کرتے نہ وہ برائیوں کو چھپاتے اور اچھائیوں کو چمکاتے ہیں بلکہ ہو بہو تصویریں کھینچتے ہیں اور علی الخصوص اشخاص لکھنؤ والی وادنی امیر و غریب سب کے بے مثل مرقعے اپنے اس لاجواب کتاب میں کھینچ دیے ہیں۔ ان کے اشخاص قصہ سایہ کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں گزرتے، بلکہ وہ ہمارے آپ کی طرح گوشت و پوست کے بنے ہوئے چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ پنڈت بشن نراین در اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"اگر تم ان کے مجمعوں کے اندر جاؤ۔ غل غپاڑے والے طوفان بے تمیزی کے مجمعے۔ تو تم کو بڑی احتیاط سے جانا ہوگا کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی دھکا دھکی سے تم خود نہ گر پڑو اور اس کی احتیاط کرنا ہوگی کہ تمھاری گھڑی یا کوئی اور چیز جو تمھاری جیب میں ہے کہیں نکل نہ جائے۔ یہی حال ان کے محرم، چہلم اور عیش باغ کے میلوں کا ہے کہ تم وہاں اپنے تئیں ایک عجیب بھیڑ میں پاتے ہو جس میں بٹیر باز۔ پتنگ باز

ؔ اس نام کے دو ناولسٹ باپ اور بیٹے فرانس میں گزشتہ صدی میں بہت مشہور و معروف گزرے ہیں۔ ان کے اکثر ناول نہایت دلچسپ ہیں۔ ۱۲

ایمی۔ زرق برق نواب مع اپنے ڈیڑھ ہزار روزرد مصاحبوں کے۔ رنڈیاں گاڑیوں میں سوار کسی بڈھے فیل سوار تماشبین سے آنکھیں لڑا رہی ہیں۔ فقیر گاڑیوں کے پیچھے دوڑتے دعائیں دیتے جا رہے ہیں اور اگر کچھ نہیں ملتا ہے تو چپکے چپکے سیکڑوں صلواتیں سُناتے ہیں۔ فاقہ مست عاشق۔ رنگیلے بیکار۔ عورتیں خوبصورت بدصورت۔ کوئی اپنے کھوئے ہوئے بچّے کو آواز دے رہی ہے۔ کوئی اپنے یار سے لڑ رہی ہے۔ کوئی کسی نواب کے مصاحب خاص سے ناز و انداز کی باتیں کر رہی ہے۔ پولیس کانسٹبل۔ چور۔ اُچکّے جُنگی کے محرّر ریلوے بابو۔ ٹھاکر صاحب کسی قریب کے گاؤں سے میلا دیکھنے آئے ہیں۔ لالہ بھائی کسی تنبولی یا تنبولن سے فارسی لغت چھانٹ رہے ہیں۔ انگریز تماگر بچویٹ سگرٹ مُنھ میں دیا ہوا۔ نیو فیشن کے مسلمان ٹرکی ٹوپی ڈاٹے۔ بنگالی بابو مہین نرم دُھوتیاں ہوا میں اُڑاتے ہوئے۔ یہ ہے وہ مجمع جس کی سرشار تمکو سیر کراتے ہیں جس میں ہزاروں مختلف آوازیں تمھارے کانوں میں آرہی ہیں اور چار و ناچار زندہ چلتے پھرتے باتیں کرتے غل مچاتے انسانوں کا ایک سمندر موجزن ہے اور پھر ان سب پر طرّہ یہ کہ اس عظیم الشان مجمع میں ہر آدمی کو اُس کی بات چیت اور اُسکے حرکات و سکنات سے تم بخوبی پہچان سکتے ہو۔"

فسانۂ آزاد بلکہ سرشار کی اکثر ناولوں کی خاص خصوصیات یہ دو چیزیں ہیں۔ یعنے (۱) لکھنؤ کی اس زمانے کی سوسائٹی کی ہوبہو تصویریں کھینچنا اور (۲) شوخی و ظرافت۔ ہمارے نزدیک کسی شاعر یا ناثر نے اس سے قبل لکھنؤ کے آخری دورِ تمدّن اور سوسائٹی کی صحیح تصویریں اس قدر جزئیات کے ساتھ کبھی نہ کھینچی ہوں گی۔ سرشار پُرانے رنگ کے نوابوں اُنکے افعال و اشغال اُن کے مصاحبوں اور ہم جلیسوں کے سچّے نقشے کھینچنے میں کمال رکھتے ہیں اور باوصف اسکے کہ وہ ہندو تھے[۱] مگر سخت حیرت ہی کہ مسلمانوں کے بڑے گھرانوں کے اندرونی حالات اور بیگمات کی طرزِ معاشرت اور بول چال سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ

---

[۱] یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ یہ اُس زمانے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور دلی اتحاد کا بیّن ثبوت ہی دوسری مثال اس کی نظیر اکبر آبادی کی ہے جنھوں نے ہندوؤں کے تہوار میلے ٹھیلے یہاں تک کہ اُن کے مذہبی معتقدات تک کو کس قدر واقفیت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اب جبکہ دونوں قوموں کے درمیان نفسانیت اور تعصّب کی آگ آہنی دیوار قائم ہے تو یہی باتیں تعجب اور حیرت کی معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۲۔

کوئی مسلمان بھی اُن سے بہتر نہیں جان سکتا۔ اُنھوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھا دیا ہے اور ہم ہندو اور مسلمان حرم سراؤں کے اندرونی حالات نہایت صفائی سے بالکل بے پردہ دیکھتے ہیں۔ اُن کو مختلف پیشہ وروں کی خاص خاص اصطلاحیں مختلف جماعتوں کی خاص خاص بولیاں اور اُنکا طرز ادا، دیہاتی بولی، بیگمات اور انکی مغلانیوں اور ریشمی خدمتوں کی بات چیت۔ بھٹیارے اور بھٹیاری، افیمی، چنڈو باز، شرابی، چور اُچکوں کی زبان۔ دیہاتی کو کھے ٹھاکروں اور پڑھے لکھے لالہ بھائیوں کا طرز تکلم۔ ان سب پر اُن کو کامل عبور حاصل ہے۔

سرشار کی شوخی اور ظرافت

اُن کا مذاق کامل، مہذب اور آزادانہ ہے۔ البتہ اس میں غالب کی سی لطافت اور نمکینی نہیں ہوتی اور الفاظ کی رو میں اور محاکات کے شوق میں کبھی وہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں اور اُنکا سمند طبع اس قدر بے قابو ہو جاتا ہے کہ وہ فحش سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ مگر باوجود اسکے اس خاص چیز یعنے شوخی اور ظرافت میں کوئی ان کے قریب تک نہیں پہونچتا۔ مکالمات لکھنے میں وہ کمال رکھتے ہیں علی الخصوص ادنی طبقہ کی بول چال اُنکے بندھے فقرے اُنکے ضلع جگت کو وہ من و عن ادا کر دیتے ہیں اس رنگ زمانہ کو بے نقاب کرنے کی نسبت پنڈت بشن نرائن در، اپنے اُسی مضمون میں جس سے بعض مقامات اوپر نقل کیے گئے اس طرح رقمطراز ہیں:-

"بے ادبی و گستاخی، پرانے رسوم و خیالات کا استیصال، دنیاوی لذتوں سے تمتع۔ موجودہ چیزوں کی ناپسندیدگی یہی سب خیالات ان کے زمانہ میں لوگوں کے دلونکو مسخر کیے ہوئے تھے اور وہ خود بھی یہی خیالات رکھتے تھے پس کوئی شخص اُن کی سچائی اور راست بیانی پر اعتراض نہیں کر سکتا جبکہ وہ اپنے کلام کو اس رنگ میں ڈبوتے ہیں اور اس کو طرح طرح کی خوبیوں سے آراستہ بھی کرتے جاتے ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ اس آزادانہ تحریک کے بڑے حامی ہیں کہ جو پرانے خیالات اور قدیم رسم و رواج کو توڑنا چاہتی تھی۔ ہر سوسائٹی کے منازل ارتقا میں ایک ایسا درجہ ضرور آتا ہے کہ جب عیوب اور غلطیوں کی اصلاح کے واسطے ظرافت اور استہزا مثل وعظ و نصیحت کے مفید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اور جب بدکاری کی بُرائی دکھانے کا یہی بہترین طریقہ ہے کہ وہ عُریاں کر کے دکھائی جائے۔ بہت سی غلطیاں جو غلط

و نصیحت سے اصلاح نہیں پاسکتیں اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک مذاقیہ جملہ سے بالکل دہل جاتی ہیں اور ایک طنز آمیز قہقہہ کی گولی عیوب کی تیز پرواز چڑیا کو فوراً گرا دیتی ہے۔ رتن ناتھ سے جب کسی اخلاق آموز واعظ یا مولوی سے۔ کسی پرانے خیال کے چھوت چھات ماننے والے سے۔ کسی دولتمند پر گھمنڈ کرنے والے یا حسب و نسب پر فخر کرنے والے سے مڈبھیر ہوتی ہے۔ اور وہ انکی پند و نصیحت کو، انکی ڈینگوں اور شیخی کی باتوں کو سنتے ہیں تو وہ اُن سے بحث و مباحثہ نہیں کرتے نہ کبھی اُن سے لڑنا جھگڑنا چاہتے ہیں بلکہ صرف ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ اور گو کہ متانت پسند لوگ ان کی اس ادا کو ناپسند کریں مگر باقی اور لوگ جو اس تماشے کو دیکھتے اور انکی باتوں کو سنتے ہیں ہنسی کے مارے لوٹ جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسخرہ نے اپنی باتوں سے اُن کے دلوں کو موہ لیا اور اس کے بعد سے وہ لوگ جو مسخرہ کے ساتھ ہنس چکے پھر کسی واعظ کی تعلیم و تلقین پر نہیں رُوتے۔ بس رتن ناتھ کی نصیحت کا یہی طریقہ ہے۔ وہ تمسخر کرتے ہیں ہنستے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم انکو سوسائٹی کی برائیوں کا ایک بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں مگر وہ کسی خاص اصلاحی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے انھوں نے کسی پیغمبر یا مصلح قوم کی طبیعت نہیں پائی تھی وہ دل سے مسخرے اور ہنسی میں اڑا دینے والے تھے۔"

سرشار کی کیرکٹر نگاری سرشار کیرکٹر نگاری کے اُستاد ہیں مگر وہ ہو بہو نقشے نہیں کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مبالغے سے بھی کام لیتے ہیں اسی وجہ سے اُن کے کیرکٹروں میں ڈکنس اور تھیکرے[1] دونوں کا مجموعی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام کیرکٹروں میں جو خاص اور ممیز باتیں ہوتی ہیں اُن کو چن لیتے ہیں اور انھیں میں وہ وہ شگوفے پیدا کرتے ہیں جن کو پڑھ کر آدمی ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے اُن کے کیرکٹروں کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل نیچر کے مطابق ہیں بس اُن کو پڑھو اور ہنسو اور یہی کافی ہے۔

خوجی خواجہ بدیع الزماں معروف بہ خواجہ بدیا مخفف خوجی[2]۔ وہ پرانا بے وقوف مسخرہ، آزاد کا ہمراز و

[1] انگلستان کے گزشتہ صدی کے دو مشہور ناولسٹ گزرے ہیں۔

[2] دنیائے افسانہ کے اس عجیب و غریب کیرکٹر کا سرشار نے جو خاکہ اپنے خاص رنگ میں کھینچا ہے حسب ذیل ہے: "گیدیوں کے قبلہ گاہ، بزدلوں کے پشت و پناہ، گاودیوں کی جان بلکہ روح رواں۔ دیوار حماقت کے پشتیبان، پکے پہلوان میاں خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع (آنجہانی) غریب کمبخت نادانی نہایت حیرانی اور غایت پریشانی سے دل ہی دل میں ...... (باقی بر صفحہ ۱۱۶)

یار غار، کمزوروں کو دبانے والا، رنگیلا، عیاش، رنڈیا، بدمعاش، جسمانی اور دماغی کمزوریوں کا پوٹ ہونا جس نے تئیں ہرگز ہونا نہیں سمجھتا بلکہ ہونا، کہنے سے سخت بُرا مانتا ہے اپنے گزشتہ کارناموں پر جو سراسر لغو اور جھوٹ ہیں ڈینگیں مارنے والا، جہاں جائے لوگ اُس پر آوازے کسیں اور پھبتیاں اُڑائیں، ہمیشہ اس

(بقیہ صفحہ ۱۱۵) ٹھنڈی سانسیں بھرتے سنہ گام جانے لگے اور چونکہ ماشاءاللہ ڈنڈ پیل جوان اور کامل فن پہلوان تھے یہ کیفیت ہوئی کہ دس قدم چلے اور تیورانے لگے۔ اللہ رے طاقت۔ اول تو پستہ قامت۔ ماشہ بھر کا قد دوسرے قطع شریف ازبس موزوں، اونٹ کی طرح کوئی کل درست نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ مدت کے بعد ایک چوبی قرولی جو کسی استاد نجار نے پیر مرد کو بطریق نذر دی تھی زیب دست تھی۔ مثل مشہور ہے دادا چلے کے گھر تیر۔ باہر ہے نہ بھیتر، کبھی دائیں ہاتھ میں لی بازار والوں کی طرف دیکھکر چمکائی کبھی بائیں ہاتھ میں لی اور اکڑ کے چلنے لگے۔ اب زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ دماغ فلک الافلاک پر ہے۔ اللہ رے نخوت اور کیوں نہو خدا نے حسن دیا تو گلو سوز۔ نور عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گراں ڈیل جوان دوسرے فن سپہ گری میں طاق کشتی کے پہلوان۔ بانک، پٹے، بانے، بنوٹ میں مشاق۔ اور خانہ جنگی میں شہرۂ آفاق اور سب صفتوں سے بڑھ کر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ میں بھاگتوں کے مقدمۃ الجیش۔ سپہ سالار نامدار بنتے تھے۔ کوئی اور بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے۔ اللہ رے بہادری۔ بازار میں اس عجیب الخلقت پہ جس کی نظر پڑتی بے اختیار ہنس دیتا تھا کہ واہ ماشاءاللہ کیا قطع ہے اور اس بونے پن پر اکڑنا اور تن تن کر چلنا اور اینڈنا اور تھمگام جانا اور مصنوعی قرولی سے بھیڑ کو ہٹانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانیے زمانہ بھر کے بے فکرے اُن کو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کوچے کی طرف سے خوجی نکل جاتے تھے لوگ انگلیاں اُٹھاتے تھے اور پھبتیوں کے چھرے چلتے جاتے تھے۔

(۱) ذری سنبھلے ہوئے حضرت دیکھیے کہیں ٹھو کر نہ لگے۔

(۲) آدمی کیا بگو کا ٹانگن ہے کیا کھٹ پٹ جا رہا ہے۔

(۳) ہم کو تو چنڈول معلوم ہوتا ہے (قہقہہ لگا کر)

(۴) کلجگ کے باون اوتار کے ذریات میں سے ہے۔

(۵) اکڑتے تو بہت جاتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چپت دے قرولی دروی چھین لے۔

(۶) ہاتھ پاؤں ماشاءاللہ کتنے سڈول ہیں۔

(۷) ارے میاں جھمن ذری ادھر تو دیکھو یہ بھیڑیے کے بھٹ سے نکالے گئے ہیں سُنا ابھی تک آدمی کی بولی نہیں بول سکتے۔ ۱۲

خیال میں کہ دنیا جان بوجھ کر اُس کی بُرائیوں اور خوبیوں پر خاک ڈالتی ہے اُس کا مسخرا پن، اُس کی دل لگیاں، اُس کی آزاد کے ساتھ محبّت و وفاداری، اُس کا اپنی چھوٹی سی تلوار لیکر پیترے بدلنا، اُس کا بات بات پر قسم کھانا اُس کی اپنی بُزدلی چھپانے ترکیبیں، انھیں سب باتوں سے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے اُس کے اکثر فقرے اور جملے اُردو میں ضرب المثل ہو گئے ہیں[ل] اس عجیب و غریب کیرکٹر کی آفرینش سے سرشار ہمیشہ یاد رہیں گے۔ تمام ادبِ اردو اُس کا مدمقابل اب تک پیدا نہیں کر سکا۔ وہ ادبِ ظریفانہ کی سب سے زیادہ اور رجنبل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہے۔

سرشار نے اپنے ناولوں سے ان نیچرل چیزوں کو خارج کر دیا

ایک خاص صفت ان کی تصانیف کی یہ ہے کہ انھوں نے غیر فطری جزو کو اپنے ناولوں سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دی۔ مولوی نذیر احمد کا بھی یہی خصیصہ ہے۔ مگر اُن میں اور سرشار میں یہ فرق ہے کہ اُن کے قصّے صرف اخلاقی اور نصیحت آموز ہیں جن کی غرض صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کو عورتیں پڑھیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں اور اسی وجہ سے ان میں دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ ہماری رائے میں سرشار سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصہ کے پیرایہ میں دل بہلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی ناولوں کی اصلی اور صحیح غرض ہے۔

نقایص کلام

سرشار کے قصوں میں مندرجہ ذیل نقائص بتائے جاتے ہیں (۱) پلاٹ مربوط اور منتظم نہیں ہوتے۔ فسانۂ آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصّہ نہیں لہٰذا مصنف جب واقعات میں ایک ترتیب و نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں، وہ تمام متفرق واقعات کو کبھی یکجا نہ کر سکے اور ان سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے۔ یہی کمزوری اُن کے دوسرے ناولوں میں بھی نمایاں ہے۔ اس کی وجہ بظاہر ان کی بے پروائی اور بے قاعدگی معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی چیز مستقل باقاعدہ طور پر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی طرح محنت اور شوق کے ساتھ کام کرنے سے گھبراتے تھے۔ اور اخبار کی ایڈیٹری یا اس کے واسطے قصے تیار کرنا اُن کو

ل خوجی کے جملے ضرب المثل نہیں ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح مثلیں بھی بولنے کا بہت شائق ہے۔ ۱۲

ایک بار گراں معلوم ہوتا تھا۔ افسوس ہے کہ ایسے طباع اور ذہین آدمی نے بوجہ اپنے وارفتگی مزاج اور پابندی قواعد سے گھبرانے کے اپنی خلقی طباعی و ذہانت سے پوری طرح کام نہیں لیا اور اسکی قدر نہیں کی (۲) یہی سبب اُن کے واقعات میں عدم تسلسل اور ابواب میں بے ربطی کا بھی ہے اور شاید اسی وجہ سے اُن کے کیرکٹروں میں ہمواری اور یکرنگی نہیں ہے جو قصّے کے سلسلے میں سیکڑوں رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ وقتی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہیں اور کیرکٹروں کے خصائص اُن کے دماغ میں قائم نہیں رہتے اسی وجہ سے وہ ان کو نباہ نہیں سکتے۔ فطری بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے اُن کا قلم سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ وہ لکھتے رہتے ہیں خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہو جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُنکی فکر میں قوت پرواز نہیں رہتی تو وہ زمین پر گھسلنے لگتے ہیں (۳) اُن میں فلسفیت اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ اسی وجہ سے فسانۂ آزاد کی آخری جلد اور سیر کہسار کے بھی آخری ابواب جن میں تعلیم نسواں، تہیا سوفی، اور ترک مے نوشی وغیرہ کے متعلق وعظ نما تقریریں ہیں نہایت بے مزہ اور بے اثر ہیں۔ جب وہ اس کوچہ میں قدم رکھتے ہیں تو پھر وہ سرشار نہیں رہتے (۴) اُن میں جذبات کی بھی کمی ہے اسی وجہ سے اُن کی تصانیف میں تصاویر درد و غم کا پتہ نہیں۔ ان کی جذبات نگاری جہاں کہیں ہوتی ہے مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور ادھر اُدھر کے اقوال و اشعار سے اس کمی کو وہ پورا کرنا چاہتے ہیں (۵) بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور غیر مہذب باتوں کا بھی ان پر الزام لگایا جاتا ہے اور فی الحقیقت انھوں نے بعض جگہ غیر مہذب اور سوقیانہ الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے اخلاقی احساسات کو ضرور صدمہ پہونچتا ہے۔ مگر اس کے جواب میں ان کی طرف سے دو عذر پیش ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمانہ کا جس میں وہ لکھتے رنگ ہی یہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کسی عیب کی خرابی صرف اُسوقت بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے جبکہ اُس کو عریاں کرکے دکھایا جائے ورنہ لوگ اسکی اصلی حقیقت سے متاثر نہونگے (۶) اُن کے قصوں میں کیرکٹروں یعنے اشخاص قصّہ کی اتنی کثرت ہے کہ اُن کے کھینچے ہوئے مرقعے اکثر پھیکے ہو گئے ہیں اور واقعات کی بھی اتنی کثرت ہے کہ تناسب قائم نہیں رہتا اور پڑھنے والے کی طبیعت میں فوراً واقعات سے پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سب اعتراضات اگر صحیح بھی مان لیے جائیں تو اُس

عظیم الشان خدمت کے مقابلے میں ہیچ ہیں جو انھوں نے اپنی تصانیف سے ادب اردو اور سوسائٹی کی انجام دی۔ اور اُن کے جزوی نقائص سے ہم کو اغماض کرنا لازم ہے۔

سرشار بحیثیت ایک صاحب طرز کے

سرشار کا بحیثیت ایک ماہر زبان اور ایک صاحب طرز کے بہت بڑا مرتبہ ہے صاف سلیس۔ بامحاورہ اور زوردار عبارت لکھنے میں اُن کو اپنے ہمعصروں پر فوقیت حاصل ہے اور بحیثیت ایک صاحب طرز کے گو وہ آزاد سے دوسرے نمبر پر ہوں مگر اور سب سے وہ ضرور بڑھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے نہایت موزوں تھا اور اُن کی تصانیف میں لوگ نفس قصّہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر چند کہ بعض آدمیوں نے اُن کی زبان اور محاورات پر بھی اعتراض کیے مگر اس قسم کے اکثر اعتراضات غیر منصفانہ اور حسد و تعصّب پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان میں وہ ضرور بے روک ٹوک ہیں اور کبھی ضرورت سے زیادہ صرف محاورات واصطلاحات کرتے ہیں مگر اس کی وجہ وفور خیالات اور قدرت زبان کہی جاسکتی ہے۔

سرشار اور سرور کا مقابلہ

مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں تکلف اور آورد بہت ہے اور سرشار کی عبارت واضح بے تکلف اور نیچرل ہوتی ہے۔ سرور چیزوں کا بیان کرتے ہیں اور سرشار آدمیوں کا۔ سرور آئیڈیل (خیالی) تصویریں کھینچتے ہیں اور تصویروں کے محاسن کو اُبھارتے اور معایب کو چھپاتے ہیں برخلاف اس کے سرشار کی تصویریں بالکل سچّی اور ہوبہو ہوتی ہیں۔ اور اچھائیاں اور بُرائیاں سب وہ بے تکلف ظاہر کر دیتے ہیں۔ سرور کے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک باغ میں کھڑے ہوئے ہیں اسکے بیچوں بیچ میں ایک خوبصورت نہر جاری ہے جس میں صاف موتی سا پانی بہتا ہے اور اُسکے کناروں پر گلاب اور ترشاشے کے پھول مہک رہے ہیں۔ سرشار ہمکو ایک عظیم الشان دریا کے پاس کھڑا کر دیتے ہیں جسمیں ہوا کے زور سے لہریں اُٹھ رہی ہیں اور دریا کے قریب آس پاس کے جنگل سے سنّاٹے کی آواز آرہی ہے کبھی کبھی دریا کے صاف پانی پر کوئی گندی اور خراب چیز بھی بہتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ سرور کے مرقعے اسوجہ سے دلچسپ اور حسین ہیں کہ وہ اُن چیزوں سے جنکو وہ بیان کرتے تھے خود بڑی محبت رکھتے تھے اور انمیں کوئی عیب نہیں دیکھتے تھے۔ سرشار برخلاف اس کے جس سوسائٹی کا خاکہ کھینچتے ہیں اُس کو پسند نہیں کرتے بلکہ

اکثر موقعوں پر تو اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس نفرت و ناراضی کو وہ کہیں چھپاتے نہیں پس
کہا جا سکتا ہے کہ سرور قدامت پسند ہیں اور زمانۂ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں اور سرشار اس نئی تحریک کے
حامی ہیں کہ جو فنون لطیفہ کو تکلف اور قدامت پسندی کے نیچے چھڑا کر آزاد کرنا اور اُس کو نیچر کا تبع
دیکھنا چاہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ زمانۂ حال اور مستقبل دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی
عبارت کے نمونے پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو دونوں کے رنگ طبیعت سے آگاہی حاصل ہو منشی سجاد حسین کے
مشہور ناول حاجی بغلول سے وہ مقام لیا جاتا ہے جہاں "حاجی صاحب" اپنی معشوقہ کنڈے والی کو
یاد کر کے اُس کے تصور سے اپنے دل ہی دل میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور فسانۂ آزاد جلد چہارم سے
اُسی کے قریب قریب وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے جس میں خوجی بمبئی پہونچنے سے کچھ پہلے جہاز پر اپنی معشوقہ
شُتاب جان درزن سے ملنے کے خیال بے چین ہو رہے ہیں اور اسی کے متعلق آزاد سے باتیں ہو رہی ہیں۔
(ماخوذ از حاجی بغلول) ناظرین ذرا چلیے اسوقت تنہائی میں حاجی صاحب پڑے کراہ رہے ہیں کان
لگا کر سنیے تو کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر دیکھیے دور ہی رہیئے نزدیک گئے اور سارا کھیل بگڑ گیا۔ آپ کہہ رہے ہیں۔

اے نیک بخت افسوس تجھ کو خبر نہیں کہ کوئی حاجی جان دیتا ہے۔ یوں دم توڑتا ہے آپ کھیتی باڑی
میں جی بہلاتی ہوگی یا گھر کے چلّی چولھے میں پڑی ہوگی (اے توبہ مصروف ہوگی) یا اُپلیاں پیاری پیاری
بناتی ہوگی۔ مگر یہاں سوکھ سوکھ کر عشق کی دھوپ میں ہم کنڈا ہوے جاتے ہیں تمکو کیا نام کرجانا چاہیے
ہم بنوا کنڈے جس کی آنچ ایسی تیز ہوتی ہے کہ پتال جنتر میں عرق اور تیل اُسی سے نکل سکتا ہے کیمیا کے
نسخے اُسی سے تیار ہوتے ہیں۔ ہائے افسوس۔ کیا نام کہ حضور کی محبت میں کیسے کیسے مخمصے اٹھائے لوگوں کا
اُدھر کے کھیت میں لے جانا۔ گھوڑی پر سے گرنا۔ عمل خوانی میں کڑی سہنا۔ یہ سب واقعات ہیں جنکا ناول
میں ذکر ہے) مگر حاجی عاشق صادق ہے جو تسلیم و رضا کی سپر لگائے سب چوٹیں کھاتا ہے۔ ورنہ کیا نام کہ
مجال تھی کسی کی انگلی تو دکھائے مارے جریبوں کے بھُرتا کر دیا ہوتا۔ مگر نہیں عاشقی کے ضابطہ کے خلاف
یہ بات تھی جس گاؤں کو تم اپنے جلوہ سے رشک ارم بنا دو وہاں کا گدھا اور ٹٹو بُراق اور دُنبہ ہو اور آدمی تو

ہماری آنکھ میں حور اور غلمان ہیں۔ دم بھر کو کوئی سسرال جاتا ہی جو تھی کھیلی جاتی ہے۔ کھلا ہے کوئی مرد آج اس میدان میں جو عشق بازی میں آپ کے حاجی کا مقابلہ کر سکے۔ ہائے میں آج کو کوا ہوتا اور جہاں تم ہوتیں وہاں بیٹھ کے قاؤں قاؤں کی صدا سناتا تم ہنکانے اٹھتیں اور ہم تمہارے سر پر آ بیٹھتے۔ ہائے تمنا ہے کہ ہم تمہارے گائے بھینس ہوتے اور کیا نام کہ تم ہمارے گلے میں رسی باندھکر چرانے لے جاتیں۔ پٹھوں پر تمہارے نازک ہاتھ پھرتے۔ تم دودھ دوھتی ہوتیں اور ہم تمکو جانے ہوتے کیا نام کہ اگر کہو تو بمبئی چلیں اب تو ہم آپ کے عاشقوں میں ہو گئے۔ آجتک کبھی یہ چوٹ نہیں اٹھائی مگر قسمت کا لکھا ہوا اب تو ہم دنیا میں تمہارے عاشق مشہور ہو گئے۔ سب پر بھید کھل گیا ؎ مر دل کے مونڈھے پہ بیٹھو صنم تم ۔ تن را گھٹ کر ٹھٹیرا ہوا ہے آہ یہ کمر کا درد۔ تمہارے عشق کی چوٹ ہے جو سارے جسم و جان میں پھیلی ہوئی ہے افسوس ؎

سوختیم و سوزش ما بر کسی ظاہر نہ شد
چوں چراغاں در شب مہتاب بے جا سوختیم

ہائے سینے میں الاؤ لگا ہوا ہے۔ بھس کی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔

(ماخوذ از فسانۂ آزاد جلد ۴) اتنے میں ملاحوں نے کہا اب بمبئی سامنے سے نظر آتی ہے سنتے ہی خوشی کی باچھیں کھل گئیں۔ چلا کر کہا یا رو ذرا دیکھنا بی شتاب جان صاحب کی فنیس تو نہیں آئی ہے کرم بخش نام مہری ساتھ ہو گی۔ اطلس کا جھپکا ہے اور کہاروں کی پگڑیاں وردی رنگی ہوئی ہیں۔ مچھلیاں ضرور لٹکتی ہی ہوں گی۔ بی شتاب جان ہوت۔ اے شتاب جان صاحب آزاد پاشا آواز آئی اے یار آواز آئی ہو تو خدا کا واسطہ بتا دو۔ بی شتاب جان۔ اے کرم بخش مہری۔ مہری کیا بہری ہے لوگوں نے سمجھایا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجیے بی شتاب جان اور کرم بخش یہاں سے کیونکر سن لیں گی۔ کہا اجی ہٹو بھی تم کیا جانو کبھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو۔ اے نادان عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں۔ اور کون کوس کڑی منزل کے کوس۔ کیا شتاب جان نے آواز سنی ہو گی واہ بھلا کوئی بات ہے مگر جواب کیوں نہ دیا۔ یہ پوچھو اس میں ایک لم ہے پوچھو وہ کیا وہ یہ کہ ع معشوق ہیں نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو

اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں۔ مزا جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوے ادھر اُدھر ڈھونڈھتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شتاب جان صاحب اجی بی صاحب وہ دوہ بیخبری میں پیچھے سے ایک ڈھول جمائیں اور تنک کر کہیں مونڈی کاٹا آنکھوں کا اندھا نام نین سُکھ غل مچاتا پھرتا ہے۔ شتاب جان شتاب جان ارے بی صاحب تیری بی کو کیا کہوں موئی کہیں چرخہ کاتتی رہی ہوگی۔ اور ہم ڈھول کھا کر کہیں کہ دیکھیے سرکار ابکی ڈھول لگائی تو خیر جواب ڈھول لگائی تو بگڑ جائینگی بس کہدیا ہی۔ اور وہ جھلا کر ایک اور جمائیں کہ اینجانب کی ٹوپی گھوڑے پر جا کر گرے۔ اور ساتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تڑاتڑ دو چار اور جمادیں۔ تب ہنس کر کہوں۔ جان من خدا گواہ ہی اس وقت پیٹ پھرا ہے ورنہ مارے بھوک کے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ سفر اور پردیس میں ایسی چاند تارہ مہ پارہ کہاں ملتی جو بے دھڑک ڈھول پر ڈھول جماتی۔ اور ابھی کیا ہے پیاری ذرا تہ دل ہو کر بیٹھیں تو پھر دو ایک جوتے ضرور لگانا۔ ہاں بے پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہے۔

آزاد۔ بالفعل کہیے تو خاکسار ہی لگادے۔

خوجی۔ (مسکرا کر) اے نہیں حضرت آپ کو تکلیف ہوگی۔

آزاد۔ واللہ کس مردود کو اپنے حساب تکلیف ہو۔ دو جوتوں میں آپ اس درجے کو پہونچ جائیں کہ پھر عمر بھر آرام سے سوئیے ع نے غم دزد نے غم کالا۔ یا کہیے نقط سُنگھا ہی دوں۔ گو تکلیف ہو کچھ پرواہ نہیں۔ اس کا کہاں تک خیال کروں گا۔

خوجی۔ میاں پہلے منھ دھو آؤ۔ دلگی نہیں ہے۔ ان کھوپڑیوں کے سہلانے کے لئے پریوں کے ہاتھ چاہیے نہ کہ تم ایسے دیوزادوں کے۔

آزاد۔ خدا کرے جس وقت آپ پر پاپوش کاری کریں اُس وقت ہم بھی ہوں۔ کہتا جاؤں کہ ہماری خاطر سے ایک اور پھر پڑے۔ اب کی رنگت جاٹ گئی۔ اب کے خوب چٹاخ سے آواز آئی۔ ہاں ذرا ایک اور اور ذرا دو تک آواز جائے ؎

ناصح کے سر پہ ایک جمائی چٹاخ سے ۔۔۔ پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

اتنے میں ساحل بحر نظر آیا۔ تو خواجہ صاحب نے غل مچایا۔ شتاب جان صاحب اجی حضور کا غلام فرزندانہ آداب عرض۔ اسقدر کہہ چکے تھے کہ لوگوں نے قہقہہ لگایا اور خوجی متحیر ہوئے کہ یہ کیا اسرار ہے۔ آزاد سے پوچھا اس خندہ بے محل کا کیا سبب۔ آزاد بولے آپکی حماقت اسکا سبب ہے گدھا پن خود کرتے ہو اور اوپر سے ہم سے پوچھتے ہو کہ اس کا کیا سبب ہے۔ کیا فقرہ کہا تھا آپنے ذرا پھر فرمائیے گا خواجہ صاحب نے طیش کھا کر پھر وہی فقرہ سنایا۔ اجی حضور غلام فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد۔ تو آپ شتاب جان کے صاحبزادہ فرزند دلبند ہیں۔

خوجی۔ یہ کاہے سے۔ صاحبزادہ ہیں یا میاں ہیں شوہر خاص۔

آزاد۔ پھر یہ فرزندانہ آداب کیسا ہوتا ہے۔ جو رو کو کوئی فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے تو آپ کی بیوی کیا آپ کی والدہ شریفہ ٹھہریں؟

خوجی (گالوں پہ تھپیڑ مار کر) ارررر! غضب ہو گیا برا ہوا واللہ ستم ہو گیا سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ ایسے خفیف ہوئے کہ توبہ ہی بھلی۔ ارے ہے خفت ہی خفت ہے۔ مگر چھڑے کی زبان پھسل گئی لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا۔ اور وہ بھی اپنی پیاری شتاب جان کی نسبت۔ جی۔ پھر دریں چہ مضائقہ باشد۔ اب تو صاف صاف فینس نظر آتی ہے وہ دیکھئے ہوا سے زلف درہم برہم ہوئی جاتی ہے ؎

سمجھ کر چھیڑ اے مشاطہ اس کی زلف پر خم کو

خدا کے واسطے برہم نہ کر اسباب عالم کو

وہ جھری سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ اخاہ اب تو بی کرم بخش بھی بازو پر ہیں۔ سرو قامت رشک شمشاد۔ اس حور کردار کی جھری کھلی پڑی ہے۔ وہ ہنسی اوہو ہو ہو۔ دُر دندان نے مار ڈالا کیا پیارے دانت ہیں ؎

چمک لعل بدخشاں کی مٹادے ترے ہونٹوں پہ ایسا رنگ پان ہے

یاران مژدہ باد کہ عروس مانوس من دنگار گلعذار من وصبیہ من بی شتاب جان امت حسن

از بھروکہ ذرز نگاہ رامی بیند وہی گوید سے

یار نام خدا ہے کشتی میں ناخدا آج پار بیڑا ہے

آزاد۔ یار عمر بھر میں برجستہ شعر آج ہی سُنا حسب حال۔

خوجی۔ درست اور وہ شعر جو کانسل کے نام ہم نے لکھا تھا۔

اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو

(مصرع ثانی حذف شد) والائے تو

آزاد۔ مگر ایک غچہ پھر کھایا۔ پہلے شتاب جان کو اپنی مادر مہربان بنایا۔ اب کے ایک ایسا کلمہ کہا کہ پھر جھیپ جاؤگے زبان سے کہنا ہی نہیں۔

خوجی۔ کیا طاقت ہم نے کہا کیا تھا۔ یہی کہا تھا نہ۔ کہ عروس من و نگار من و صبیّہ من بی شتاب جان پھر کیا عروس نہیں یا صبیّہ نہیں ہے۔

آزاد۔ لعنت خدا۔ اے کمبخت۔ عربی میں صبیّہ لڑکی کو کہتے ہیں۔ لے اب سر پیٹو۔ کبھی ماں بناتا ہے کبھی لڑکی۔ اور پھر اوپر سے غرّاتا ہے۔

خوجی۔ (سر پیٹ کر) زبان تراش ڈالنے کے قابل ہے لیکن خیر گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط

آزاد۔ یار وہ دیکھو سامنے کیا تو رکا بہّا نظر آیا۔

خوجی۔ یہی ہماری شتاب جان ہیں۔ کیا صورت ہے سے

چہرۂ گلگوں ہے گلشن۔ قامت موزوں ہے سرو

گوش نازک ہیں گلِ تر۔ غنچۂ گل ناک ہے

جلوہ گر خالِ سیہ ہے۔ رُخِ آتشناک پر

چشمۂ خورشید میں زنگی گر تیراک ہے

مولوی عبدالحلیم شرر | ایک دوسری زبردست ہستی جس نے اردو ناول کی اشاعت و ترقی میں بڑی اعانت کی مولوی عبدالحلیم شرر ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں تاریخی ناول لکھے قصّہ کے پلاٹ اور کیرکٹروں کی

مولانا عبدالحلیم شرر

ترقی پر توجہ کی اور نیز اپنے طرز تحریر سے ثابت کر دیا کہ صاف بے آرائش کی ہوئی زبان ہی ناول نویسی کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ انھوں نے ناول کو غیر مہذب اور سخیف الفاظ و مضامین سے پاک کیا اور اپنی وسیع معلومات سے وہ مواد فراہم کیا جو اُن کی تصانیف کے کام آیا۔ وہ صرف ناول نویس ہی نہ تھے بلکہ مؤرخ، ڈرامانگار، ادیب، اور ایک زبردست جرنلسٹ بھی تھے۔

[یہاں سے صفحہ ۱۳۳ تک خود مولانا شرر صاحب مرحوم کے بیان کردہ حالات زندگی، جو انھوں نے بعد نظر ثانی بغرض اشاعت مجھ کو عنایت فرمائے تھے اور میرے پاس موجود ہیں درج کیے جاتے ہیں چونکہ یہی حالات کم و بیش مختلف عنوانات سے مصنف صاحب نے بھی اس کتاب میں بیان کیے ہیں لہذا اصل مضمون کتاب کے بجائے اسی پر اکتفا کی گئی۔ مترجم]

جمعہ کے دن ۲۰۔ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ کو غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے نانا چونکہ دربار اودھ میں رسوخ اور معزز حیثیت رکھتے تھے لہذا اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ انگلستان گئے اور وہاں سے واپس آکے ٹیابرج کلکتہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ تمام خاندان کو چونکہ اگلے شاہی دربار سے وابستگی تھی لہذا مولانا کے دیگر بزرگ اور والد بھی انھیں رسیّوں میں بندھے ہوئے ٹیابرج کلکتہ پہونچے مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب عربی و فارسی میں کامل بصیرت رکھنے کے ساتھ ایک پختہ مغز طبیب تھے ۱۲۸۵ھ میں جبکہ ۹ سال کی عمر تھی کلکتہ گئے۔ اور اسی وقت سے گویا تعلیم شروع ہو گئی گو ایک ناقص طریقے پر لکھنؤ میں بھی ابتدائی تعلیم ہوتی رہی تھی۔

ٹیابرج میں ابتداءً اپنے والد صاحب سے اور چند اور اساتذہ سے ابتدائی کتب فارسی عربی پڑھیں مولوی سید علی حیدر صاحب اور مولوی محمد حمید صاحب سے کچھ معقولی و ادبی کتابیں پڑھیں مولوی مرزا محمد علی صاحب مجتہد سے چند اوپر کی منطقی کتابیں پڑھیں۔ حکیم محمد مسیح صاحب سے بعض کتب طبیہ پڑھیں۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی مگر پرائیوٹ طور پر اور بالکل ناقص۔ اخبارات کا ذوق اسی زمانے سے پیدا ہو گیا تھا کیونکہ ان دنوں اودھ اخبار میں بحیثیت کارسپانڈنٹ خبریں لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔

انیس [19] سال کی عمر میں کلکتہ سے تعلق ترک کر کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی اور مولوی محمد عبدالحی صاحب

مرحوم سے کتب درسیہ عربی ختم کیں۔ بیس برس کی عمر میں ماموں کی بیٹی سے شادی ہوئی اور شادی کے بعد ہی حدیث کا شوق ایسا غالب ہوا کہ دہلی چلے گئے اور مولوی محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور اُنکے مدرسہ میں رہ کے حدیث کی تعلیم تکمیل کو پہونچائی۔ اب اسکے بعد انھیں انگریزی کا شوق ہوا۔ اور انگریزی جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خانگی طور پر بے انتہا محنت شروع کی اور چند روز میں بقدر ضرورت دستگاہ پیدا کرلی۔

اسی زمانے میں انھیں منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم سے صحبت ہوئی۔ جو بعض اخبارات اور خصوص اودھ پنچ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اور اُنکا فارسیت کا مذاق بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُنکے شوق دلانے سے بعض اخبارات میں مضامین لکھنے لگے۔ جن میں بجائے پالٹکس میں منہمک ہونے کے انشاپردازی کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور صاحب نے انھیں اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں لے لیا۔ یہ نوعمری کا زمانہ تھا طبیعت زوروں پر تھی اعلیٰ خیال آفرینی کے ساتھ فلسفیانہ معنے آفرینی اور لٹریری مذاق بڑھا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے مضامین اس زور شور سے لکھنا شروع کیے کہ ہر جگہ شہرت ہوگئی اور ایسی شہرت ہوئی کہ حیدرآباد میں اور بعض اور چھوٹی ریاستوں میں طلب کیے گئے مگر ناپسند کیا۔ سرسید سے گو شناسائی نہ تھی مگر انھوں نے "روح" کے سبجکٹ پر مولانا کا ایک مضمون اسقدر پسند کیا کہ منشی نول کشور کو لکھا "میں اس مضمون میں سے کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ لہذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا جس کا رنگ عبارت اسقدر دلکش اور دلفریب تھا کہ ہر طرف دھوم پڑ گئی۔ اسمیں اٹھارہ انیس نمبروں میں انھوں نے مسلسل صبح کا سماں دکھایا تھا جس نے تمام صاحب مذاق لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا۔ یہ رنگ اردو میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اُس میں فارسی کے تشبیہات و استعارات تھے مگر بندشیں انگریزی تھیں۔ گویا انگریزی عروس سخن کو فارسی و اُردو کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اسی ضرورت سے قافیہ بندی اور رعایت لفظی بالکل چھوڑ دی۔ اور اس سے بہت پرہیز کیا کہ نثر میں جابجا اشعار شامل کیے جائیں۔ ابتداءً

اس رنگ کے نباہنے میں اکثر جگہ عبارت اُلجھ جاتی تھی جس کی کچھ تو یہ وجہ تھی کہ اُردو نثر میں انگریزی کی طرح علامات اوقاف (پنکچوایشن مارکس) نہیں ہیں۔ اور کچھ یہ کہ مولانا کا ایجاد کیا ہوا رنگ ابھی پختگی کو نہیں پہونچا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ایسا اعتدال پیدا ہوا کہ ان کی عبارت نے خاص رنگ پکڑ لیا۔ اور ایسا مقبول رنگ کہ یہی طرز عبارت آج ساری اُردو انشاپردازی اور اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے۔

یہ اسی عبارت کی شان تھی کہ جس نے ایک دفعہ دیکھا بے انتہا گرویدہ ہو گیا اور فوراً اُس کو اختیار کر لیا۔ افسوس کہ شرر کے وہ اودھ اخبار اور محشر کے مضامین کسی نے علیحدہ نہیں چھاپے اور وہ اصل پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ ورنہ شاید اب ہندوستان بہ نسبت سابق کے اُنکی زیادہ قدر کرتا۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں منشی نولکشور کے تعلق کو چھوڑ دیا جس کا سبب یہ تھا کہ مطبع اودھ اخبار نے اسپشل کارسپانڈنٹ بنا کے حیدرآباد بھیجا تھا۔ مولانا گئے مگر چھ مہینے رہ کر واپس آنا چاہا۔ مطبع نے اس کی اجازت نہ دی۔ اور آپ خود ہی چلے آئے۔

اس زمانے میں انھوں نے اپنا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" لکھا جسمیں وقتوں اور حالتوں کا ایسا سماں دکھایا ہے کہ اُردو زبان میں بالکل نیا اور حیرت انگیز ہے۔ مگر چونکہ اس رنگ کا پورا ڈویلپمنٹ (فروغ) ہنوز نہیں ہوا تھا لہذا جا بجا اُلجھا ہوا اور پیچیدہ ہے اور اخلاق پسندی کی شان کھاتا ہے وہ ایک ہندوستانی معاشرت کا ناول ہے جس میں عشق کو دلچسپی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے تباہ ہوتے ہیں۔ سال بھر بعد اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا جو انشاپردازی کے اس نقص سے پاک تھا جو پہلے حصے میں ہے۔ اس میں نہایت پختگی حاصل ہو گئی ہے۔

اس کے دو سال بعد مولانا نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول درگیش نندنی کو اُسکے انگریزی ترجمہ سے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا کہ ایک اچھا انشاپرداز ترجمہ کرے تو اس میں کیسی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اب پبلک مولانا کے کلام کی بے انتہا مشتاق تھی۔ ہر طرف دست شوق پھیلا ہوا تھا کہ مولوی

بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر اور منشی نثار حسین صاحب نثار مالک پیام یار کے اصرار سے ۱۸۸۷ء میں مولانا نے اپنا مشہور رسالہ دلگداز جاری کیا۔ اُسکے شائع ہوتے ہی شوق نے سارے ہندوستان میں ایک سرگرمی پیدا کر دی اور اس کی اشاعت ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ اس میں خاص قسم کے ایسے مضامین تھے جن کے نمونے اگر کوئی ڈھونڈھے تو صرف انگریزی اعلیٰ لٹریچر میں مل سکتے ہیں اُردو کا خزانہ اُس وقت تک اُس سے خالی تھا کسی خیال کو مؤثر بنانا اور بغیر تشبیہ و استعارہ کے اور بغیر قافیہ بندی کے کسی مطلب کو دلکش و دلفریب بنا دینا دلگداز کے معجز نگار ایڈیٹر کا خاص حصہ تھا۔ اس کے مضامین اس قدر پسندیدہ اور ایسے دلکش رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ سررشتہ تعلیم کو بھی بغیر اس کے کہ مولانا کو اس محکمے سے کوئی کبھی لگاؤ ہو آپ کے مضامین لینے پڑے۔ اور اب ہندوستان میں اُردو کا کوئی کورس نہیں ہے جس میں دو ایک مضامین شرر کے نہ ہوں۔

۱۸۸۸ء میں دلگداز میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اور اُسوقت سے مسلسل وہ ناول شایع ہونے لگے جن کے نام ملک العزیز ورجنا، حسن انجلینا، منصور موہنا وغیرہ ہیں جن میں مورخانہ شان سے قدیم دلچسپ واقعات کو اعلیٰ لٹریچر کا لباس پہنایا گیا ہے۔ یہ ناول اسقدر مقبول ہوئے کہ اسوقت تک ان کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور مانگ ویسی ہی باقی ہے۔ بلکہ زیادہ ہے۔

شرر کے ناولوں اور نیز مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تاریخ کو اور خصوصاً اسلامی تاریخ کو حد سے زیادہ اسٹڈی کیا ہے۔ اور اسیوجہ سے مضمونوں اور ناولوں میں روز بروز خیال آرائی کا رنگ چڑھتا گیا۔ اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ صرف سادے الفاظ میں جوش پیدا کرنے اور واقعات کو انتہا سے زیادہ دلکش بنا دینے کی شان بڑھتی گئی۔ اُن کے آخری ناولوں میں ایک ”ایام عرب“ ہے جس میں جاہلیت عرب کی زندہ سوسائٹی ایسی عمدگی و خوبصورتی سے دکھائی گئی ہے کہ زمانہ حیرت کرتا ہے۔ ”فلورا فلورنڈا“ اور ”فتح اندلس“ وغیرہ میں اسپین کے اسلامی دور کو ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے کہ لوگ بار بار پڑھتے ہیں اور جی نہیں بھرتا۔

انھیں آخری ناولوں میں ناول ”فردوس بریں“ لکھی ہے اس کا پلاٹ ایران میں اور اس زمانے میں

دکھایا گیا ہے جب کہ جبال طالقان اور التمونت میں باطنیوں (اسیین لوگوں) کا زور تھا۔ اور ہزار ہا بندگانِ خدا اُن کے خنجر سے مارے جاتے تھے۔ اُن کے بادشاہ نے پہاڑوں میں ایک جنت بنا رکھی تھی جس میں وہ سب سامان فراہم کیا تھا جو مسلمانوں کے خیال میں جنت میں ہونا چاہئے۔ اس ناول میں عجیب حیرتناک طریقہ سے دکھایا گیا ہے کہ وہ لوگ کیونکر لوگوں کو فریب دیکر اپنا گرویدہ بناتے اور اپنی فلسفیانہ تقریروں سے انسان کو کیونکر اپنا فریفتہ کر لیتے تھے۔

تاریخی مذاق کے بڑھنے کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ مولانا شرر نے سنہ ۱۸۹۰ء میں مہذب نام کا ایک اخبار جاری کیا جس میں مسلسل علمائے اسلام کی سوانح عمری ہوا کرتے تھے۔ اس پرچے کی اشاعت بڑھتی جاتی تھی اور مسلمانوں میں نہایت مقبول تھا کہ یکایک سنہ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے دلگداز اور مہذب دونوں کو بند کر کے حیدر آباد کا سفر کیا۔ اور وہاں ریاست میں دو سو روپیہ ماہوار کا تعلق پیدا کر لیا جس کی وجہ ایک مدت تک وہ ملک کی نظر سے غائب رہے۔ اتفاقاً نواب وقار الامراء بہادر سابق مدار المہام مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے نواب ولی الدین خاں انگلستان میں ایٹن کالج میں تعلیم پاتے تھے اور چونکہ بچپن سے بھیجے گئے تھے لہذا مذہب سے بالکل آشنا نہ تھے۔ مولانا شرر کو وقار الامرا بہادر نے اس خدمت کے لئے منتخب کیا۔ اور سنہ ۱۸۹۵ء میں وہ انگلستان گئے جہاں چودہ پندرہ مہینے قیام رہا۔ اور موسیو کوربیں نام ایک فرانسیسی محقق سے فرنچ زبان شروع کی جس میں اتنی دستگاہ ہے کہ ڈکشنری کی مدد سے ترجمہ کر سکتے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۶ء کے آخر میں ہندوستان واپس آئے۔

سنہ ۱۸۹۸ء میں آپ نے حیدر آباد سے دلگداز کو از سر نو جاری کیا۔ مگر گیارہ ہی مہینے تک جاری رکھ کے خود ہی بند کر دیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی جناب سکینہ کی لائف آپ نے شایع کرنا شروع کی تھی۔ اُس میں چونکہ تاریخی تحقیقات کر کے اصلی واقعات لکھے تھے۔ وہ عام مسلمانوں میں اور خاصتہً شیعہ لوگوں کے خلاف ہوئے۔ اور ایک قسم کی شورش پیدا ہوئی بعض عہدہ داران گورنمنٹ نظام نے پرایویٹ طور پر آپ کو ہدایت کی کہ اس مضمون کا سلسلہ روک دیں مگر آپ نے جب یہ تنگی دیکھا تو بجائے اس مضمون کے خود پرچہ بند کر دیا۔ اور اُسے سنہ ۱۹۰۰ء میں پھر لکھنؤ آ کے

جاری کیا جس میں سب کے پہلے اُمّی سکینہ بنت حسینؑ کی لائف کا بقیہ تھا۔

اُس زمانہ میں ریاست دکن کے تعلقات قائم تھے۔ صرف مدار المہام مرحوم کی فیاضی اور سابق ہوم سکریٹری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کی کوشش سے آپ کو لکھنؤ میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے درمیان آپ واپس طلب کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلگداز بند کر کے آپ پھر حیدر آباد گئے۔ اس مرتبہ جانے میں یکایک ایسے انقلابات ہو گئے کہ آپ کے تعلقاتِ ریاست کو نقصان پہنچا۔ وقار الامرا بہادر وزارت سے علحدہ ہوئے اور چند روز بعد انتقال بھی کر گئے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب جن کو آپ سے خاص ہمدردی تھی اضلاع میں ڈپٹی کمشنری کی خدمت پر بھیج دیے گئے۔ نئے مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کو آپ سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ اور مسٹر واکر جو فنانس کا انتظام کرنے کے لیے آئے تھے اُن کے نزدیک ریاست کو مولانا کی ضرورت نہ تھی۔ غرض ریاست سے جو تعلق تھا جاتا رہا۔ اور جو تعلق وقار الامرا بہادر کے صاحبزادے نواب سلطان الملک بہادر کی سرکار سے تھا اُسے آپ نے خود ہی چھوڑ دیا۔ اور سنہ ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ واپس آ کے پھر پبلک کی خدمت شروع کر دی۔ جب سے دلگداز پھر جاری ہوا اور اس وقت تک جاری ہے۔

مولانا کا رنگ عبارت اسٹڈی کیا جائے اور اُس میں خاص حیثیت سے انسان منہمک ہو تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اُردو میں کیا چیز پیدا کی ہے۔ اُردو کے پرانے نمونے دو وضع کے تھے۔ ایک تو میر امن دہلوی کی سادی عبارت۔ اور دوسری مرزا رجب علی بیگ سرور کی فارسی مذاق کی رنگین اور مسجع و مقفیٰ عبارت۔ اس کے بعد جو اُردو کے نئے نئے مجدد پیدا ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔ سر سید احمد خان۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ مولانا نذیر احمد صاحب۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا محمد عبد الحلیم شرر۔ سر سید نے سادگی اور وہ شان اختیار کی جو کبھی مولانا شاہ اسماعیل کے قلم نے دکھائی تھی۔ یعنی ہر مضمون اس طرح ادا کیا جائے کہ عامی سے عام شخص اُس کو سمجھ جائے۔ مولوی محمد حسین کی شان یہ نہ تھی کہ زبان میں بے تکلفی و روانی ہو اور روانی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات و استعارات بھی بہت ہی معتدل حد تک ہوں۔ مولوی نذیر احمد صاحب صرف روانی چاہتے تھے اور بے تکلفی میں اس قدر حد سے بڑھ گئے ہیں کہ زبان کو جیسے

متین بنانا چاہتے ہیں تو سوا اس کے کہ عربی یا انگریزی جملے اور لغات داخل کردیں اُن کا کچھ زور نہیں چلتا۔ بندشیں وہی رہتی ہیں اور عبارت بھی وہی باقی رہتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ میں کوئی ایجادی مادّہ نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اتنا کہ اُن میں ظرافت کا مادہ بڑھا ہوا ہے۔ اُن کی عبارت دو طرح کی رہتی ہے ایک تو وہ جہاں وہ خود کوئی سماں کھینچنا چاہتے ہیں یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں اُن کی عبارت میں اور سرور کی عبارت میں کوئی فرق نہیں۔ وہی قافیہ پیمائی ہے۔ وہی مبالغے ہیں۔ وہی پُرانی تشبیہات و استعارات ہیں اور وہی جا بیجا اور ضرورت و بے ضرورت اشعار کا بھرتی کرنا ہے۔ بلکہ الفاظ بھی وہی پُرانے فارسی نثاروں کے ہیں۔ دوسری عبارت وہ جہاں عورتوں کی زبان سے وہ اُن کے خیالات ادا کرتے ہیں۔ اس میں سوا خاص خاص لغزشوں کے وہ لکھنؤ کی عورتوں کی زبان اچھی اور بے تکلف لکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سرشار کی زبان میں کوئی جدت نہ تھی سوا اس کے کہ خلاف قیاس مضامین کو چھوڑ دیا پُرانی عبارت اور اُن کی عبارت میں کوئی فرق نہ تھا۔ شرر نے اِن سب لوگوں سے علیحدہ ہو کے یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشاپردازی کی خوبصورت بندشوں کو اُردو میں داخل کیا۔ مگر تشبیہات و استعارات وہی پُرانے ایشیائی رکھے۔ انھوں نے خیالی مضامین کو لیا۔ اور اُن میں بالکل انگریزی جادو نگاروں کی سی خیال آفرینیاں کیں اور عجب خوبصورتی کے ساتھ انھیں اُردو میں کھپا دیا۔ اُردو پبلک میں بتداءً یہ نیا رنگ تھا۔ انگریزی دانوں کو اُردو میں وہ چیز مل گئی جسے وہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ اور صرف اُردو جاننے والوں کو تھوڑی وحشت کے بعد جب اُس کی چاٹ پڑی تو اُن کے نزدیک اُس سے زیادہ دلچسپ کوئی رنگ عبارت تھا ہی نہیں۔ سرشار کا رنگ اُن کے چند ابتدائی ناولوں پر محدود ہے اور وہ بھی جن میں پلاٹ نہیں۔ بخلاف اس کے شرر کا رنگ زیادہ تر اُن کے مضامین میں نظر آتا ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور جن کے سامنے کسی کو قلم اُٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ شرر ہی نے درحقیقت وہ زبان شروع کی جس کی نسبت سب کو اتفاق ہے۔ کہ وہی جدید اُردو ہے اور وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے۔ اور جو جو یہ رنگ چمکتا اور اُبھرتا جائے گا اُسی قدر زیادہ نمایاں طور پر شرر کا سکہ اُردو لٹریچر پر نظر آتا جائے گا۔ سادی حیثیت میں وہ تبین تھا بلکہ فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ خیال آفرینی کی حیثیت میں وہ شاعری کے رنگ میں انتہا سے زیادہ ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ

جن جن چیزوں کی تصویر کھینچتے ہیں اُسے اسکاٹ کی طرح ناظرین کی نظر کے سامنے لا کے کھڑا کر دیتے ہیں۔ انسانی جذبات پر اس طرح اور اتنا تصرف کرتے ہیں کہ جس قسم کے جذبات چاہتے ہیں اپنے ناول پڑھنے والے کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنا زورِ طبع دکھانے کے لئے اُنھوں نے ایسے ایسے سبجکٹ لئے جن پر اُنسے پیشتر کسی نے قلم نہیں اُٹھایا تھا۔ مثلاً "غریب کا چراغ" "صحبت برہم" "رہنیں" "ہاں" "لالۂ خودرو" "یادِ رفتگاں" "دیہات کی لڑکی" "خواب دوشیں" وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مضامین کو اُردو میں پہلے پہل اُنھیں نے انٹروڈیوس کیا۔ اور سچ یہ ہے کہ آج تک اُن سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکا۔ مختصر سچ یہ ہے کہ اُردو لٹریچر کی دُنیا میں ایک چابکدست مصوّر ہیں اور جذباتِ انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ۔

تاریخی ذوق بڑھنے کی بدولت مولانا ناولسٹ سے ایک مورخ بن گئے۔ آپنے دلگداز میں جو تاریخی مضامین لکھے ہیں اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مسائل تاریخی اور اکثر نامورانِ سلف کی سوانح عمری لکھ کے آپنے ہندوستانی پبلک کی واقفیت بہت بڑھادی ہے مگر ان کے علاوہ آپ نے دو تاریخیں بھی لکھی ہیں۔ جو بہت بڑے پیمانہ پر ہیں۔ ایک تاریخ سندھ جس میں آپنے اسلامی عہد کو عام مسلمات کے خلاف کچھ اور ہی ثابت کر دیا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے عربی اور انگریزی تاریخوں کی بہت ورق گردانی کی ہے۔ دوسری تاریخ ارضِ مقدس ہے۔ جس میں یہود کے ابتدائی زمانے سے رسولِ آخرالزماں صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کے حالات بڑی تنقیح و تحقیق سے لکھے ہیں۔

مولانا کا کیرکٹر یہ ہے کہ رسم و رواج کے اکثر خلاف رہتے ہیں۔ اور تحقیق و تنقید کی دُھن ہے۔ تقلید سے گریز۔ اور اہلِ حدیث کے اُصولِ مذہب کی طرف رجحان ہے۔ اگرچہ بعض مسائل میں اپنی تحقیق کی بنا پر اہلِ حدیث سے بھی علیٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا خیال غالب ہے! در جو چیز صحیح ثابت ہو جائے اُس کے تسلیم کرنے اور علانیہ اُس کا اعتراف کر دینے میں باک نہیں کرتے۔ علمائے زمانہ کی اکثر شکایت کرتے ہیں۔ انھیں اسباب سے اکثر عوام الناس اُن سے سخت مخالفت رکھتے ہیں۔ پہلی ناراضی لوگوں کو اُن سے یہ تھی کہ مستند تاریخوں سے نقل کر کے شائع کر دیا کہ حضرت شہربانو کا عقد جناب امام حسین علیہ السلام کی وفات کے بعد آپکے صاحبزادے امام زین العابدین نے اپنے غلام زبید سے کر دیا۔ دوسری مخالفت دبی سکینہ

بنت حسین کی لائف کی بنیاد پر تھی مگر سب سے زیادہ اختلاف اُس وقت ہوا جب آپ نے سنہ ۱۹۰۰ء میں پردۂ عصمت نام کا ایک رسالہ لکھنؤ سے شایع کیا جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے پردہ کا رسم اُٹھا دیا جائے - آپ کا دعویٰ تھا کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ستر اور مہذب لباس کا نام ہے نہ گھر کی چار دیواری میں بند کر دینے کا - یہ رسالہ برسوں تک نکلا - ہر جگہ سخت اختلاف ہوا مگر اُس نے اپنا کام پورا کر دیا - اس لئے کہ اُس وقت تک اس مسئلہ کو علانیہ کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا - اور اب ہر جگہ ایک جماعت اس کی طرفدار ہے اور پردے کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے -

اپریل سنہ ۱۹۰۴ء سے آپ نے ایک نیا پرہ روزہ رسالہ جاری کرنا شروع کیا جس کا نام "اتحاد" رکھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات صاف کیے جائیں -

---

مولانا کی آخر عمر یعنی تقریباً سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۲۶ء اُن کے سال وفات تک کے مزید حالات مختصراً اس طرح پر تقسیم ہو سکتے ہیں (۱) دلگداز اس زمانے میں کئی دفعہ بند ہوا اور پھر جاری ہوا اور بالفعل اُن کے صاحبزادے مولوی محمد صدیق حسن صاحب مینیجر انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی اڈیٹری میں لکھنؤ سے نکلتا ہے (۲) جب مولانا محمد علی سنہ ۱۹۱۲ء میں اخبار "ہمدرد" دہلی سے نکالنے والے تھے تو سب سے پہلے انھوں نے اُس کی ادارت کے واسطے مولانا کو دو سو روپیہ ماہوار پر مقرر کیا تھا مگر بعض وجوہ سے مولانا چند ماہ دہلی میں قیام کر کے قبل اخبار نکلنے کے لکھنؤ چلے آئے اور اخبار مذکور سے کوئی تعلق نہیں رکھا (۳) سنہ ۱۹۱۸ء میں حضور نظام فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ نے مولانا کو طلب کر کے اُن کو اپنی سوانح عمری تیار کرنے کا حکم دیا تھا مگر بعد کو یہ خیال ترک کیا گیا اور بجائے اُس کے مولانا "تاریخ اسلام" لکھنے پر مامور کیے گئے جس کے واسطے ایک معتد بہ رقم ماہوار اُن کو لکھنؤ گھر بیٹھے ملتی تھی - یہ کتاب تین جلدوں میں تیار ہوئی جس کی پہلی جلد شایع ہو گئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہے -

مولانا کی چھوٹی اور بڑی تصانیف اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ اس خاص صفت میں اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے تھے اور اُن کی اس کثرت تصانیف سے وہ زمانہ قرون اولیٰ کا یاد آجاتا ہے

جبکہ تصانیف کی کثرت مختلف طریقوں سے کتب تاریخ دسیر میں بیان کی جاتی تھی مثلاً کسی مصنف کے تراشہ قلم سے اُس کے غسل میت کے واسطے پانی گرم کیا جانا۔ یا کسی شخص کی مصنفہ کتب کا بار کئی کئی اونٹوں پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جایا جانا وغیرہ۔ غرض کہ مولانا کی تمام تصانیف کی اسم نویسی اس جگہ تحصیل حاصل ہے اس واسطے کوئی فہرست کتب یا دلگداز کے آخری اشتہاری صفحات دیکھنا چاہیئے۔ یہاں پر ہم اُن کے جاری کردہ اخبارات ورسائل اور اُن کی تصانیف کی مجموعی تعداد بہ اعتبار اُن کے مضامین کے بتا دینا کافی سمجھتے ہیں۔

اخبارات ورسائل

(۱) محشر ہفتہ وار ۱۸۸۱ء لغایت ۱۸۸۲ء
(۲) دلگداز ماہوار ۱۸۸۷ء
(۳) مہذب ہفتہ وار
(۴) پردۂ عصمت پندرہ روزہ
(۵) اتحاد " "
(۶) العرفان ماہوار
(۷) دل افروز ماہوار
(۸) ظریف ہفتہ وار

آخر میں چند سال ہوئے ایک ماہوار پرچہ "مورخ" کے نام سے بھی نکالا تھا۔

تصانیف

سوانح عمریاں مثلاً "ابوبکر شبلی" "جنید بغدادی" وغیرہ ۲۱
تاریخی ناول مثلاً ایام عرب، بابک خرمی، وغیرہ ۲۸

خیالی ناول حسن کا ڈاکو، غیب داں دولہن وغیرہ	۱۴
تاریخ مثلاً تاریخ سندھ، عصر قدیم وغیرہ	۱۵
نظم و ڈرامہ مثلاً شہید وفا، شب غم، شب وصل وغیرہ	۶
متفرق	۱۸ کل ۱۰۲

مولانا کے مضامین جو "دلگداز" میں چھپے ہیں سید مبارک علی شاہ تاجر کتب لاہور نے آٹھ جلدوں میں مضامین شرر" کے نام سے حال ہی میں شایع کیے ہیں یہ سب کتابیں نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں مگر علی الخصوص وہ جلد جس میں قدیم لکھنؤ کے حالات "جو ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے دلگداز میں چھپتے رہے دیکھنے کے لائق ہے۔ اور اُن لوگوں کے لیے جو لکھنؤ کی پرانی تاریخ اور دلچسپیوں کے جویا ہیں نہایت مفید اور پُر از معلومات ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا | مرزا محمد ہادی بی اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی متخلص بہ مرزا رسوا فن شعر میں مرزا اوج مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مرزا صاحب جوانی میں مرزا غالب کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے اور دیوان غالب اُن کو قریب قریب کل حفظ تھا۔ مگر غالب کی نازک خیالیاں اور عبارت آرائی اُن کو زیادہ مرغوب نہیں بلکہ کلام نہایت صاف سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ہوتا ہے۔ اس صفائی اور سادگی میں وہ مومن کے متبع البتہ کہے جاسکتے ہیں۔ مرزا صاحب کی معرکہ آرا تصنیف ان کی ناول "امراؤ جان ادا" ہے جس کو لکھے ہوئے تقریباً پچیس تیس برس ہوئے ہوں گے۔ یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ناول ہے اور اس کی عبارت نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے جو اُردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے کہ اس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصہ نہایت باقاعدہ اور منظم اور اس کے کیرکٹر (اشخاص قصہ) صاف واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ہم نے کسی ناول میں اتنی دلچسپی اتنی کثرت واقعات اور فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہیں دیکھی جس میں اُس زمانے کی طرز معاشرت اور سوسائٹی کے ہو بہو نقشے کھینچے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا مبالغہ یا آورد نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی دیگر تصانیف۔ اُن کے مثنوی نوبہار و صبح امید مرقع لیلیٰ مجنوں (ڈراما) اور ذات شریف (ناول) وغیرہ ہیں۔ مرزا صاحب بالفعل عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ میں ملازم ہیں۔

حکیم محمد علی — حکیم محمد علی متخلص بہ طبیب جن کا تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا۔ ایک مشہور ناول نگار تھے۔
مندرجہ ذیل ناول ان کی تصنیف سے ہیں۔ عبرت حسن سرور۔ دیول دیوی۔ گورا رام پیاری۔ جعفر و عباسہ۔
اختر و حسینہ وغیرہ بعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں مثلاً نیل کا سانپ جو رائڈر ہیگرڈ کی کلیوپیٹرا
کا ترجمہ ہے۔ اور دیول دیوی اور جعفر و عباسہ تاریخی ناول ہیں۔ حکیم صاحب گو اپنے اقران و امثال میں ممتاز
تھے مگر اعلیٰ درجے کے ناول نگار نہیں کہے جا سکتے اس وجہ سے کہ وہ زمانے کے رنگ سے بےخبر تھے اور نہ
وہ اُس زمانہ یا اُس سوسائٹی کے حالات سے واقف تھے جس کی وہ تصویر کھینچتے تھے۔ فطرت انسانی
سے وہ پوری طرح باخبر نہیں اور لطیف جذبات کے بھی ماہر نہ تھے۔ عبارت میں یک رنگی ہے اور
پند و نصائح سے اور بھی اُسے غیر دلچسپ بے اثر کر دیتے ہیں۔

راشد الخیری — ناول نویسی میں مولانا نذیر احمد صاحب کے صحیح جانشین کہے جاتے ہیں۔ اُن کی توجہ زیادہ تر
عورتوں کی تعلیم و ترقی اور اُن کے مصائب زندگی پر مبذول ہے۔ چونکہ عبارت نہایت درد انگیز اور
تاثیر سے لبریز ہوتی ہے لہذا مصور غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ کثیر التصانیف ہیں۔ بعض مشہور تصانیف
کے نام حسب ذیل ہیں۔ صبح زندگی۔ شام زندگی۔ نوحۂ زندگی۔ عروس کربلا۔ زہرۂ مغرب وغیرہ۔

نیاز فتحپوری — اُردو کے مشہور و مشاق ادیب و جرنلسٹ نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری۔ وطن فتحپور (یو۔پی)
سال ولادت ۱۸۸۶ء۔ ابتدائی تعلیم فارسی و عربی گھر پر ہوئی پھر مدرسہ اسلامیہ فتحپور، مدرسہ عالیہ رامپور
اور ندوۃ العلما کے دار العلوم میں فراغت حاصل کر کے حدیث مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنوی سے پڑھی
انگریزی تعلیم ایف۔ اے تک پرائیوٹ طور پر حاصل کی اور ترکی زبان ایک ترک سے پڑھی مختلف روزانہ
اخبارات میں کام کیا اب سات سال سے "نگار" ایک ادبی علمی رسالہ جاری کیا ہے جو پہلے بھوپال
اور اب لکھنؤ سے جاری ہے۔

تصانیف۔ صحابیات، گہوارۂ تمدن، نگارستان، (بعض ادبی مضامین کا مجموعہ ہے) جذبات بھاشا
شہاب کی سرگذشت، شاعر کا انجام، المسائلہ الشرقیہ، عرض نغمہ، (ترجمہ گیتان جلی)

طرز تحریر — آپ کا طرز تحریر سب سے علیحدہ ہے اور آپ معمولی سیدھی سادی عبارت سے نظم سا اثر کو زیادہ

نیاز فتحپوری مدیر رسالہ نگار
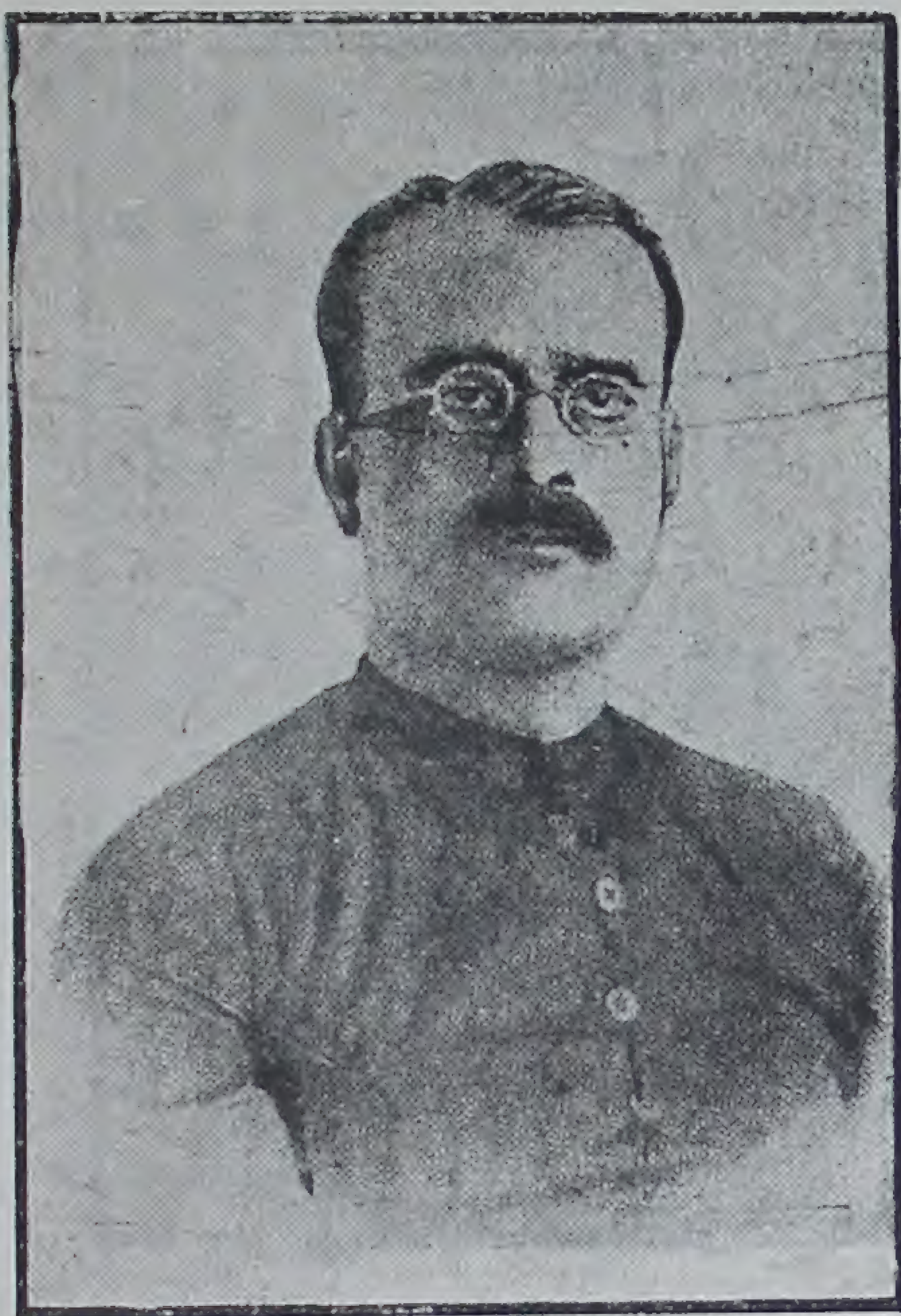
پنڈت برج نرائن چکبست

پسند کرتے ہیں مگر بعض موقعوں پر جب یہ رنگ حدِ اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو عبارت باتکلف اور بے لطف معلوم ہونے لگتی ہے۔ عبارت اور مضمون میں چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا اس قسم کی عبارت کو صرف انھیں مضامین پر صرف کرنا چاہیے جو اسکے متحمل ہوسکیں مگر یہ بات ضرور قابل قدر ہے کہ آپ نے قدیم طرز انشا پردازی کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نئی شاہراہ قائم کی ہے۔ آپنے ٹیگور کے گیتان جلی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور رومی اور یونانی علم الاصنام سے بھی آپ کبھی کبھی فائدہ اٹھاتے ہیں "کیوپڈ اور سائیکی" اور "مریخ سیّاح کی ڈائری" انگریزی کے ترجمے معلوم ہوتے ہیں[1] آپ کی بعض کتابیں مثلاً "شاعر کا انجام" اور "گہوارہ تمدن" جس میں ترقی تمدن میں عورتوں کے حصہ لینے کی بحث ہے نہایت عمدہ اور دلچسپ کتابیں ہیں۔ آپ کا رسالہ "نگار" ایک نہایت ممتاز ادبی رسالہ ہے جس کے اکثر مضامین جو آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کے اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی خواجہ حسن نظامی دلی میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت درگاہ فلک بارگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں ہوئی۔ خواجہ صاحب ابتدائے عمر ہی سے اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ ان کو بنظر شک دیکھتی رہی اور پولیس اُن کی نگرانی کرتی تھی وہ بوجہ اپنے مرتبہ اور نیز بوجہ صوفی و صافی ہونے کے بہت با اثر شخص ہیں۔ پچاس سے زیادہ کتب اور رسائل کے مصنف ہیں جن میں سے بعض بہت اچھی ہیں۔ آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ معمولی معمولی مضامین اور خیالات کو نہایت دلکش اور مؤثر طریقہ سے ادا کرتے ہیں اور الفاظ نئے نئے اور عجیب وضع کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت نہایت سادہ سلیس اور دلکش ہوتی ہے مگر خیالات میں گہرائی نہیں ہوتی۔ آپنے تقریباً دس کتابیں غدر کے بارے میں شایع کی ہیں جس میں سے بعض ترجمے ہیں اور بعض میں معزول شاہ دہلی کی اولاد کی پریشاں گردیوں کے افسوسناک اور عبرت ناک حالات ہیں۔ آپ کی کتاب کرشن بیتی کو اہل اسلام اور خصوصاً ارباب تصوف بہت پسند کرتے ہیں۔ بعض دیگر تصانیف حسب ذیل ہیں۔ میلاد نامہ۔ محرم نامہ۔ یزید نامہ۔ بیوی کی تعلیم۔ اولاد کی شادی۔ جگ بیتی کہانیاں وغیرہ۔

---

[1] یہ ترجمے نہیں ہیں بلکہ طبعزاد مضامین ہیں ۱۲

پریم چند میدانِ قصّہ گوئی کے مشہور شہسوار ہیں۔ اصلی نام دھنپت رائے ہے۔ پریم چند کے لقب سے مشہور ہیں۔ سنہ ۱۹۳۷ سمبت سن ولادت ہے۔ آپ کے والد منشی عجائب لال بنارس کے قریب موضع پانڈے پور کے رہنے والے تھے۔ فارسی کی تعلیم تقریباً سات آٹھ برس حاصل کر کے انگریزی شروع کی اور بنارس کا لجیٹ اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سات برس کی عمر میں ماں اور پندرہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ شروع میں آپ نے صیغہ تعلیم میں ملازمت کر لی تھی مگر درس و تدریس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ کی ادبی زندگی سنہ ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتی ہے جب سے کہ آپ نے "زمانہ" میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول "پریما" لکھا جو انڈین پریس الہ آباد سے شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں "جلوۂ ایثار" اور سنہ ۱۹۱۸ء "بازارِ حسن" ہر دو حصّہ تصنیف کیے۔ مثل اُردو کے آپ کو ہندی میں بھی کمال حاصل ہے چنانچہ سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم اور کایا کلپ آپ کے مشہور ناول ہیں جن کے اُردو ترجمے بھی سُنا گیا ہے کہ عنقریب شایع ہوں گے۔ رنگ بھوم علی الخصوص ایک نہایت دلکش ناول ہے۔ آپ کا تاریخی ڈرامہ کربلا رسالہ زمانہ میں باقساط نکلتا رہا۔ منشی صاحب موصوف چھوٹے چھوٹے قصّے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ آپ کے اس قسم کے افسانے اس زمانہ کے کثیر التعداد نام نہاد ناولوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو سچے نگینوں کو چھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ آپ کو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہات کے ہو بہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں بیان کیے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں پاس نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہیں۔ آپ کی آپ کی عبارت میں بیجا آمد اور زور معلوم ہوتا ہے لطیف استعارات اور تشبیہوں سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا آپ کو اُردو ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے اور ساتھ ہی اس کے جذبات و نفسیات انسانی کے بھی پورے ماہر ہیں آپ کے کلام میں کہیں ظرافت اور کہیں درد دہی رنگ دکھاتا ہے

سلہ سیوا سدن کا ترجمہ بازارِ حسن کے نام سے شایع ہو گیا ہے۔ رنگ بھوم کے ترجمے کا پہلا حصّہ چوگانِ ہستی کے نام سے شایع ہوا ہے۔ دوسرا حصّہ بھی عنقریب شایع ہوگا ۱۲

منشی پریم چند

مہاشے سدرشن

جیسے کہ دھوپ اور چھاؤں۔ آپکے کیرکٹر نہایت مخصوص چلتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔ آپکا ناول بازار حسن جو
دو جلدوں میں ہے ایک طویل کتاب ہے مگر دلچسپی میں کم نہیں ہے۔ اگر آپ کے اس قسم کے ادبی
اشغال جاری رہے تو کچھ عرصہ میں آپ بڑی ترقی حاصل کریں گے۔ تھوڑے عرصہ سے بوجہ اردو کی
نا قدری کے آپ ہندی کی طرف زیادہ توجہ فرمارہے ہیں۔ آپ کے خیالات سوشل اور پولٹیکل
معاملات میں بہت اعلیٰ وارفع ہیں۔ آپ کے مضامین ہندو مسلم اتحاد اور دورِ جدید جو زمانہ میں نکلے
تھے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ آپ کی تصانیف علاوہ کتب مذکورۂ بالا کے پریم پچیسی حصہ اول
و دوم اور پریم بتیسی حصہ اوّل و دوم چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہیں۔ خواب و خیال ابھی حال
میں پنجاب سے شایع ہوا اور فردوس خیال انڈین پریس شایع کر رہا ہے۔

سدرشن آپ بھی ایک مشہور افسانہ نگار ہیں اور پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کی بعض خصوصیات
آپ میں بھی موجود ہیں مگر اُن سے کم درجہ پر۔ آپ میں وہ استادی اور فنی کمال نہیں ہے اور نہ عبارت
میں اس قدر ادبیت اور صحت ہے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) محبت کا انتقام ایک انعامی رسالہ
جس پر پنجاب گورنمنٹ نے پانچسو روپیہ انعام دیا۔ پہلے ہندی میں لکھا تھا اُس کے بعد اُس کا ترجمہ اردو میں ہوا
(۲) چندن اس پر خواجہ حسن نظامی نے دیباچہ لکھا ہے۔ پندرہ چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔
(۳) بہارستان اس پر منشی پریم چند نے دیباچہ لکھا ہے۔ یہ بھی چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے (۴)
(۵) تہذیب کے تازیانے اور زہر یلا آب حیات بنکم چندر چیٹرجی کے بعض مضامین اور ناول کے ترجمے
ہیں (۶) عورت کی محبت ایک بنگالی مصنف کی کتاب کا ترجمہ ہے (۷) بیگناہ مجرم بنگالی اور فرنچ کتابوں
سے لیا گیا ہے (۸) سدا بہار پھول مختصر قصوں کا مجموعہ ہے۔

دیگر ناول نویس فی زمانا ناول نگاروں اور چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے والوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ
ان سب کے نام بتانا بھی ایک امر محال معلوم ہوتا ہے۔ بہر طور اصحاب ذیل ان سب لوگوں میں زیادہ مشہور
و ممتاز ہیں (۱) حامد اللہ افسر میرٹھی جو علاوہ ایک عمدہ شاعر اور نقاد ہونے کے افسانہ لکھنے میں بھی بڑی مہارت
رکھتے ہیں۔ اِن کی اکثر کتابیں سررشتۂ تعلیم میں بھی داخل ہیں۔ ایک مجموعۂ قصص جس میں ڈالی کا جوگ

اور دیگر قصص شائع ہو رہے ہیں تیار ہو رہا ہے (۲) مجنوں گورکھپوری (۳) احمد حسین خاں ایڈیٹر شباب اُردو (۴) سید عابد علی (۵) حکیم شجاع الدین (۶) مولوی ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ممالک متحدہ۔ جاسوسی کے قصے لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کے ناول نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری بہت مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قابل خواتین نے بھی اس فن کی طرف توجہ کی ہے اور صوبہ پنجاب سے بعض بہت دلچسپ قصے عورتوں کے لکھے ہوئے شایع ہوئے ہیں۔

باب ۱۸

اُردو ڈراما

اُردو ڈراما اُردو ڈرامہ ایک غیر ملکی پودا ہے جو سرزمین اُردو پر انیسویں صدی کے وسط میں نصب کیا گیا اور اب خوب جڑ پکڑ گیا اور نہایت تندرست اور تنومند معلوم ہوتا ہے۔

ڈراما کی عمومیت محاکات یعنی نقالی کا شوق ہر قوم میں فطری ہے عام اس سے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر ہو یا بربریت اور گمراہی کے گڑھے میں پڑی ہو۔ نقالی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ البتہ بعض ممالک میں یہ جوش دبا دیا گیا اور بدعت کہلایا۔ اہل اسلام ایسی چیز یعنی نقالی کو جس میں ڈراما، بُت تراشی۔ تصویر کشی رقص اور موسیقی سب داخل ہیں ممنوع سمجھتے ہیں پس اُن کے ممالک میں فنون لطیفہ کی نشو و نما اور ترقی کو گویا بدعت یا انحراف سنت کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ اسی وجہ سے فارسی سے اس قسم کے کوئی نمونے اُردو کو نہیں ملے مگر خود فارسی اس نقالی کے جذبہ سے محفوظ نہ رہ سکی وہاں ڈرامے نے تعزیہ (مرثیہ) کی صورت اختیار کر لی جس میں میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر اظہار رنج و غم کیا جانے لگا۔ مذہب جو زمانہ قدیم میں عنصر غالب تھا اب ڈرامہ اور دیگر اصناف ادب کو ذریعۂ تبلیغ قرار دینے لگا۔ اہل یورپ و اہل انگلستان کے مریکل پلے (ایسے سین جن میں معجزات دکھائے جاتے ہیں) اور مسٹری پلے (ایسے سین جس میں اسرار دکھائے جاتے ہیں)، جو قدیم کلیسائے مسیحی کے رسوم اور طریقۂ عبادت کے مظہر ہیں اسی طرح سنسکرت اور ہندی کے

مذہبی ڈراما جو پرانوں اور دیگر مذہبی کتب ہنود سے اخذ کیے گئے ہیں اور اوبرامرگو کے پیشن پلے[1] ان سب کا ماخذ ہی قدیم مذہبی اعتقادات ہیں۔ ہندوستان میں اب تک مذہب کا بہت بڑا اثر ڈراما پر ہے۔ پران اور دیگر مذہبی کتب کے قصے ڈراما کی صورت میں آکر اپنے خوبصورت پردوں اپنی دلچسپ موسیقی اور اخلاقی نتائج سے اب بھی ہزاروں آدمیوں کے دلکشی اور تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔

سنسکرت اور ہندی ڈراما نے اردو پر کیوں نہیں اثر کیا؟

ہندوستان میں ڈراما درجہ کمال تک پہونچ گیا تھا۔ پس قدیم سنسکرت ڈرامہ کو جو اپنے عروج تک پہونچ گیا اردو ڈرامہ پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر کرنا چاہیے تھا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ جس طرح اردو فن نظم سنسکرت کے اثر سے محفوظ رہا اسی طرح فن ڈراما پر بھی اس کا کوئی اثر نہ پڑا سنسکرت کے ان دونوں خزانوں سے اردو نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جن کی وہ حقیقی وارث تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ سنسکرت ڈراما کا زرین دور گذر چکا تھا اور اب وہ ایک تن بیجان اور محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ اسکے شاہکار ہندوستان کی دیسی زبانوں میں مفقود تھے اس کا کھیل (ایکٹنگ) بھی متروک ہوچکا تھا۔ شروع میں بودھ مت اور جینی ڈراما کو ناپسند کرتے تھے مگر اس کا یہ فائدہ دیکھ کر کہ وہ ان کے دینی مسائل کے پھیلانے کا ایک اچھا ذریعہ ہے وہ بھی اس کی قدر کرنے لگے۔ اور بودھ مت کا ڈرامہ تو راجہ ہرش اور اشوک کے زمانہ میں بڑی ترقی کر گیا تھا جب بودھ مت کو زوال اور برہمنوں کی ترقی ہوئی تو ڈراما اپنا پرانا عروج حاصل نہ کرسکا اس وجہ سے کہ غیر اقوام کے حملوں اور قوم کی مفلسی سے ملک میں ایک بے اطمینانی کی حالت پھیل گئی تھی۔ اب ڈرامہ کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوگئی اور وہ اس کی پرانی شان اور شوکت جاتی رہی۔ اور جب ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے ناٹک کی کمپنیاں کھول لیں تو ڈرامہ کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی۔ ایکٹر لوگ قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور مضمون بھی ادنیٰ درجے کے بعض وقت فحش کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ اس زمانے میں اردو اپنا جنم لے رہی تھی سنسکرت ڈراما محض ایک

---

[1] اوبرامرگو جرمنی میں ایک مقام ہے جہاں مقررہ اوقات پر حضرت مسیح کے حالات زندگی ناٹک کی صورت میں اسی طرح دکھائے جاتے تھے جس طرح ہمارے یہاں رام لیلا ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمی اس مذہبی تماشے کے دیکھنے کو دور دور سے آتے تھے معلوم نہیں کہ اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی اسی قسم کا اجتماع ہوتا ہے یا نہیں۔

کھلونی چیز رہ گیا تھا اور ہندی ڈراما ادنیٰ درجے کا اور ذلیل ہو گیا تھا۔ اسکے علاوہ اردو زبان ابتدا ہی سے فارسی کے آغوش محبت میں آگئی تھی اس سوتیلی ماں نے سگی ماں کو کونے میں بٹھا دیا تھا فارسی روایات فارسی محاورے فارسی تخییل اردو پر غالب تھے فارسی ادیب اس نوزائیدہ بچے کو پیار کرتے تھے اور وہ فارسی تہذیب تمدن کے سرچشمہ سے سیراب ہوتا تھا۔ سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور بے توجہی کے سبب سے طفل زبان مسلمانوں ہی کی گود میں پلنے لگا فارسی زباں داں سنسکرت سے ناواقف تھے اسی وجہ سے سنسکرت ڈراما اور فن نظم دونوں بے اثر رہے۔ اگر یہ لوگ بھاشا اور سنسکرت کی قدر کرتے یا اگر پنڈت لوگ اردو کی پرورش زیادہ محبت سے کرتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اردو زبان اپنے اکثر نکتہ چینیوں کو دنداں شکن جواب دیتی۔

اردو ڈراما کے عناصر خمسہ

مسٹر عبداللہ یوسف علی آئی۔ سی۔ ایس نے ایک فاضلانہ مضمون میں اردو ڈراما کے عناصر ترکیبی حسب ذیل قائم کیے ہیں:۔ (۱) قدیم سنسکرت ڈراما (۲) اہل ہنود کے خالص مذہبی ناٹک یا مریکل پلے اور دیوتاؤں اور دیویوں کے حالات (۳) وہ چیزیں جو ادنیٰ درجے کے لوگوں میں جاری ہیں مثلاً سوانگ نوٹنکی نقلیں وغیرہ (۴) اسلامی نظمیں اور قدیم روایات (۵) زمانہ موجودہ کا انگریزی ڈراما اور یورپین اسٹیج کی ترقیاں۔

سنسکرت ڈراما

ہر چند کہ قدیم سنسکرت ڈراما کا اردو ڈراما پر بہت کم اثر پڑا مگر پھر بھی بعض مشہور ناٹکوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے اور وہ کھیلنے کے قابل کر دیئے گئے ہیں۔ تھوڑے عرصہ سے ڈراما کے پرانے قواعد بھی استعمال میں آرہے ہیں خاص کر وہ جو ابتدائی سین کے متعلق ہیں مثلاً ناٹک شروع ہونے سے پہلے ایک شخص جو سوتردھار کہلاتا ہے مع اپنی بیوی کے اسٹیج پر آتا ہے اور تماشہ کے تمام واقعات کو مختصر طور پر بتلا دیتا ہے اور لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے کہ اب اصلی کھیل شروع ہونے والا ہے۔ بدوشک یعنی مسخرے کا پارٹ بھی ضرور ہوتا ہے مگر اچھے تماشوں میں یہ بالکل علٰحدہ رہتا ہے اور تماشہ کے اصلی واقعات سے اس کو تعلق نہیں ہوتا۔

ہنود مریکل پلے وغیرہ

اس قسم کے ناٹکوں نے بھی موجودہ اردو ڈراما کے واسطے بہت کچھ مواد فراہم کر دیا ہے

ان کی نسبت اردو ڈراما کے ساتھ وہی ہے جو ہالنشڈ[1] اور "ہال" کے پرانے قصوں اور مورخ پلوٹارک[2] کی قدیم یونانی مشہور لوگوں کی سوانح عمریوں کی شیکسپیر کے ناٹکوں کے ساتھ ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو ڈراما کی ابتدا بھی اس قسم کی ہندی چیزوں سے ہوئی تھی۔ قدیم زمانہ سے ہندو لوگ رام اور کرشن کے مشہور واقعات زندگی کو تیوہاروں کے موقعوں پر مندروں میں ناٹک کی صورت میں لوگوں کو دکھایا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے مذہبی روایات سے واقف ہوں اُن سے اچھی اچھی باتیں سیکھیں اور اپنے دیوتاؤں اور سورماؤں کے واقعات زندگی سے مفید سبق حاصل کریں۔ رامائن کے واقعات دسہرہ کے زمانہ میں جبکہ رامچندر جی اپنے حریف راون پر فتح پاکر بھارت ورش میں واپس آئے تھے، اسی قسم سے ہیں اور آجکل ایسے ناٹک رام ناٹک اور رامائن کے نام سے مشہور ہیں اور مذہبی لوگوں اور علی الخصوص عورتوں کو بہت پسند آتے ہیں۔ اسی طرح کرشن جی کے عاشقانہ گیت بھی اردو ڈراما کا جز ہیں۔ سچ پوچھئے تو جس قدر عاشقانہ اور جذباتی شاعری ہندی اور بنگالی میں بالفعل ہے اُس کا زیادہ تر حصہ کرشن اور رادھا کے عشق پر مبنی ہے بہت سی دیسی کمپنیاں جو منڈلی کہلاتی ہیں متھرا اور بندرابن وغیرہ متبرک مقاموں سے چل کر راستے میں اپنے مذہبی گانوں اور تماشوں سے لوگوں کے دلوں کو محظوظ کرتی ہیں۔ ناچ اور گانا ان تماشوں کی جان ہے۔ اس قسم کی کمپنیاں دولتمند اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے نہیں بلکہ عوام الناس کی دلچسپی کے لئے ہیں۔ یہ لوگ جگہ جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہیں اپنے چہروں کو رنگتے اور چراغوں یا مشعلوں کی روشنی میں اپنے تماشے دکھاتے ہیں اور آخر میں دو دو چار چار پیسے لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ مولانا غنیمت کشمیری نے اپنی مشہور مثنوی "نیرنگ عشق" میں ان جماعتوں کا جن کو وہ بھگت باز کہتے ہیں خوب خاکہ اڑایا ہے۔ غالباً انھیں جماعتوں سے واجد علی شاہ نے جو اپنے عیش پرستیوں کے لئے مشہور تھے، ناٹک کا پہلا سبق سیکھا ہوگا۔ اور وہ اُن کو

---

[1] یہ دونوں انگلستان کے قدیم مورخ سولھویں صدی عیسوی میں گذرے ہیں ان کے تاریخی قصوں کو جن کو کرانکل کہتے ہیں شیکسپیر نے اپنے تاریخی ڈراموں میں بہت مدد لی ہے [2] مشہور یونانی مورخ جو ظالم شہنشاہ نیرو کا معاصر تھا۔ تقریباً ۵۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کی کتاب "لائوز" سوانح عمریاں زمانہ قدیم کی ایک مشہور اور مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے جس میں چھیالیس بڑے بڑے یونانی اور رومی مشاہیر کے حالات بالمقابلہ نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہیں اس کی دوسری کتاب موریلیا کئی رسالوں کا مجموعہ ہے ۱۲

بہت پسند آیا ہوگا پھر اُنھوں نے ناٹک ور رہس خود قائم کر لیے جس میں وہ خود کنہیا اور اُن کے محل کی عورتیں نہایت قیمتی اور زرق برق لباس میں گوپیاں بنا کرتی تھیں۔ ہمارے نزدیک یہ ناچ اور گانا جو اُردو ڈراما کا جزو لاینفک ہے اُنھیں رہس منڈلیوں سے لیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ فرنچ اوپرا کا بھی اس پر کچھ اثر ہو کیونکہ واجد علی شاہ کے عہد میں اُن کے یوروپین دوستوں کی وجہ سے یہ وہاں مروّج ہو گیا تھا۔

سوانگ نقلیں وغیرہ

سوانگ کی ہندوستان میں وہی حیثیت ہے جو "پیجنٹ" کی انگریزی ڈراما کی ترقی کے پیشتر انگلستان میں تھی۔ سوانگ ہندو تہواروں کے موقعوں پر جلوس اور باجوں کے ساتھ نکلتے ہیں۔ اُن کو ابتدائی بھدّی نقالی سمجھنا چاہیے مگر عنصر ظرافت (کامک) ان میں ضرور پایا جاتا ہے۔ پُرانے زمانے کے نقّال یا مسخرے امیر لوگوں کی صحبت یا ملازمت میں رہتے تھے اور اپنی ظریفانہ باتوں اور نقلوں سے اپنے مالکوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ نقالی اُس زمانہ میں ایک مشکل فن تھا جو خاص تربیت اور محنت سے آتا تھا اور اس کی تکمیل کے واسطے گانا ناچنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نقالوں کی وہی حیثیت تھی جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں امرائے دربار کے مصاحبین اور ملازموں کی تھی جو جماعتوں میں نکلا کرتے تھے اور اپنے گانے بجانے اور مسخرے پن سے لوگوں کو خوش کرتے تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہی پھرنے والی نقال کمپنیاں عہد ایلزبتھ کے ترقی یافتہ ڈراما کی اصلی پیشرو تھیں۔ ہندوستان میں نقالوں کی جماعتیں بھائیوں کے نام سے مشہور ہیں جو شادی بیاہ کے موقعوں پر بہ اُجرت بُلائے جاتے ہیں اور اپنے ناچ گانے اور مذاق کی باتوں سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں۔ انھیں پُرانے زمانے کی نقلوں سے آجکل کے تماشوں کے کامک اور نقلیں ماخوذ ہیں۔

اسلامی نظمیں اور روایات

یہ اُردو ڈراما کا عنصر غالب ہیں۔ نظم اُردو عاشقانہ رنگ اور ڈرامانگاری کیلئے ایک خاص استعداد اور موزونیت رکھتی ہے۔ قدیم ڈراما نہایت مؤثر پُر درد اونچے سُروں کی عاشقانہ نظموں میں ہوتے تھے۔ انکی نثر مقفّے اور شعر دونوں مؤثر ہیں۔ زبان اُردو بڑی زوردار چیز ہے اُس کا طرز ادا، اُس کے صنائع بدائع نہایت دلکش اور قابل تعریف ہیں۔ وہ رزم و بزم دونوں موقعوں کے لئے موزوں اور جذبات نگاری کے لئے بھی پوری طرح مناسب ہے۔

انگریزی اسٹیج

اِس کا اثر زمانہ حال کے اُردو ڈراما پر سب سے زیادہ ہے۔ اُردو اسٹیج آجکل انگریزی ناٹکوں کے

ترجموں سے بھری ہوئی ہے۔ اسٹیج کی وضع تھیٹر کی ساخت پردے لباس نشستوں کا طریقہ، تماشہ کے تقسیم۔ پارٹی کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور اسی کے زیر اثر ہیں۔

اردو ڈراما کے اقسام | اردو ڈراما مستقل تصانیف اور تراجم پر مشتمل ہے۔ اول الذکر کی تعداد نسبتہً کم ہے اور جو ہیں وہ کسی پولٹیکل یا سوشیل مبحث پر مبنی ہیں۔ تراجم کے ماخذ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سنسکرت (۲) انگریزی یا اور کوئی یورپی زبان بذریعہ ترجمہ انگریزی (۳) فارسی قصے۔ (۴) دیسی زبانیں علی الخصوص بنگلہ، مرہٹی اور زیادہ تر ہندی۔

قصوں کے مضامین حسب ذیل چیزوں سے ماخوذ ہیں:۔

(۱) پوران اور ہندو دیومالا (۲) فارسی اور عربی قصے (۳) ہندستان کے مشہور قدیمی روایتیں اور قصے (۴) انگریزی قصے (۵) مسائل حاضرہ یعنی کوئی پولٹیکل مسئلہ یا سوشیل خرابیاں۔

اردو ڈراما پر شاہی درباروں کا اثر | سب سے پہلا اردو ڈراما اندر سبھا ہے جس کو امانت شاگرد ناسخ نے تصنیف کیا تھا جو عہد واجد علی شاہ میں دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور ہے کہ یہ کتاب بادشاہ ہی کے حکم سے تیار کی گئی تھی[۱]۔ ایک ہندی شاعر لوازنامی نے فرخ سیر بادشاہ دہلی کے عہد میں مشہور و معروف شکنتلا ناٹک کا زبان برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا مگر خود اس کا ترجمہ کو ڈراما سمجھنا غلطی ہے اس وجہ سے کہ نہ تو یہ ترجمہ ایک صحیح ترجمہ ہے کیونکہ وہ ہول گی صورت میں ہے اور نہ اس میں ڈراما کی شان باقی رہی کیونکہ اشخاص قصہ جس طرح کہ ڈراما میں دستور ہے آتے جاتے نہیں اور نہ اس میں کیرکٹر اور ایکشن کا کہیں پتہ ہے۔ اس وجہ سے نہ تو وہ ڈراما ہے اور نہ اس کا تعلق اردو سے ہو سکتا ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔ زمانہ شاہی میں نقالوں اور بہروپیوں کا بڑا رواج تھا ان کی نقلوں سے لوگ خوش ہو کر ان کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتے تھے مشہور ہے کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی جو اپنے ناچ رنگ اور عشرت پرستیوں کی وجہ سے محمد شاہ رنگیلے کے نام سے مشہور ہیں، اپنے اسی قسم کے اشغال میں مبتلا ہیں کہ نادر شاہ کا حملہ دلی پر ہوا۔ صحبت شاہی میں مخل ہونے کے ڈر سے کوئی شخص اس بری خبر کو اپنے منہ سے نہیں نکال سکتا تھا مجبوراً ایک نقال کے

---

[۱] دیکھو فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۷

ذریعہ سے یہ خبر بادشاہ کو پہونچائی گئی۔ نقلوں کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ حسب موقع فی البدیہ یا فرمائش سے فوراً تیار کرلی جاتی تھیں۔ لکھنؤ جو بادشاہان اودھ کا دارالسلطنت تھا عیش وعشرت کا مرکز بنا ہوا تھا اور علی الخصوص واحد علی شاہ کا زمانہ تو دولت وثروت، شوکت وعشرت کا بہترین دور تھا۔ اس زمانے کی ان الفاظ میں کیا اچھی تصویر کھینچی گئی ہے "وہاں دولت، خوش حالی، فارغ البالی، ناچ رنگ گانے بجانے کے ہرطرف جلسے تھے عاشق مزاج خوش رو جوانوں اور حسین مہ جبین نازنینوں کے جمگھٹے تھے زندگی اس مزے سے گزرتی تھی جس طرح پھولوں کے تختے پر باد بہاری چلتی ہے۔ ہرطرف سُریلی آوازوں سے کان لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ خیالی پرستان جس کو کوہ قاف کہتے ہیں اس سچ مچ کے پرستان کے آگے جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی اپنی زندگی نہایت بے فکری اور عیش وعشرت میں گزارتے تھے مات تھا شاہزادے اور رؤسا جو شادمانی اور کامرانی کے مجسم تصویریں تھے اُن کو دیکھ کر دنیاوی جاہ و جلال اور مال ومنال کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا" اسی دربار میں اُردو ڈراما نے جنم لیا۔ بادشاہ اور ان کے وزرا اور مصاحبین اپنی مسرت اندوزیوں کے نت نئے طریقے سوچا کرتے تھے، چنانچہ ایک فرانسیسی نے جو دربار شاہی سے متوسل تھا اوپرا کی تجویز پیش کی جس کا اُس زمانے میں یورپ میں عروج ہو رہا تھا جو فوراً منظور کرلی گئی اس وجہ سے کہ اس میں صدہا حسین ومہ جبین گائنوں کے لیے جن سے دربار بھرا ہوا تھا ایک اچھا مشغلہ نکل آیا اور امانت کو اسی قسم کا ایک تماشہ لکھنے کا حکم ہوا۔

اندر سبھا امانت امانت نے ۱۲۷۰ھ (مطابق ۱۸۵۳ء) میں اپنی کتاب اندر سبھا تیار کی جو کامیڈی ہے اور چونکہ اس میں گانا اور ناچ بھی شامل ہے۔ لہٰذا موسیقی وار کامیڈی ہے جو اوپرا کی ایک قسم ہے۔ جوں ہی یہ یہ کتاب تیار ہوئی۔ اس کے واسطے لکھنؤ کے مشہور محل قیصر باغ میں ایک اسٹیج آراستہ کیا گیا۔ مشہور ہے کہ بادشاہ خود تماشہ میں شریک ہوتے اور راجہ اندر بنتے تھے اور پریوں کا پارٹ خوبصورت حسین عورتیں کرتی تھیں جو پُر تکلف اور قیمتی لباس اور جواہرات سے آراستہ ہوتی تھیں۔ ان تماشوں میں کسی غیر آدمی کے جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ مسئلہ کہ آیا اُردو ڈراما کی ترقی میں یورپ والوں نے کوئی حصہ لیا یا نہیں ہنوز مابہ النزاع ہے مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم اس کو نہیں مانتے تھے اُن کا خیال تھا

کہ کسی یورپین نے اُردو ڈراما کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ معاملہ تاریکی میں چھپا ہوا ہی اور اُس زمانہ کی کوئی معتبر تاریخ ایسی نہیں ملتی جس سے اُس پر کافی روشنی پڑسکے مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہی کہ یورپین لوگوں نے اُردو ڈراما کو زمانۂ حال کے مطابق بنانے اور اسٹیج کے ساز و سامان اور تیاری میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہوگا۔ نور الٰہی اور محمد عمر صاحبان نے اپنی کتاب ناٹک ساگر میں بہت سے دلائل مولانا شرر مرحوم کے جواب میں پیش کئے ہیں مثلاً واجد علی شاہ کے دربار میں یورپین لوگوں کی موجودگی خود واجد علی شاہ کو نئی چیزوں کا شوق اندر سبھا کی اندرونی شہادت وغیرہ وغیرہ اور اس کے علاوہ خورشید جی بالی والا جو اس زمانے میں ایک مشہور ایکٹر تھے اُن کا قول بھی اس کی تائید میں نقل کیا ہی۔ مگر حق یہ ہی کہ بالیقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ واجد علی شاہ تماشہ میں کچھ حصہ لیتے تھے یا کہ اندر سبھا کا تماشہ قیصر باغ میں ہوا تھا یا امانت نے یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی یا نہیں[1]۔

اندر سبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے۔ کتاب راجہ اندر کی سبھا یعنی دربار کے سین سے شروع ہوتی ہی اور قصہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ شایع ہوتے ہی بہت مقبول ہوئی

---

[1] مکرمی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم۔اے اُردو لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون میں جو رسالہ "اُردو" میں چھپ چکا ہی یہ ثابت کر دیا ہی کہ اندر سبھا نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی نہ اس کا کھیل کبھی قیصر باغ میں ہوا اور نہ بادشاہ کبھی اس میں شریک ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ امانت نے اس کتاب کی شرح میں (جو ان کے پاس موجود ہی) یہ لکھا ہو کہ یہ کتاب ان کے (امانت کے) ایک شاگرد کے کہنے سے لکھی گئی اور اس کے ایکٹنگ کا طریقہ نہایت دلچسپ اور مفصل طریقے سے بیان کیا ہی بادشاہ کا راجہ اندر بننا بالکل بے اصل ہی اس وجہ سے کہ بادشاہ کو رہس کا بڑا شوق تھا چنانچہ ان کی تصانیف میں اس طرح کی چیزیں بکثرت پائی جاتی ہیں جس میں وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے جن کے نام بھی بتا دیے گئے ہیں مگر یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہی کہ رہسوں میں کنہیا کا پارٹ بجائے مرد کے ہمیشہ وہ کسی عورت کو دیتے تھے اور خود کبھی نہیں بنتے تھے جب اس میں کنہیا کا پارٹ خود انھوں نے کبھی نہیں لیا تو یہ بعید از عقل ہو کہ وہ راجہ اندر بنتے ہوں۔ اندر سبھا پر یورپین اثر کے متعلق مولانا شرر مرحوم اور سید مسعود حسن صاحب دونوں کی قطعی رائے ہی کہ فرانسیسیوں نے اس میں کچھ نہیں کیا۔ اگر لفظ پردہ سے اس کا ثبوت دیا جائے تو تصویردار پردے جو سین کہلاتے ہیں اور تھیٹروں میں مروج ہیں اور جو ٹھیک یورپ کی نقل ہیں وہ رہس یا اندر سبھا میں کبھی استعمال نہ ہوتے تھے البتہ معمولی پردے چادروں کی وضع کے ڈال دیے جاتے تھے تاکہ تماشائیوں اور تماشہ گروں میں ایک قسم کا پردہ ہو جائے اور یہ بہت قدیم رسم ہی اس کو یورپین اثر سے کچھ تعلق نہیں ۱۲ مترجم

اور اس کی مقبولیت کا سبب ظاہر ہے یعنی یہ کہ ابتدائی دھنیں اس کی شعروں اور گیتوں کی بڑے بڑے
اُستادوں نے قائم کی تھیں اور اس کا سامان ظاہری یعنی پردے لباس وغیرہ نہایت پُر تکلف تھا اس کی کامیابی
دیکھ کر مداری لال نے ایک دوسری اندر سبھا لکھی جو ادبی حیثیت سے تو امانت کی اندر سبھا کی برابر نہیں ہے گو
ڈراما کی حیثیت سے اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہو۔ بعد کے زمانے میں جب تھیٹریکل کمپنیوں کا رواج ہوا
تب بھی اندر سبھا کی مقبولیت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا اور اس کو لوگ اور تماشوں سے ہمیشہ بہتر سمجھتے تھے۔ اس
کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ وہ دیوناگری۔ گجراتی۔ گورمکھی اور اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کی گئی اور اس کے کم
سے کم چالیس ایڈیشن انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں اس کا ترجمہ جرمن میں بھی ہوا جو بمقام لیپزگ ۱۸۹۲ء
میں شائع ہوا۔ اب سنا جاتا ہے کہ ایک نہایت عمدہ اور تنقیدی ایڈیشن اندر سبھا کا لاہور سے نکلنے والا ہے۔

اردو ڈراما اور پارسی

ابتدا میں ہندو دیومالا کے قصے بطور تماشے کے دکھلائے جاتے تھے ان کو دیکھ کر چند پارسی
نوجوانوں کے دل میں خیال آیا کہ کچھ قدیم ایرانی قصے جس میں رستم و سہراب وغیرہ کا ذکر ہو عجلت کے ساتھ تیار کئے
جائیں اور چھوٹ موٹ کے اسٹیج پر لوگوں کو دکھائے جائیں۔ ان تماشوں کو ایسے لوگوں نے بھی دیکھا جو یورپی
تھیٹر دیکھ چکے تھے اور اُن کی نسبت اچھی رائے ظاہر کی چند ہوشیار پارسیوں نے جو کاروباری قابلیت رکھتے تھے
اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر چند کمپنیاں بڑے بڑے شہروں میں مثلاً دہلی۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی تھیٹر کی نقل
میں قائم کیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پسٹن جی فرام جی کی تھی جن کو اردو اسٹیج کا ابو الآبا سمجھنا چاہیے یہ اردو
خوب جانتے تھے بلکہ شعر بھی کہتے تھے رنگ اور پرویز تخلص کرتے تھے اور نواب علی نفیس سے اصلاح لیتے تھے

اوریجنل تھیٹریکل کمپنی رونق بنارسی

ان کی کمپنی کا نام اوریجنل تھیٹریکل کمپنی تھا جس میں یہ خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کرتے
تھے اور خورشید جی بالی والا کاؤس جی کھٹاؤ سہراب جی اور جہانگیر جی مشہور ایکٹر تھے۔ تماشوں کی زبان اردو تھی
مگر لکھنؤ اور دلی کی خالص اور عمدہ اردو نہیں بلکہ ایسی زبان جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ کمپنی چونکہ تاجرانہ غرض
سے قائم ہوئی تھی لہذا تماشوں میں وہی زبان استعمال کی جاتی تھی جو بمبئی۔ گجرات۔ بنگال۔ غرض کہ تمام صوبجات
ہندوستان میں بخوبی سمجھ میں آسکے۔ تماشے اندر سبھا کی تقلید میں نظم میں ہوتے تھے نیز اس وجہ سے کہ کانوں کو خوش آیند
معلوم ہوتا۔ اس زمانے کے ڈراما نگار رونق بنارسی اور میاں حسینی متخلص بہ ظریف تھے۔ رونق بمبئی میں رہتے تھے

اور انگریزی تماشوں سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ ان کا ایک تماشا "الضاف محمود شاہ" زبان گجراتی میں ۱۸۸۲ء میں بمبئی سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ظریف کے بہت سے تماشے ہیں جن میں نتیجہ عصمت۔ خداداد۔ دوست۔ چاند بی بی۔ بلبل بیمار وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ جب فرام جی بانی کمپنی کا انتقال ہو گیا تو بالی والا اور کاؤس جی نے اپنی اپنی کمپنیاں علیحدہ قائم کیں۔

وکٹوریہ ناٹک کمپنی طالب بنارسی | یہ کمپنی خورشید جی بالی والا کی قائم کردہ تھی اور اس کا تھیٹر ۱۸۷۷ء کے مشہور دربار دہلی کے موقع پر موجود تھا۔ خورشید جی خود ایک بہت بڑے مشہور ایکٹر تھے اور اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اور کامک پارٹ علی الخصوص خوب کرتے تھے۔ ان کی ایکٹنگ میں کسی قسم کا بازاری پن یا تکلف اور آورد نہیں معلوم ہوتی تھی اور نہ اُن کو شرم اور جھجک تھی جس سے شکسپیر بھی مرعوب ہو جاتا تھا۔ ان کو اسٹیج پر دیکھتے ہی لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ان کی کمپنی میں اور مشہور ایکٹر یہ تھے۔ رستم جی۔ مس خورشید مس مہتاب۔ اور ایک یوروپین مس میری فنٹن جو ہندوستانی چیزیں بھی خوب گاتی تھی۔ یہ کمپنی ایک زمانہ میں انگلستان بھی گئی تھی مگر اس کا وہاں بہت بڑا نقصان ہوا۔ جو آخر میں بمبئی میں پورا کر لیا گیا۔

طالب بنارسی | منشی بنایک پرشاد طالب بنارسی اس کے ڈراما نگار تھے۔ طالب شعر بھی کہتے تھے اور راسخ دہلوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے فن ڈراما کو ترقی دی اور اس کی زبان اور مضامین کو بھی درست کیا۔ ان کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ان کا ایک ڈراما لیل و نہار ہے جو لارڈ لٹن کی اسی نام کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے اس میں مترجم نے اصل کتاب کی خوبصورتی کو بہت کچھ قائم رکھا ہے ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔ دکرم ولاس دلیر دل شیر۔ نازاں۔ نگاہ غفلت۔ ہریش چندر۔ گوپی چند۔

الفرڈ تھیٹریکل کمپنی۔ احسن لکھنوی | وکٹوریہ کمپنی کے مقابلہ میں الفرڈ تھیٹریکل کمپنی قائم ہوئی جس کو کاؤس جی کھٹاؤ نے قائم کیا تھا۔ برخلاف خورشید جی کے جو ایک بڑے کامک ایکٹر تھے۔ کاؤس جی ایک مشہور ٹراجک ایکٹر تھے یعنی جذبات درد و غم دکھانے کے استاد تھے۔ ان کو لوگ ہندوستان کا ارونگ کہتے تھے جو حق بجانب ہے یہ شکسپیر کے رومیو اور ہیملٹ کا پارٹ خوب کرتے تھے اور مثل خورشید جی کے یہ بھی کامل الفن تھے۔ مرض ذیابیطس میں بمقام لاہور ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا۔ ان کی کمپنی کے مشہور ایکٹر منچیر شاہ۔ گلزار خاں۔

مادھورام۔ ماسٹر موہن۔ ماسٹر منچیر جی۔ مس زہرہ اور مس گوہر تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر جی نے تھیٹر چار یا پانچ سال تک چلایا اور پھر کلکتہ کے مشہور تاجر مسٹر میڈن کے ہاتھ فروخت کر ڈالا میڈن کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

احسن لکھنوی | الفرڈ کمپنی کے سب سے پہلے ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے جن کا نام سید مہدی حسن ہے اور حکیم نواب مرزا شوق مشہور مصنف زہر عشق و بہار عشق وغیرہ کے نواسے ہیں۔ احسن صاحب صرف ایک کامل ڈراما نگار بلکہ ایک شاعر خوش گو اور بہت اچھے موسیقی داں بھی ہیں، ان کی ڈراماؤں کی زبان نہایت فصیح اور بامحاورہ ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ زباں داں ہیں۔ ان کی ایک مشہور تصنیف واقعات انیس ہے جس میں میر انیس مرحوم کے حالات زندگی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ڈرامٹک تصانیف یہ ہیں۔ فیروز گلنار۔ چندراولی۔ دلفروش۔ بھول بھلیاں۔ بکاؤلی۔ چلتا پرزہ۔

بیتاب دہلوی | احسن کے بعد الفرڈ کمپنی کی ڈراما نگاری کی خدمت پنڈت نرائن پرشاد بیتاب دہلوی کو سپرد ہوئی جو پنڈت ڈہلارائے کے بیٹے اور فن شعر میں سردار محمد خاں طالب شاگرد غالب کے شاگرد تھے کبھی کبھی اپنا کلام نظیر حسین سخا کو بھی دکھاتے تھے۔ یہ کمپنی میں باقاعدہ کام کرتے اور بمبئی میں رہتے تھے۔ ایک رسالہ موسوم بہ شیکسپیر نکالتے تھے جس میں استاد زمانہ کے مشہور ڈراموں کا ترجمہ چھپتا تھا۔ یہ اب بند ہو گیا ہے۔ تصانیف حسب ذیل ہیں:۔ قتل نظیر۔ مہابھارت۔ زہری سانپ۔ فریب محبت۔ رامائن۔ گورکھ دھندا۔ پتنی پرتاپ کرشن سداما۔ "قتل نظیر" پہلا تماشہ تھا جو بیتاب نے کمپنی کے واسطے تیار کیا تھا اس کی مقبولیت کی شاید یہ وجہ بھی ہو کہ اس زمانے میں دلی کی ایک رنڈی نظیر نامی مار ڈالی گئی تھی جس کا چرچا لوگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ "مہابھارت" کا تماشا سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں بمقام دہلی دکھلایا گیا جو بہت مقبول ہوا اور اب بھی لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں بیتاب اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں کہ مہابھارت وغیرہ ہندوؤں کے مذہبی کتابوں سے جو دلچسپ واقعات کا خزانہ ہیں ضروری ضروری دلچسپ واقعات چن لیتے ہیں اور ان کو نہایت عمدہ اور دلفریب طریقے سے ڈراما کا جامہ پہناتے ہیں۔ ان کو ہندی میں بھی بڑا عبور ہے اور ان کے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیریں اور موثر ہوتے ہیں انھوں نے متعدد تاریخی واقعات کو مثلاً درو پدی کا مہاراج سری کرشن جی کی خون بہتی انگلی باندھنے کے واسطے اپنی

ساری پہاڑ ڈالنا اور سیوا اور چپتیا چماروں کا قصہ وغیرہ نہایت اُستادی اور حسن سے اپنے ڈراموں میں باندھا ہے۔ وہ سین جس میں ساری پہاڑ ڈالنا دکھایا گیا ہے بعض نکتہ چین اس کو خلاف قواعد فن اور خلاف تہذیب خیال کرتے ہیں مگر اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس سے انتہا درجہ کا اعتقاد اور محبت اور سری مہاراج کی عظمت کا ثبوت بہم پہونچتا ہے۔ ایک اور اعتراض ان کے تماشوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ نہایت بھونڈے پن اور دقیانوسی طریقے پر دکھلائے جاتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی زبان بھی ایک حد تک ضرور قابل اصلاح و ترقی ہے۔ ان کے یہاں نثر مقفیٰ کی بہتات ہے جو بعض وقت بہت بُری معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہندی اور سنسکرت الفاظ فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ بہت بُرے اور بے میل معلوم ہوتے ہیں اور کانوں پر گراں گزرتے ہیں۔ اشعار بھی موقع و بے موقع مکالمے میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض وقت رنج و غصہ کے موقع پر بھی شعر ہی پڑھے جاتے ہیں جو بالکل خلاف فطرت چیز ہے۔ مگر باوجود ان سب کمیوں کے بیتاب نے ڈراما نگاری میں توسیع اور ترقی ضرور کی۔ بعض مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ بیتاب چونکہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو سناتن دھرمیوں کو ناگوار اور ناپسند ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ ان تماشوں کی شہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ مشہور حسین عورتیں اس میں تماشہ کرتی تھیں۔ مختصر یہ کہ بیتاب کے جذبات عمیق اور ان کے کیرکٹر زبردست ہوتے ہیں اور وہ اُصول ڈراما کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیو الفرڈ کمپنی۔ آغا حشر کشمیری | ایک شخص محمد علی ناخدا نامی نے ایک دوسری کمپنی الفرڈ کمپنی کے طرز پر کھولی اور اس کا نام نیو الفریڈ رکھا۔ مشہور کامک ایکٹر سُہراب جی اس کے منیجر تھے جو بعد کو شریک بھی ہو گئے۔ یہ کمپنی ادھر ادھر پھر پھرا کے آخر کار احمد آباد میں مستقل طور سے قائم ہو گئی۔ عباس علی جو بعد کو جوبلی کمپنی میں چلا گیا اور امرت لال کیشو اس کے مشہور ایکٹر تھے۔ امرت لال کا مس گوہر کے ساتھ تعلق ہو گیا تھا اور یہ دونوں آدمی آخر میں پارسی ناٹک منڈلی میں چلے گئے جس کے مالک فرام جی اپو نے امرت لال کو اپنی کمپنی کا منیجر بنا لیا۔ اور امرت لال نے چند اور آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈراما امرت نکالا۔ امرت لال کا انتقال اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہو گیا۔

آغا حشر کشمیری | آغا حشر کشمیری الاصل ہیں۔ مگر عرصہ سے ان کا خاندان بنارس میں مقیم ہے اور شال کی

تجارت ہوتی ہے۔ حشر کی ولادت امرتسر میں ہوئی۔ وہ نہایت ذکی الطبع آدمی ہیں۔ انھوں نے بہت سے تماشے نیو الفریڈ کے واسطے تحریر کئے جن کے پلاٹ زیادہ تر یورپی ڈراموں سے لیے گئے اور کچھ ڈرامے انکی مستقل تصنیف بھی ہیں۔ نیو الفریڈ سے ترک تعلق کے بعد انھوں نے اپنی ذاتی کمپنی موسوم بہ شکسپیر تھیٹریکل کمپنی کھولی جو نقصان اٹھا کر تھوڑے ہی دنوں میں بمقام سیالکوٹ بند ہوگئی۔ اس کے بعد حشر کلکتہ چلے گئے اور میڈن کے یہاں ایک معقول تنخواہ پر فلم ایکٹر ہوگئے۔ مگر اب بھی وہ کبھی کبھی کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ بعض مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔ شہید ناز۔ مرید شک۔ اسیر حرص۔ ترکی حور۔ خوبصورت بلا۔ سفید خون وغیرہ بعض ہندی ڈرامے بھی لکھے۔ مثلاً سورداس۔ سیتا بن باس۔ گنگا اترن وغیرہ۔

آغا حشر کو لوگ اردو ڈراما کا مارلو کہتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں مارلو کا رنگ بہت ہے۔ وہ اپنے کیرکٹروں میں وفور جذبات دکھاتے ہیں ان کا عشق بہت گہرا اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں۔ وہ نثر و نظم دونوں کے استاد ہیں اور ان کا انداز بیان اُس جگہ خوب معلوم ہوتا ہے جب کہ دو کیرکٹروں سے جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں آپس میں مکالمہ کراتے ہیں۔ اس قسم کے سین آپ کو اسیر حرص، خوبصورت بلا اور سورداس میں ملیں گے آغا حشر کی ڈراما نگاری میں عیوب بھی وہی ہیں جو مارلو میں ہیں۔ یعنی جذبات کی شدت نہ کہ لطافت۔ اور نوق البھڑک رنگ بجائے اس کے کہ رنگ ہلکے ہوں اور ان میں تال میل کا خیال ہو۔ ان چیزوں کا اثر نازک اور حساس دماغ پر بہت پڑتا ہے علی الخصوص ایسے سین جن میں قتل و غارتگری وغیرہ دکھائی جاتی ہے۔ آغا حشر پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ایک ہی تماشے میں دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں جس سے توجہ منتشر ہو جاتی ہے اور خاتمہ میں کمزوری اور بے راہروی پیدا ہوجاتی ہے۔ اکثر جگہ شعر کو ایکشن پر ترجیح دیتے ہیں یا اشعار کو محض حسن بیان کے طور پر لکھتے ہیں جو اصول ڈرامہ نگاری کے خلاف ہے۔ کبھی کبھی واہیات اور سوقیانہ دل لگی اور مذاق شامل کیا جاتا ہے جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے بعض اوقات بیان واقعات میں عجلت کی جاتی ہے جس سے ایکشن پر برا اثر پڑتا ہے۔ مگر باوجود ان تمام عیوب کے آغا صاحب ایک مشہور شخص ہیں اور اُن کی تصانیف اُردو ڈراما میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔

دوسری کمپنیاں | مذکورہ بالا کمپنیوں کے علاوہ جو کمپنیاں قائم ہوئیں اُن میں سے بعض مشہور کے نام ہم یہاں

لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ (۱) اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں قائم ہوئی تھی ۱۹۱۰ء میں لاہور میں جل گئی۔ مگر اپنے مالک آردشیرجی کی قابلیت اور حسن انتظام کی وجہ سے پھر دوبارہ قائم ہوئی (۲) جوبلی کمپنی دہلی۔ اس کو دلّی کے ایک امیر آدمی نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام قائم کیا تھا۔ اس میں عباس علی گلرو زرینہ اور جام جہاں نما میں پارٹ کرتے تھے۔ (۳) بھارت ویاکل کمپنی میرٹھ اس میں بدھ بھگوان کا تماشہ خوب ہوتا تھا تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد احمد آباد میں ختم ہوگئی (۴) امپریل کمپنی اور (۵) لائٹ آف انڈیا۔ ان میں حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی تماشہ کرتے تھے حافظ عبداللہ کے بعض تماشوں کے نام یہ ہیں جشن پرستان۔ انجام ستم۔ ستم ہامان وغیرہ۔ اور مرزا نظیر بیگ نے نل دمن۔ بہار عشق فسانۂ عجائب۔ ماہی گیر وغیرہ لکھے۔

آخر انیسویں صدی کے مشہور ڈرامانویس علاوہ مذکورۂ بالا ڈرامانویسوں کے اس زمانے کے بعض ڈرامانویس جن کی تصانیف کتبخانہ انڈیا آفس میں محفوظ ہیں یہ ہیں غلام حسین ظریف مصنف انجام سخاوت ۱۸۸۹ء محمد عبدالوحید قیس جنھوں نے انجام نیک و بد اور جلبۂ پرستان لکھا۔ فقیر محمد تیغ مصنف انجام الفت۔ و بینظیر و بدر منیر۔ نیر دز شاہ خاں مصنف بھول بھلیاں ترجمۂ شکسپیر۔ احمد حسن وافر مصنف بلبل بیمار۔ میر کرامت اللہ۔ میر عبدالماجد مقصود علی۔ امداد علی مصنف البرٹ بل اردو میں سب سے پہلا سیاسی ڈراما) جہانگیر ترجمۂ ہملٹ

شروع بیسویں صدی کے بعض ڈرامانویس (۱) منشی غلام علی دیوانہ الگزنڈرا تھیٹریکل کمپنی ہیں۔ تائید یزدانی اور مہر جبا ان کے تماشے ہیں۔ (۲) منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی حشر کے شاگرد ہیں اور آتشیں ناگ۔ نگاہ ناز خود پرست وغیرہ کے مصنف ہیں (۳) منشی رحمت علی مصنف ورد جگر، باوفا قاتل وغیرہ پہلے البرٹ تھیٹریکل کمپنی کے منیجر تھے۔ اب پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں (۴) دوارکا پرشاد افق مصنف رام ناٹک جو ایک بہت طویل ڈراما ہے (۵) مرزا عباس مصنف نور جہاں و شاہی فرمان وغیرہ (۶) آغا شاعر دہلوی شاگرد داغ۔ مصنف حور جنت (۷) و (۸) لالہ کشن چند زیبا و لالہ نانک چند ناز۔ یہ دونوں پنجابی ہیں اور اکثر ڈراموں کے مصنف ہیں جن کے غیر مانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہے (۹) لالہ کنور سین ایم۔ اے چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر سابق پرنسپل لا کالج لاہور۔ ڈراما کے مشہور نقاد ہیں۔ ان کا ڈراما برہمانند ناٹک

بہت عمدہ ہے اس میں آسمانی ستاروں کے کیرکٹر دکھائے گئے ہیں۔ (۱۰) بشمبر سہائے بیاکل مصنف مدھ دیو جو بہت مقبول ہوا اس میں شانتی رس یعنی قلبی اطمینان کی بہترین تصویر کھینچی ہے۔ یہ اُن عیوب سے پاک ہے جو اُردو کے اکثر ڈراموں میں پائے جاتے ہیں۔ بیاکل بھات بیاکل کمپنی کے روح رواں تھے جو میرٹھ میں قائم ہوئی تھی اور ایک زمانے میں شمالی ہندوستان کی کمپنیوں میں بہت مشہور تھی اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اکثر ایکٹر پڑھے لکھے اور اچھے طبقے کے لوگ تھے۔ علی اطہر اس کمپنی کا ایک مشہور ایکٹر تھا۔ منشی جانیشر پرشاد مائل دہلوی اڈیٹر رسالہ زبان نے اس کمپنی کے واسطے دو تماشے چندر گپت اور تیغ ستم تیار کئے تھے (۱۱) حکیم احمد شجاع بی۔اے۔ اسسٹنٹ سکرٹری لیجسلیٹو کونسل پنجاب و اڈیٹر رسالہ ہزار داستان ایک اچھے افسانہ نگار اور ڈراما نویس ہیں۔ باپ کا گناہ۔ بھارت کا لال۔ جانباز وغیرہ کے مصنف ہیں۔ مگر ان کے ڈراما اسٹیج پر اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ (۱۲) سید امتیاز علی بی، اے مصنف انار کلی، دو لھن وغیرہ۔ بالفعل رسین کے الگزینڈر کا ترجمہ کر رہے ہیں (۱۳) سید لاور علی شاہ۔ مصنف پنجاب میل۔ معمولی ڈراما ہے (۱۴) خان احمد حسین مصنف حُسن کا بازار وغیرہ (۱۵) رادھے شیام اکثر مذہبی ڈراما لکھتے ہیں جو اہل ہنود میں بہت مقبول ہیں (۱۶) سُدرشن جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ادبی، سیاسی اور سوشل ڈراما اُردو میں ادبی ڈراموں کی بہت قلت ہے مگر پھر بھی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔ میکبھر سن اور لوسی اور قاسم و زہرہ مولفہ شوق قدوائی۔ شہید وفا مولانا شرر مرحوم۔ ذکرم اروسی مترجمہ مولوی عزیز مرزا مرحوم۔ روس و جاپان مولفہ مولوی ظفر علیخاں۔ تسخیر فرانس جو شکسپیر کے ہنری خامس کا ترجمہ ہے اور جولیس سیزر مترجمہ سید تفضل حسین نصیر۔ منشی جوالا پرشاد برق کے شکسپیر کے اکثر ناٹکوں کے ترجمے جس میں معشوقۂ فرنگ رومیو جیولٹ کا منظوم ترجمہ ہے۔ بیداری حکیم اطہر صاحب اڈیٹر تحریک۔ ان کے علاوہ منشی محمد عمر صاحب مترجم ہائیکورٹ جموں کشمیر اور منشی نور الٰہی نے جو ناٹک ساگر کے مشہور مصنف ہیں جو تمام ملکوں کے ڈراما کی ایک مبسوط گو کسی قدر نامکمل تاریخ ہے اور اس سے اس باب میں بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔ اکثر مفید اور دلچسپ ڈراموں کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش نہایت قابل تعریف ہے اور ان دونوں اصحاب کو اس فن میں خاص مہارت ہو گئی ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ

زیادہ تجربے کے ساتھ یہ زبان پر پوری قدرت اور فن ڈراما نگاری میں عبور حاصل کریں گے ان کی بعض تصانیف حسب ذیل ہیں (۱) روح سیاست جس میں امریکہ کے مشہور پریسیڈنٹ ابرہام لنکن کی زندگی کے حالات اور مقصد نہایت خوبی سے ڈرامے کی صورت میں دکھایا گیا ہے (۲) جان نثار فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس میں کنجوسوں کی بہت خبر لی گئی ہے (۳) قزاق۔ مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس شلر کی کتاب کا ترجمہ ہے (۴) بگڑے دل۔ مولیر کی ایک دوسری کتاب کا ترجمہ (۵) ظفر کی موت۔ میٹرلنک کے ایک ڈراما کا ترجمہ ہے۔

سوشل ڈراموں کے ذیل میں مولوی عبد الماجد صاحب دریا آبادی کا زود پشیمان جس میں کم عمری کی شادی کی قباحتیں دکھائی ہیں قابل ذکر ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایم اے۔ جو ایک خوشگو شاعر اور بہت بڑے مضمون نگار ہیں ڈرامہ سے بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالفعل کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکریٹری کے عہدے پر ممتاز ہیں۔ راج دلاری اور مراری دادا آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ راج دلاری پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے منظور ہوگئی ہے مسٹر کنور سین مشہور نقاد ڈراما ان دونوں کتابوں کی نسبت لکھتے ہیں" یہ دونوں ڈرامے ہمارے سوشل اور خانگی زندگی کے بہترین نمونے ہیں ان کے لکھنے کی غرض اصلاح معاشرت ہے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ ان کو پورا آئینہ اخلاق سمجھیں ان میں طبقہ متوسط کے مردوں اور عورتوں دونوں کے صحیح خیالات و جذبات اور نیز ان کے نقائص اور کمزوریاں اور ان کے عادات نہایت کامیابی سے دکھلائے ہیں طرز تحریر بہت شوخ، زبان بامحاورہ، اور خیالات بہت پاک و صاف ہیں ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جین آسٹن کے ناولوں کو برنارڈ شا نے ڈراما کا جامہ پہنا دیا ہے البتہ لائق مصنف میں اتنی کمزوری ضرور ہے کہ اپنی آزاد خیالی کو اُس کی منطقی حد تک نہیں پہونچایا ہے"۔ مولانا اثر مرحوم نے میوۂ تلخ پردہ کی سختی کی خرابیوں پر لکھا۔ غرض کہ زمانہ موجودہ میں متعدد ڈراما انھیں معاشرتی مسائل پر لکھے جاتے ہیں جن میں ضمناً یا صراحتاً مغربی تہذیب کی حد سے زیادہ تقلید کا خاکہ اُڑایا جاتا ہے۔

سیاسی صنف میں منشی امراؤ علی کا ڈراما البرٹ بل جو ۱۸۹۳ء میں بمقام لاہور شائع ہوا تھا یعنی اس وقت جبکہ مشہور البرٹ بل پر سخت مباحثہ ہورہا تھا اور نیز ایک اور ڈراما جس میں انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد کو

بیان کیا ہے سیاسی ڈرامے کہے جا سکتے ہیں مگر یہ کوئی دلچسپ اور وقیع تصانیف نہیں ہیں۔ اسی طرح ترک موالات کے عروج کے زمانے میں بہت سے نام نہاد ڈرامے سیاسی مسائل پر لکھے گئے اور ممنوع ہو گئے اُن میں سے کوئی قابل ذکر نہیں الاوہ جو کشن چند زیبا نے زخمی پنجاب کے نام سے لکھا تھا۔

اُردو ڈراما کی ترقی میں مختلف لوگوں نے کیا حصہ لیا

جیسا اوپر بیان ہوا اندر سبھا سے اُردو ڈراما کی بنیاد پڑی مگر یہ مس کے طرز پر لکھی گئی نہ تو اس میں کوئی منتظم پلاٹ ہے اور نہ صحیح معنوں میں کیرکٹر ہیں۔ اس کے بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈراما کی بنیاد ڈالی یا کم سے کم اُس کی ترقی و اشاعت میں کوشش کی ان کی تصانیف کی وجہ سے زبان ہندوستانی یعنی اُردو کی ہندوستان کے مختلف حصّوں میں جہاں اُن کے ڈراما کھیلے گئے شہرت ہوئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ظریف کی غرض صرف دلچسپی اور تفریح تھی اُن کے ڈرام ادبی حیثیت سے ممتاز نہیں ان کے پلاٹ اور کیرکٹر بہت کمزور ہیں ان کی تحریر میں اُستادی نہیں پائی جاتی نثر و نظم دونوں ابتدائی رنگ کی اور ناقص ہیں۔ حافظ عبد اللہ اور مرزا نظیر بیگ نے ظریف کی پیروی میں اپنے تماشوں میں دو دو پلاٹ الگ الگ قائم کئے۔ اُن کے بعد طالب احسن نے اس فن کو ترقی دی اور زبان کو بھی ایک حد تک بہت درست کیا انھوں نے دو پلاٹوں کو ایک کر دیا۔ اور اسی پلاٹ میں بعض کیرکٹروں سے مسخرہ کا کام لیا یعنی کومیڈی کو بھی اُسی قصہ میں شامل کیا معمولی گفتگو مقفیٰ نثر میں ہوتی تھی اور نظم گیتوں کے واسطے مخصوص کی گئی کبھی کبھی گفتگو میں بھی اس کو زوردار اور موثر کرنے کے لیے شعر استعمال کئے گئے گیت زیادہ تر ہندی زبان میں ہوتے تھے اور اب ڈراما اوپرا کی حد سے نکل کر صحیح ڈراما کی حد میں آگیا کیرکٹر سازی ایکشن اور اختتام قصہ پر زیادہ توجہ کی گئی۔ طالب نے سب سے پہلے فارسی الفاظ کی ہندی میں آمیزش کی حشر نے پھر وہی طریقہ یعنی ایک قصہ میں دو پلاٹوں کا اختیار کیا ان کے خصوصیات کا بیان ان کے حالات میں مختصراً ہو چکا ہے۔ بیتاب کی شہرت ان کے دو مشہور ڈراموں مہابھارت اور رامائن سے ہوئی جس کے کیرکٹر مشہور سنسکرت شاعر بیاس سے لیے گئے جن کی تصانیف اپنی مجموعیت اور رنگینیت سے بہترین ڈراما کہی جا سکتی ہیں۔ بیتاب کے نقائص کو نشمبر سہائے نے اپنے ڈراما بدھ دیو میں دور کیا اس کی زبان گو اعلیٰ درجے کی بامحاورہ اُردو نہیں ہے مگر پھر بھی بہت زوردار زبان ہے جس میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے

خیالات بہت پاکیزہ اور انداز بیان بہت دلکش ہے۔ مسٹر کنور سین نے اپنی کتاب برہمانڈ ناٹک میں علم ہئیت یعنی ستاروں سے کام لیا اور واقعی بڑی استادی اور خوبی سے ترتیب دیا۔ کیفی صاحب نے سوشل مضامین پر ڈراما لکھے "نور وطن" اور "اتفاق"۔ بلاشبہ سیاسی ڈراما میں تاریخی ڈراما کا بھی اب رواج ہو چلا ہے اور زیادہ تر مشہور بنگالی ناٹکوں کے ترجمے ہیں ان کے علاوہ ہندو دیومالا اور ہندوستانی تاریخ بھی بہت کچھ مواد آج کل فراہم کر رہی ہے اور مغربی ڈراموں کے ترجمے بھی بکثرت ہو رہے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ڈراما بہت کچھ ترقی کر رہا ہے۔

اردو ڈراما کے دیر میں ظاہر ہونے کے اسباب ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یعنی یہ کہ سنسکرت اور ہندی ناٹک زوال میں آ کر متروک ہو چکے تھے اس کے علاوہ سنسکرت ناٹکوں کے جو ترجمے بڑے بڑے قابل انگریزوں مثلاً سر ولیم جونس۔ پروفیسر ولسن اور مونیر ولیمس نے کئے تھے وہ انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے اُن لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے جو اردو ڈراما لکھتے تھے اور یہ لوگ انگریزی کے ساتھ سنسکرت سے بھی ناواقف تھے اور نہ اُس کے جاننے کے خواہشمند تھے۔ لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اردو ڈراما کا صحیح وجود اُس وقت ہوا جب کہ اہل مغرب کا اثر اس ملک پر ہونے لگا۔ اس کے بعد البتہ سنسکرت ڈراموں کے بذریعہ انگریزی تراجم فائدہ اٹھایا جانے لگا

ابتدائی ڈراموں کے نقائص | شروع میں ڈرامے کی بالکل ادبی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ محض فائدے کی غرض سے کھیلے بھی جاتے تھے اور لکھے بھی جاتے تھے۔ پارسی لوگوں نے جو تجارت کا خاص مذاق رکھتے ہیں اس کام کو ایک کاروبار کی حیثیت سے اختیار کیا اور جب اُن کی کمپنیوں کو کامیابی ہوئی تو تماشے بھی بکثرت لکھے جانے لگے جن کے ماخذ جیسا اوپر مذکور ہو چکا ہے، ہندو دیو مالا۔ پرانے قصے اور افسانے انگریزی ڈراموں کے ترجمے بھی کچھ تھے۔ تماشے کی عمدگی اور تکمیل کا خیال مطلق نہیں رکھا جاتا تھا کسی پرانے قصے کے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور کچھ اشعار بطور گیت کے اور کچھ مذاق کی باتیں اس میں جوڑ کر تماشا تیار کر لینا بس یہی کافی تھا۔ ڈراما نگار بھی اُس وقت کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے زیادہ تر ایکٹروں میں سے یا اُن لوگوں میں سے جن کو اس قسم کے تماشے دیکھنے کا شوق ہوتا تھا یہ لوگ منتخب کر لیے جاتے تھے کبھی کبھی ایسے لوگ رکھ لیے جاتے تھے جو منیجروں کی ہدایت کے موافق جلد جلد تماشے تیار کر دیتے تھے بعض ڈراما میں یہ خرابیاں ہوتی تھیں کہ ان کی عبارت بہت سست ہوتی تھی

اشخاص ڈراما بجائے معمولی طریقے کے اشعار میں گفتگو کرتے تھے اور بعض اوقات غزلیں کی غزلیں اس قسم کی گفتگو میں شامل ہوتی تھیں اور اشعار بھی اعلیٰ درجے کے نہ ہوتے تھے بلکہ نہایت معمولی اور بے مزہ۔ نثر بھی انتہائی درجے کی مصنوعی اور غیر مکمل۔ پلاٹ اور کیرکٹر کا کہیں پتہ نہیں ایکشن نہایت ناہموار سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ٹریجڈی اور کامڈی جن کا کبھی میل نہیں ہو سکتا ایک ہی پلاٹ میں شامل کر دی جاتی تھیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ڈرامے نہایت ہی ادنیٰ درجے کے ہوتے اور مہذب با درمتین لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہرگز نہیں ہوتے تھے بوسہ بازی۔ گلے ملول، اور فحش گفتگو بے تکلف جائز تھی بلکہ اس سے بہت ٹکٹ والے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایکٹریس عورتیں زیادہ تر ادنیٰ درجے کی رنڈیاں ہوتیں۔ قتل وخونریزی کے سین بے تکلف اسٹیج پر دکھائے جاتے کامک پارٹ اور نقلیں وغیرہ نہایت ادنیٰ درجے کی ہوتی تھیں۔ غرضکہ فن ڈراما جن اعلیٰ عناصر سے مرکب ہے وہ بالکل ناپید تھے۔

کچھ عرصہ بعد انگریزی ڈراموں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور شکسپیر کے تماشے لوگوں کو بہت پسند آئے ان میں سے اکثر ترجمے کے ذریعہ سے اسٹیج پر دکھائے جانے لگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک میں بھی اصلیت کی جھلک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ان کی مقبولیت اس درجہ ہوئی کہ بعض تماشوں کے چار چار پانچ پانچ ترجمے کیے گئے جن میں سے اکثر کا ذکر انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں موجود ہے ان ترجموں میں اشخاص قصہ کے نام بدل کر ہندوستان کی مناسبت سے کچھ اور رکھ لیے گئے ہیں مگر اصلی کیرکٹر مترجموں کی سمجھ میں مطلق نہیں آئے۔ مثلاً شکسپیر کے مشہور تماشے ہیملٹ میں وہ سین جس میں ہیملٹ اپنے دل سے باتیں کرتا ہے مترجم صاحب بوجہ انگریزی نہ جاننے کے اُس کا صحیح مطلب بالکل نہیں سمجھ سکے۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی فرماتے ہیں انگریزی اسٹیج کا اثر ہندوستانی اسٹیج پر اس کی بناوٹ اُس کے سازوسامان اس کے پردوں وغیرہ سے پوری طرح ظاہر ہے۔ اردو ڈرامانے انگریزی ڈراما کی اندھا دھند تقلید دو طریقے سے کی۔ پہلے یہ کہ ابتدا میں جو انگریزی ڈراما جو پرابلم پلے کہلاتے تھے اور جن کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوسائٹی کے تمام پرانے رسم ورواج اور اخلاق وعادات کا خوب خاکہ اُڑایا جائے ان کی تقلید میں ابتدائی اُردو ڈراما بھی اس معاملے میں تمام پُرانی چیزوں کی نسبت بہت آزاد و بیباک ہو گیا۔ پس اس معاملے میں انگریزی ڈرامانے اُردو ڈراما کے ساتھ وہی کیا جو اٹالین ڈرامانے

فرنچ ڈراما کے ساتھ اور فرنچ ڈراما نے عہد رسٹوریشن کے انگریزی ڈراما کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسی تقلید کی وجہ سے انگریزی دھنیں ہندوستانی تھیٹروں میں رائج ہو گئیں مگر نہایت بھونڈے طریقے سے رائج ہوئیں اور بڑی خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کی نئی دھنوں کے واسطے معمولی شعرا نے نظمیں بھی اسی انداز کی لکھنا شروع کیں جس کا نتیجہ نہایت تمسخر انگیز ہو گیا یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی اردو شعر کو انگریزی دھن میں گائے اور چونکہ اس کوشش میں الفاظ ضرور ٹوٹ پھوٹ جائیں گے لہٰذا ان کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مسٹر کنور سین نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ خرابی انگریزی اثر کے علاوہ اور چیزوں کا بھی نتیجہ ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یعنی ایکٹروں کا ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنا۔ ڈراما نویسوں کی معمولی لیاقت۔ تماشائیوں کا اچھے بُرے میں امتیاز نہ کرنا۔ اور مالکان تھیٹر کا اپنے نفع کی غرض سے اُن لوگوں کو خوش کرنا جن سے انھیں زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ دوسری بات جو انگریزی دھنوں کے متعلق اوپر لکھی گئی یہ بالکل صحیح ہے اس سے واقعی ہندوستانی موسیقی کو جو نہایت سائنٹفک اور اعلیٰ درجے کی ہے بہت بڑا نقصان پہونچا۔

موجودہ ڈراموں میں اصلاح و ترقی موجودہ زمانے میں اردو ڈراما میں ایک نمایاں تغیر و ترقی دیکھی جاتی ہے۔ اردو ڈراما بہت تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اردو ڈراما پر یورپین ڈراما اور سنسکرت ڈراما اور انگریزی اور فرنچ ڈراموں کے ترجمے نیز بنگالی گجراتی اور مرہٹی ناٹکوں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک شخص بنارس میں تھے جن کا نام بابو ہرشچندر تھا۔ یہ بھارتندر کے لقب سے مشہور تھے اور ہندی ناٹک لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ سنسکرت سے پوری طرح واقف تھے اور مشہور کالیداس اور بھاؤ بھوتی کے رنگ میں ان کا کلام ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اپنے قصوں کے پلاٹ زیادہ تر پورانوں سے لیتے تھے جو دلچسپ قصوں اور افسانوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہیں اور اب یہ سب کو مسلّم ہے کہ پلاٹ کی درستی اور قصے کو خوبصورت بنا دینے میں وہ عجب کمال رکھتے تھے۔ چونکہ یہ ہندی میں لکھتے تھے لہٰذا ان کی تصانیف پر اس کتاب میں کوئی رائے زنی نہیں کی جا سکتی مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ ان کے تصانیف کا اثر مابعد کے اردو ڈراموں پر بہت کچھ ہوا مثلاً "راجہ ہرشچندر" "رکمنی منگل" "بلوا منگل" وغیرہ۔ بالفعل اردو ڈراما کے مضامین بہت توسیع کی جا رہی ہے۔ علاوہ اُن پرانے قصوں کے جن کا رواج اب تک تھا۔ اب نہایت دلچسپ دلچسپ قصے اسٹیج پر لائے جانے لگے

پولیٹیکل اور سوشل ڈراما بھی اب ترقی کر رہا ہے۔ قصوں کی عمدگی اور اخلاق آموزی میں بھی بہت کچھ فرق ہے عشق و عاشقی جو اسٹیج پر دکھائی جاتی ہے نیز وہ جذبات اور واردات قلبیہ جو ایکشن ذریعہ سے دکھلائے جاتے ہیں بہت اعلیٰ ہوتے ہیں نفسیات کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ ڈراما کے مضامین اور سطح نظر بہت وسیع ہوگئے ہیں کیرکٹر اور پلاٹ میں بھی ترقی ہے۔ ایکٹروں کو اپنے افعال پر کافی قابو ہوتا ہے اور اب وہ پہلا سا بے تکا پن ان میں نہیں ہے۔ خیالات اور الفاظ دونوں میں شستگی اور متانت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نتیجہ کی عمدگی پر بھی کافی توجہ کی جاتی ہے۔ نقلوں اور کامک پارٹوں میں وہ پہلے کی سی بدتمیزی اور پھکڑپن جو نفیس طبائع کو ہمیشہ ناپسند تھا اب نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ قدیم اور جدید اردو ڈراموں میں اب زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔

اصلاح و ترقی کی ضرورت مگر با ایں ہمہ اب بھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ ضرورت ہے۔ خیالات اور زبان دونوں اب بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہیں۔ الفاظ میں ڈرامائیت ہونا چاہیے بلکہ معنویت اور اصلیت کا زیادہ خیال رکھا جائے تکلف اور تصنع سے عبارت بالکل خالی ہو گفتگو کے موقع پر مقفّیٰ عبارت گو معین حافظہ بھی ہو مگر بے تکی معلوم ہوتی ہے اس کی جگہ بے تکلف سیدھی سادی بات چیت سے کام لیا جائے جیسا کہ موقع و محل کا تقاضا ہو۔ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بھی ابھی بہت اصلاح کی گنجائش ہے۔ اس کے واسطے بہت ہوشیار اور چابک دست ناظم چاہیے۔ تمسخر و مذاق کے موقعوں پر فحش اور بھانڈپن سے بچنا چاہیے اور مذاق نہایت ستھرا اور شائستہ ہونا چاہیے۔ اصلاح زبان پر بھی توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اصلی فن ڈراما نگاری سے ہمارے ڈراما نویس ابھی آشنا نہیں ہیں اور ہماری رائے میں یہ بات اسی وقت نصیب ہوگی جبکہ اس کام کو وہی لوگ کریں گے جو اس کام کے اہل ہیں اور جن کا قدرتی میلان طبع اس طرف ہے۔ اردو ڈراما کی ترقی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کا میدان عمل وسیع کیا جائے اور قابل اور اہل لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ نیز یہ کہ بہترین یورپین اور انگریزی ڈرامے اور پرانے سنسکرت ناٹک ترجمہ کرائے جائیں۔ جن سے ہمارے اہل وطن کو اصلی ڈراما کی حقیقت اور اعلیٰ آئیڈیل کا حال معلوم ہوگا۔ اور وہ دیکھیں گے کہ یہ فن شریف گزشتہ زمانے میں کس عروج تک پہونچ گیا تھا اور آج کل کی زندہ قوموں اور ملکوں میں اس کی ترقی کی کیا حالت ہے۔ اسی میں سے

ان کو اپنے ملک اور اپنی سوسائٹی کے حسب حال جو چیزیں مناسب معلوم ہوں اخذ کرنا چاہیئے مگر یہ ضرور ہے کہ ترجموں کی کثرت سے طبعزاد تصانیف دب جائیں۔ زمانۂ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے واسطے دلچسپ اور سوشل تماشے مرتب کئے جاویں اور سوسائٹی ہی سے اس قسم کے مضامین اخذ کئے جائیں۔ اس فن کو بہ نظر حقارت نہ دیکھا جائے اور ہمارے علما و فضلا اس کی تضحیک و تذلیل کے درپے نہ ہوں ایکٹروں پر بھی ذلت کی نگاہیں نہ ڈالی جائیں۔ ان کاموں کے واسطے زیادہ ہمت اور زیادہ سرپرستی کی ضرورت ہے۔ پردہ کی موجودگی سے ہمارے ناولوں اور ڈراماؤں میں جو بعض رکیک اور ذلیل باتیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً رسم پردہ اُٹھنے کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں کیونکہ موجودہ صورت میں سچے جذبات عشق کا اظہار ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص ایکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ ذات برادری سے خارج نہ کیا جائے۔ اسی طرح ڈراما نویس اور ایکٹر بھی اپنے اپنے پیشوں اور کاموں کو معزز سمجھیں۔

اُردو ڈراما کا مستقبل ہر چند کہ پیشین گو سچے نہیں سمجھے جاتے اور ان کی رائے کو معتبر نہیں مانا جاتا مگر با ایں ہمہ ہم یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ اُردو ڈراما اپنے لیے ایک روشن مستقبل رکھتا ہے۔ جس طرح اس باب کی ابتدا مسٹر عبداللہ یوسف علی کے فاضلانہ مضمون سے کی گئی تھی اُسی طرح اس کا اختتام بھی انھیں کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اُردو ڈراما بہت زور دار ترقی کے آثار پیدا کر چکا ہے تعلیم یافتہ اور ذی وجاہت لوگ یقیناً اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا دیکھتے ہیں اور اس کی آئندہ منزل ترقی ہماری رائے میں وہی ہوگی جو ایران ایسے ملک میں ہوئی کہ جہاں صحیح فن ڈراما سے کوئی واقف نہ تھا یعنی تاریخی اور سیاسی ڈراما نگاری۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شاہکار جو شیکسپیئر نے لکھے ہیں اُن کی تصنیف کے واسطے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انھیں کی سچی تقلید سے ہندوستان میں صحیح ڈراما نگاری کا مادہ پیدا ہوگا۔ اور اسی وقت اُردو ڈراما دنیا کے بہترین ڈراموں کی صف میں ایک ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہوگا"۔

باب ۱۹

زبان اُردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق بعض اہل الرائے لوگوں کی قیمتی رائیں

پورے ادب اُردو کا ایک خاکہ ابواب مذکورہ بالا میں کھینچا گیا۔ اس باب میں زیادہ تر زبان اُردو سے بحث ہوگی نیز یہ کہ ادب اُردو کا بہ مقابلہ دوسری دیسی زبانوں کے کیا مرتبہ ہے۔ اس باب کی ترتیب میں مولوی عبدالمجید صاحب کے اُس فاضلانہ مضمون سے بہت مدد لی گئی ہے۔ جو ماڈرن ریویو میں شائع ہوا ہے۔

اردو ایک فصیح اور شیریں زبان ہے | اُردو بالاتفاق ایک ایسی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت، شیرینی اور اظہار مطلب کے لیے بڑی شہرت رکھتی ہے یہ تہذیب تمدن کی زبان ہے اور اس میں خیالات اور حسیات کے نازک فرق ادا ہوسکتے ہیں چونکہ اس میں اکثر دوسری زبانوں کے مخصوص الفاظ و حروف شامل ہیں، مثلاً عربی، فارسی، ترکی سنسکرت وغیرہ، لہذا یہ بہ نسبت دوسری دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم بننے ادبی خیالات کو اچھی طرح ظاہر کرنے اور تمدن و شائستگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زیادہ تر موزوں ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے | ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنی اپنی قومی اور ملکی زبانوں کو چھوڑ کر اور ایک تیسری زبان اختیار کر کے ایثار و اتحاد کی ایک بیّن مثال پیش کی اور یہ زبان گو کہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اگر غیر ملکی ذرائع اس کی ترقی اور نشوونما کے باعث ہوئے لہذا اس سے بہتر عملی طور پر اتحاد کا بیّن ثبوت کوئی اس وقت تھا اور نہ اب ہے۔

ہندوستان کی زبان عام ہے | اُردو صحیح معنوں میں ہندوستان بھر کی "لنگوا فرینکا" یعنی زبان عام ہے کیونکہ اُن مقامات میں بھی جہاں یہ بولی نہیں جاتی بخوبی سمجھی جاتی ہے۔ اور زبانوں کا یہ حال ہے کہ صرف اپنے اپنے ملک یا دیس میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں مگر دوسری جگہ اُن کو سمجھنا دشوار ہے۔ مثلاً کشمیر میں اگر مرہٹی بولی جائے بہار میں گجراتی اور سندھ میں ٹامل تو بھلا ان کو کون سمجھے گا۔ مگر وہ زبان جس کو ہندوستانی یا اُردو کہتے ہیں ہر شخص اپنے ذاتی تجربے سے بتلا سکتا ہے کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور چپے چپے میں بلکہ دور دراز تک اس سے باہر بھی مثلاً عدن بندر سبیلہ مالٹا وغیرہ تک میں بے تکلف سمجھی جاتی ہے۔ ہم اپنے برادران وطن سے معافی کے خواستگار ہیں،

اور کسی دیسی زبان کی توہین یا برائی نہیں کرنا چاہتے مگر اصل یہ ہے کہ تمام دیگر دیسی زبانیں زیادہ سے زیادہ کسی ایک صوبے کی مخصوص زبان کہی جاسکتی ہیں اور اردو ایک بین الاقوامی اور ہر صوبہ کی زبان نی جاۓ گی اور چونکہ تمام دیسی زبانوں میں بہت سے اردو الفاظ شامل ہیں اور اب اور زیادہ ہوتے جاتے ہیں لہذا ان مقامات کے رہنے والوں کو بھی جہاں اردو عام طور پر نہیں بولی جاتی اس کے سمجھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

ایک وسیع زبان ہے

اردو ایک نہایت وسیع زبان ہے اور اس میں متعدد زبانوں کے الفاظ بکثرت شامل ہوگئے ہیں جس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نئے الفاظ و اصطلاحات کے بنانے میں آسانی ہوتی ہے مثلاً آجکل کے اردو لکھنے والے اگر مغربی سائنس پر کچھ لکھنا چاہیں تو وہ عربی فارسی سنسکرت اور انگلش وغیرہ سے بے تکلف الفاظ لے سکتے ہیں اور ان کو ایک ضروری تغیر اور مناسبت زبان کے ساتھ اپنا کرسکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل عربی سے زیادہ استعارہ کیا جارہا ہے جس سے کسی قدر زبان اردو مورد الزام اور غیر مطبوع ہوتی جاتی ہے۔

بعض یورپین محققین کی رائیں

اجے بیمس صاحب مصنف "انڈین فلالوجی" حسب ذیل رائے دیتے ہیں "میں اردو کو ایک نہایت ترقی کرنے والی اور شائستہ صورت اس بڑی اور وسیع زبان کی سمجھتا ہوں جو ہندستان میں رائج ہے اردو نہ صرف ایک وسیع، فصیح، معنی خیز اور جامع زبان ہے بلکہ یہی صرف ایک صورت ہے، کہ جس میں دریاۓ گنگ کے قریب کی رہنے والی قومیں اپنی زبان کی ترقی ایک صحیح طور پر دکھلاسکتی تھیں"۔ (دیکھو جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳۵ متعلق ۱۸۶۶ء صفحہ ۱)

مشہور فرنچ مستشرق "گارسن ڈی ٹاسی" لکھتے ہیں "اردو کی ہندستان بھر میں وہی پوزیشن ہے جو فرنچ (فرانسیسی زبان) کی یورپ میں ہے۔ یہی وہ زبان ہے جو ملک میں بکثرت مستعمل ہے عدالتوں میں اور شہروں میں جاری ہے ارباب ادب اپنی تصانیف اسی زبان میں لکھتے ہیں، موسیقی وال اپنے راگ راگنیاں اسی زبان میں تصنیف کرتے، اور اہل یورپ سے گفتگو بھی اسی میں کی جاتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اردو کو ہر مقام کے ہندو لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر یہی حالت ہر ملک میں ہر زبان کی ہے۔ مثلاً برٹنی کے کسان، عام اس سے کہ 'پروونس' یا 'السیس' کے ہوں اصلی فرنچ نہیں سمجھ سکتے۔ پس کیا یہ وجہ معقول ہوسکتی ہے کہ اردو عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے اٹھادی جاۓ؟"

جارج کیمبل مصنف "انڈیا ایز اٹ مائٹ بی" تحریر کرتے ہیں "میرے نزدیک یہ بہت مناسب ہو کہ تمام سرکاری اسکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کر دی جائے اور دیسی زبانیں بھی بشرط ضرورت رکھی جائیں میں اس کو بالکل ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی عام زبان کا ذریعہ کئے بغیر کام چلایا جا سکتا ہے اور چونکہ انگریزی کو ہندوستان کی زبان عام بنانا محال معلوم ہوتا ہے لہٰذا ہندوستانی ہی کو یہ فخر ملنا چاہیئے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اردو ہندوستان بھر کی زبان عام (لنگوافرنیکا) کہی جانے کی مستحق ہے کیونکہ یہی وہ زبان ہے جس کو ادنیٰ و اعلیٰ اور یہاں کے انگریز بھی بولتے ہیں اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے، جو کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتی ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بلا کسی تغیر کئے یا خفیف تغیر کے ساتھ اپنے میں جذب کر لیتی ہے اور پھر وہ لفظ اُسی کے ہو جاتے ہیں۔"

مسٹر ونسنٹ اسمتھ مصنف "ہسٹری آف انڈیا" اپنی کتاب کے آخر باب میں لکھتے ہیں "زبان اُردو جو ہماری زبان انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی اور قواعد صرف و نحو کی نرمی اور کثرت الفاظ کے بہت مشابہ ہے، ضرور اس قابل ہے کہ تمام مطالب عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹفک اس میں ادا کئے جائیں۔"

اُردو کی نام نہاد کم مائگی | یہ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ زبان اُردو کوئی ایسا سرمایہ ادب اپنے پاس نہیں رکھتی جس پر فی الحقیقت اُس کو ناز ہو نہ اپنے ارتقا و ترقی کی کوئی خاص تاریخ رکھتی ہے۔ یورپین محققین اُس کی طرف کم متوجہ ہوئے اور ہندوستانی ان سے بھی کم۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس میں کوئی چیز قدر و قیمت کی نہیں پائی جاتی اور جب اس کا مقابلہ کلاسکل (قدیم) اور متمدن مغربی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کی بے حقیقتی پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ ان اعتراضات کے دو جواب دیے جا سکتے ہیں ایک یہ کہ جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے وہ کوئی قدیم چیز نہیں ہے اور کسی جدید ادب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم زبانوں کی طرح بیش بہا ادبی خزانوں سے معمور ہو خلاف عقل ہے۔ اس کی ادبی زندگی فارسی سے علیحدہ رہ کر بہت کم گزری ہے دوسرے یہ کہ یہ بہت ہونہار زبان ہے اور اگر یہی رفتار ترقی رہی تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ایک ایسے ادب سے مالا مال ہو جائے گی جو دنیا کے بہترین ادبوں سے مقابلہ کر سکے اور اب بھی ہندوستان کی اور مروجہ زبانوں میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔

اقسام ادب اُردو ادب دو بڑی قسموں پر منقسم ہو سکتا ہے (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم۔ ترجمے زیادہ تر زبان انگریزی، فارسی، عربی اور شاذ و نادر ہندی اور سنسکرت سے اور دیسی زبانوں میں بنگالی، مرہٹی اور گجراتی سے بھی کئے جاتے ہیں۔

تصانیف مستقل تصانیف نظم، نثر، ناول، ڈراما پر مشتمل ہیں۔ نظم اُردو مختلف اقسام کی ہے اور نہایت ہی لطیف اور مزیدار ہے۔ اس میں پند و نصائح اخلاق حُسن و عشق کے افسانے، مرثیے، حمد و نعت، بادشاہ وقت کی تعریف ہجو ظرافت، اور زمانۂ حال کی نیچرل نظمیں مختلف مضامین پر سب کچھ موجود ہے۔ مشہور شعرائے اُردو ماضی و حال میر، سودا، درد، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، امیر، داغ، حالی، اقبال، حسرت و اکبر کے نام نامی نہایت فخر کے ساتھ پیش کئے جاسکتے ہیں جن کے کلام کے سمجھنے کے لیے ایک خاص ذوق سلیم اور مناسبت طبیعت کی ضرورت ہے۔ بالفعل نظم اُردو کا بہترین انتخاب مولوی محمد الیاس برنی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے ایک جدید اسلوب سے تین حصوں میں کیا ہے اور ہر حصہ (سٹ) کا علیحدہ نام رکھا ہے یعنی (۱) معارف ملت (۲) جذبات فطرت (۳) مناظر قدرت۔ یہ تینوں حصے بالاشتراک بارہ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ مولف نے ارادہ کیا ہے کہ ان میں نظم اُردو کے صرف بہترین انتخابات پیش کئے جائیں اور اس غرض سے اکثر شعرائے اُردو قدیم و جدید کا بہترین کلام باعتبار مضمون منتخب کیا ہے بہر طور یہ ایک اعلیٰ درجے کا مفید مجموعہ ہے اور کیا اچھا ہو کہ اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہے۔ مشہور نثاروں میں مرزا رجب علی بیگ سرور، سر سید، مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا آزاد، پروفیسر ذکاء اللہ مولانا حالی کے نام گنائے جاسکتے ہیں اور سرشار، شرر، مرزا رسوا، راشد الخیری اور پریم چند سے ناول افسانہ نویسی میں کون ایسا شخص ہے جو واقف نہ ہوگا۔

تراجم تراجم کے ذیل میں بھی زبان اُردو بہت مایہ دار ہے۔ دنیا کی اکثر مشہور مشہور کتابیں نظم اور ڈراما کی اُردو میں ترجمہ ہوگئی ہیں مثلاً ہومر کی الیاڈ، مہابھارت، رامائن، شکنتلا، میگھ دوت، وکرم اروسی رتو سنگھار، ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ۔ ٹیگور کی گیتان جلی، چترا مالی۔ اسی طرح شیکسپیئر کے اکثر ڈراموں سے اُردو والی پبلک بذریعہ ترجمہ کے خوب واقف ہے۔ شیریڈن کے بعض ڈرامے اور ڈینٹی، گوئٹے، لانگ فیلو

سودے، شیلی بائرن، ورڈسورتھ، اور ٹینیسن کی بھی اکثر مشہور مشہور نظموں نے اُردو کا جامہ پہن لیا ہے، افسانوں
اور ناولوں میں رینالڈس، اسکاٹ، میری کالیری۔ اور کانن ڈائل کی تصانیف وہ لوگ بہت پسند کرتے ہیں
بنکم چندر چٹرجی کے قریب قریب سب ناول اور ٹیگور کے بھی بہت سے قصے اُردو میں آ گئے ہیں۔ ابھی
تھوڑے عرصہ سے آسٹی نیسن رائڈر ہیگرڈ، آسکر وائلڈ، برناڈ شا۔ اور ایچ۔ جی ویلس کو بھی لوگ
پسند کرنے لگے ہیں۔ رشاروں میں مکالمے، کارلائل، اسمائیلس اور لیاک کی مشہور تصانیف ترجمہ ہو گئے
ہیں فلسفہ اور نفسیات میں افلاطون و ارسطو کی اکثر کتابیں چانکیا کے اقوال سنیکا کے فلسفیانہ خیالات، برکلے
کے مکالمات، اسی طرح بیکن۔ ہیوم کینٹ۔ مل۔ اسپنسر جیمس اور اسٹاوٹ کی بھی بعض تصانیف اُردو میں
موجود ہیں۔ تاریخ اور سوانحعمریوں میں پلوٹارک کی مشہور مشہور یونانیوں اور رومیوں کی سوانحعمریاں، رالن
کی تاریخ یونان، بیری کی تاریخ یونان، ڈوزی کا "اسپین اہل اسلام کی حکومت میں" والیس کی تاریخ
روس، ایبٹ کی سوانحعمری نپولین، بوناپارٹ گرین کی تاریخ انگلستان، ونسنٹ اسمتھ کی تاریخ ہندوستان
قدیم الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، مالکم کی تاریخ ایران اور گبن کی تاریخ زوال سلطنت روم۔ اور
اور اسی طرح اور بھی مشہور مشہور کتابیں اُردو میں موجود ہیں سیاسیات و معاشیات میں حسب ذیل کتابیں
قابل ذکر ہیں۔ ارسطو کی پالٹیکس، مل کا رسالہ لبرٹی اور پولٹیکل کانمی وغیرہ بیل کے قوانین دولت، مورلی کا
میکیاولی۔ لارڈ کرزن کا پریشا۔ مزینی کا فرائض انسان۔ شوسٹر کا اختناق ایران، بلنٹ کا مستقبل اسلام
اسی طرح سیلی، ولسن، پالاک، سجوک، جیونس، مارشل اور مارسین کی بھی بعض بعض کتابیں۔ سیاسیات کے
علاوہ بعض فلسفیانہ تاریخیں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں مثلاً گیزو کی تاریخ تمدن۔ بکل کی تاریخ تمدن انگلستان
لیبان کی تمدن عرب اور تمدن ہند۔ لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ۔ ڈریپر کی تاریخ ارتقائے یورپ۔ دت
کی تاریخ قدیم تمدن ہند فلسفہ تعلیم میں بھی اُردو اساتذۂ ذیل کی تصانیف سے ناواقف نہیں ہے۔ اسپنسر
ہیں۔ فرد ہیل۔ اسٹالوڈزی۔ ہربرٹ۔ مانٹی سوری۔ سائنس میں ڈریپر کی معرکۂ مذہب سائنس اور
ڈارون۔ ہیکل ہکسلی۔ لائل۔ گیکی۔ ٹنڈل۔ بوس۔ کیلون میکسول۔ کروک۔ اور سر آلیور لاج کی جدید
تحقیقاتیں اُردو میں آچکی ہیں۔ قانون اور طب کا ذکر بیکار ہے اس وجہ سے کہ اس کی اکثر کتابیں

بضرورت ترجمہ ہوگئی ہیں۔

مذہبی لٹریچر | اہل عرب فارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت و ہندی کا ایک معتدبہ حصہ ترجمہ ہوگیا ہے مذہبی کتابوں میں قرآن شریف۔ گیتا۔ پران۔ مہابھارت۔ رامائن کے ایک نہیں بلکہ متعدد ترجمے موجود ہیں۔ اسی طرح اکابردین مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ سری کرشن۔ سری رام چندر۔ گوتم بدھ۔ گرو نانک اور کبیر کے بھی مفصل حالات زندگی۔ نیز مقتدایان دین اور بڑے بڑے اہل دل صوفی اور رشی اور حکماء و شعراء نامی مورخین کے بھی حالات موجود ہیں مثلاً جوگیوں میں وششٹ متصوفین میں مولانا روم اور حافظ اخلاقی فلسفہ میں غزالی اور سعدی شعراء میں فردوسی حکماء میں بو علی سینا۔ مورخین میں ابن خلکان، ابن خلدون اور فرشتہ وغیرہ۔

ادب اردو کے سرچشمے | بالفعل ایسے سرچشمے جن سے ادب اُردو کا ہرا بھرا باغ سیراب ہورہا ہے حسب ذیل ہیں (۱) عثمانیہ یونیورسٹی جس میں دارالترجمہ قائم ہے (۲) انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن (۳) دارالمصنفین اعظم گڈھ ان تینوں جماعتوں کے حالات اپنی اپنی جگہ پر لکھے جاچکے ہیں اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنیں اور سوسائیٹیاں ادب اردو کی اشاعت و ترقی کے واسطے دلی، لکھنؤ اور لاہور میں قائم ہیں۔

ہندوستانی اکیڈمی قائم شدہ ۱۹۲۷ء | گورنمنٹ ممالک متحدہ نے صوبہ کی کونسل کی دلچسپیوں سے مطمئن ہوکر اپنے صوبہ میں ایک ہندوستانی اکیڈمی قائم کی ہے تاکہ اردو ہندی ادب کو ایک نمایاں ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسی پر کاربند ہوکر اکیڈمی نے جو اغراض و مقاصد اپنے واسطے منضبط کئے ہیں اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

(۱) خاص خاص مفید مضامین پر بہترین کتابوں کے واسطے مقابلہ کے انعامات تجویز کرنا۔

(۲) اچھی اچھی اور فائدہ مند اُردو ہندی کتابوں کا ترجمہ اپنے تنخواہ دار مترجموں سے کرانا اور اُن کو اپنی طرف سے چھپوانا اور شائع کرنا۔

(۳) اُردو ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف و تراجم کے واسطے ہندوستانی یونیورسٹیوں اور

ادبی انجمنوں یا دیگر مستحق اور قابل اشخاص کو مالی امداد دینا۔

(۴) قابل قابل اہل قلم کو اکیڈمی کی فیلوشپ (اعزازی ممبری) کے واسطے منتخب کرنا۔

اکیڈمی کے موجودہ نظام میں ایک کونسل اور ایگزیکیٹو کمیٹی داخل ہیں لیکن اصلی اختیارات فیلوؤں کے ہاتھ میں رہیں گے جن کا انتخاب کونسل سے ہوا کرے گا۔ کونسل میں بالفعل ایک پریسیڈنٹ پچاس انٹیٹیو ممبر اور تیس معمولی ممبر شامل ہیں (ان میں جنرل سکریٹری داخل ہی) جن کو شروع میں گورنمنٹ نے نامزد کیا تھا اور گورنمنٹ سے ابتدا میں مبلغ پچیس ہزار روپیہ بطور امداد کے اکیڈمی کو عنایت ہوا تھا۔ اور گورنمنٹ ہی نے سر تیج بہادر سپرو کے۔سی۔ایس۔آئی۔ کو اکیڈمی کا پریسیڈنٹ اور ڈاکٹر تاراچند پی۔ایچ۔ڈی کو اُس کا سکریٹری مقرر کیا تھا۔

اکیڈمی کا قیام سچ پوچھئے تو اُس عہد کے گورنر صوبہ مشہور اسکالر اور ناقد ہز ایکسلنسی سر ولیم میرس کی خاص ادبی دلچسپی اور ہمدردی۔ اور ان کے روشن خیال جوان ہمت اور موقع شناس وزیر تعلیم آنریبل رائے راجیشور بلی صاحب کی ان تھک کوششوں اور نیز منشی دیانرائن صاحب نگم کی سعی بلیغ کا معقول نتیجہ ہی کہ یہ مبارک اسکیم انہیں حضرات کی محنت و جانفشانی اور حقیقی دلچسپی کی وجہ سے درجہ تکمیل کو پہنچی اور انہیں کی آبیاری سے یہ تخم سرسبز ہوا۔ اکیڈمی اپنے وحید العصر خلیق و متواضع پریسیڈنٹ اور اپنے فاضل سکریٹری اور نیز اپنے قابل ممبروں کی کوششوں اور گورنمنٹ صوبہ کی نظر عنایت سے ضرور ایک درخشاں مستقبل اور ایک بارونق مطمح نظر اپنے سامنے رکھتی ہی۔

اُردو کا رسم الخط سنا ہی کہ اورنگ آباد اور حیدرآباد دکن میں اُردو کے رسم الخط کی درستی اور ترمیم کے واسطے بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسی غرض سے اکثر کمیٹیاں قائم ہوئی ہیں جنھوں نے اپنی تجاویز پبلک کے سامنے پیش بھی کی ہیں اگر سنا جاتا ہی کہ یہ جدید رسم الخط نو آموزوں کے واسطے نہایت پیچیدہ مشکل اور پریشان کن ہی۔ اور اس سے غلط پڑھنے اور غلط لکھنے دونوں کا قوی احتمال ہی۔ ممکن ہی کہ بعض اس قسم کے نقائص کے اظہار میں غلط بیانی یا غلط فہمی بھی ہوئی ہو مگر اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہی کہ موجودہ طریقہ تحریر میں جو نقائص اور کمیاں رہ گئی ہیں اُن پر ماہرین فن کی توجہ ضرور مبذول ہوئی اور یقیناً اس قسم کی خرابیاں کبھی نہ کبھی ضرور رفع ہو جائیں گی۔

ممبران ہندوستانی اکاڈمی سنہ ۱۹۲۸ع

P. T. O.

(۱) بیٹھے ہوئے (بائیں جانب سے) پروفیسر ضامن علی—نیاز فتحپوری—پروفیسر ناصری—سید مسعود حسن رضوی—بابو شیام سندر داس—لالہ سیتا رام—سرتیج بہادر سپرو—(پریسیڈنٹ) راے راجیشور بلی (وزیر تعلیم سابق)—بابو جگن ناتھ داس رتناکر—پنڈت اجودھیا سنگھ اُپادھیا—پنڈت رام نرائن مصر—پنڈت سریدھر پاٹھک—

(۲) کھڑے ہوئے (بائیں جانب سے)—مولانا صفی—مرزا محمد عسکری—سید سجاد حیدر یلدرم—بابو دھریندر ورما—پنڈت بدری ناتھ بھٹ—ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی—پروفیسر نعیم الرحمن—رام بابو سکسینہ—منشی پریم چند—

(۳) پچھلی صف (بائیں طرف سے)—ڈاکٹر تارا چند (سکریٹری)—پنڈت منوہر لال زتشی—ڈاکٹر بینی پرشاد—بابو دیا نرائن نگم—

ضمیمۂ تاریخ ادب اردو

بعد تیاری کتاب اصحاب ذیل کے حالات دستیاب ہوئے جو ضمیمہ کی صورت میں درج کیے جاتے ہیں

نظر لکھنوی

نوبت رائے نظر ایک معزز سکسینہ کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے افراد زمانۂ نوابی میں لکھنؤ میں معزز و ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ نظر لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت کے آثار اُن کے چہرے سے نمایاں تھے، اردو فارسی اور انگریزی کی ضروری تعلیم سے فراغت حاصل کر کے ہمہ تن شعر و شاعری میں منہمک ہو گئے جس سے کہ اُس وقت فضائے لکھنؤ معمور ہو رہی تھی۔ ستمبر ۱۸۹۷ء میں اپنا مشہور ادبی رسالہ "خدنگ نظر"[1] لکھنؤ سے جاری کیا۔ جو شروع میں تو صرف مجموعۂ غزلیات ہوتا تھا مگر بعد کو کچھ نثر کے مضامین بھی اس میں شامل ہوتے تھے شاعری میں آغا مظہر لکھنوی سے تلمذ تھا جن کی کوشش سے مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور انھیں مشاعروں کی غزلیں "خدنگ نظر" میں درج ہوتی تھیں یہ رسالہ تھوڑے عرصہ تک جاری رہ کر بند[2] ہو گیا۔

---

[1] "خدنگ نظر"، "پیام یار" کے بعد لکھنؤ کا سب سے قدیم اور مشہور گلدستہ تھا۔ اس کی اشاعت آصفی پریس نواز گنج لکھنؤ سے ہوتی تھی اور حضور نظام سابق میر محبوب علی خاں مرحوم کے نام نامی کے ساتھ معنون تھا۔ پہلے اس کے ٹائیٹل پر یہ شعر دیا جاتا تھا ؎ مانوس ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ ؛ بہلائیں دل کو سیر "خدنگ نظر" سے آپ کچھ عرصہ کے بعد یہ شعر دیا جانے لگا ؎ نکلا ہے بن سنور کے "خدنگ نظر"، نظر ؛ یاں دل دھڑک رہا ہو کسی کی نظر نہ ہو۔

[2] غالباً ۱۹۰۰ء میں بند ہوا۔

۱۹۰۴ء میں نظر رسالہ زمانہ کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی خدمات نہایت قابلیت اور مستعدی سے انجام دیتے رہے جیساکہ اس وقت کے رسالہ مذکور کے مضامین کی عمدگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد کی طلبی پر الہ آباد گئے اور رسالہ ادیب کی اڈیٹری پر فائز ہوئے جو اس وقت نیا نیا جاری ہوا تھا اور اردو رسالوں میں یہ اول درجے کا اور موقر پرچہ سمجھا جاتا تھا نظر نے اس نوزائیدہ بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور انھیں کی تربیت میں وہ پروان چڑھا اور اس کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ جو کسی اردو رسالے کو نہ اس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ نظر کا تعلق ادیب کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک رہا جس کے بعد ان کو پھر کانپور آنا پڑا اور وہ "زمانہ" کے اسٹاف میں دوبارہ داخل ہوئے۔ اب کی مرتبہ تقریباً دو سال تک کانپور میں رہے اور ہفتہ وار "آزاد" کی نگرانی بھی اُن سے متعلق ہوگئی۔ ۱۹۱۴ء میں وہ لکھنؤ آگئے اور یہاں زبان اُردو کے مشہور محسن اور شعر و شاعری کے دلدادہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کی وساطت سے رائے بہادر منشی پراگ نرائن بھارگو مالک نولکشور پریس و اودھ اخبار سے ملے اور منشی صاحب موصوف کی ہی نظر عنایت سے نظر کو اخبار تفریح کی اڈیٹری اور تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور اودھ اخبار کی اڈیٹری بھی مل گئی۔ اس میں انھوں نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے کام کیا کہ آخر صحت خراب ہوگئی اور اسی کے ساتھ روحانی آلام کا بھی سامنا ہوا یعنی اُن کا پیارا نواسا جس سے کہ وہ بہت مانوس تھے چل بسا اور کچھ عرصہ بعد اس بچے کی ماں یعنی اُن کی اکلوتی بیٹی بھی داغ مفارقت دے گئی جس سے کہ ان کا چراغ شادمانی گُل ہوگیا اور ان جانفرسا حادثوں کی بدولت اُن کو اپنا تعلق اودھ اخبار سے بھی قطع کرنا پڑا۔ انھیں حادثات اور مالی دشواریوں کی وجہ سے اُن کی زندگی کا آخری حصہ بہت تلخ ہوگیا تھا۔ آخر کار دمہ کے موادی مرض میں ایک عرصہ تک مبتلا رہ کر ۶۷ برس کی عمر میں ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔ لکھنؤ کا گلشن شاعری اس بلبل خوش الحاں کے اُٹھ جانے سے سونا ہوگیا۔ تمام شعرائے لکھنؤ کو جن کو ان سے دوستی اور محبت کا پیوند تھا۔ اس

واقعۂ جانگداز سے دلی صدمہ ہوا۔ اکثر نے تاریخیں کہیں جن میں مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے مادہ تاریخ خوب نکالا ہے ؎

کلکِ محشر نے لکھا سالِ وفات
شاعرِ کامل نظر سے چھپ گیا

نظر ایک نظری شاعر تھے اور یہی قدرتی میلانِ طبع اور کہنہ مشقی ان کی قدرتِ زبان اور کمالِ شاعری کا راز تھے۔ تلمذ بھی اُن کو لکھنؤ کے ایک مشہور اور مستند اُستاد سے تھا۔
رسالۂ زمانہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں نظر نے اپنے ابتدائی شوق کا حال نیز یہ کہ ۱۸۸۴ء میں ان کو آغا منظر سے شرفِ تلمذ کیونکر حاصل ہوا تھا نہایت دلکش طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا مصائب و آلام کی گھنگھور گھٹاؤں نے اُن کی عمر کو تیرہ و تار کر دیا تھا جس کا اثر حزن و یاس کی صورت میں اُن کے کلام پر بھی چھا گیا تھا جیسا کہ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے ؎

نظر اب چل کے کرنا چاہیئے آباد مرقد کو
بہت ہے منتظر اپنی زمیں گورِ غریباں کی

موت سے کیا ساز کر رکھا ہے اس نے اے نظر
مدتیں گزریں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات
اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی
زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے

آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑتا ہے باقی
اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے

تاریک ہو گئی ہے دنیا ہی جب نظر میں
پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے

دنیا سے جا رہے ہو کیا لے کے اے نظر تم
زادِ سفر نہیں ہے۔ رختِ سفر نہیں ہے

طولِ غم سے مختصر غم کی کہانی ہو گئی
جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہو گئی

ختم دلچسپی تری اے دارِ فانی ہو گئی
ہم بھی زندہ تھے کبھی وہ زندگانی ہو گئی

ہر قدم پر ایک نالہ ہر قدم پر ایک آہ
زندگی کیا ایک شرحِ سخت جانی ہو گئی

ہجر میں آنکھوں سے جاری ہے برابر سیلِ اشک
بن کے دو کوزوں میں دریا کی روانی ہو گئی

مے کو دنیا آتشِ سیال کہتی ہی نظرؔ
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہوگئی

کچھ اندوہ و یاس ہی پر موقوف نہیں نظرؔ کے کلام میں سلاستِ زبان، لطفِ بیان، اعلیٰ تخیل غرض کہ جملہ محاسنِ شاعری علی الخصوص وہ سب چیزیں جو غزل گوئی کی جان ہیں پوری طرح موجود ہیں وہ غزل ہی خوب کہتے تھے اور اسی صنف میں وہ اپنے امثال واقران میں ممتاز تھے اور وہ لوگ ان کی بڑی قدر و عزت کرتے تھے۔ اُن کے چند اشعار غزل جو رسالہ زمانہ اور دیگر رسالوں میں چھپ چکے ہمیں منتخب کرکے بطورِ نمونہ یہاں دیے جاتے ہیں ؎

گردشِ دہر بھی اک گردشِ پیمانہ ہے ذرہ ذرہ میں ترا جلوۂ مستانہ ہے
اک طبیعت کی اُداسی کا اثر اتنا ہے ساری دنیا نگہِ یاس میں ویرانہ ہے
حالتِ محفلِ عشرت ہے رقم سب اس میں ایک دفتر کے برابر پرِ پروانہ ہے
پرتوِ مہر کجا ذرۂ ناچیز کجا! کیوں یہ دل حسرتیِ جلوۂ جانانہ ہے
تیرے ملنے کی وہ تقریب جو ہی یاد اب تک جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہی اک افسانہ ہے

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی
دیکھ لو سیر دم نکلنے کی یہ ہوا پھر نہیں ہے چلنے کی
دل سوزاں کو شمع کیا کہئے اُس کو حسرت کہاں ہی جلنے کی

مسدس بھی نہایت عمدہ کہتے تھے۔ وہ مسدس جو بطورِ مرثیہ اپنے پیارے نواسے کی موت پر کہا تھا نہایت دردانگیز و مؤثر ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

ہوا تمام امیدوں کا خاتمہ تم پر کسی سے اب نہ توقع نہ ہے کسی پہ نظر
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا نہیں ہی خبر مرے یہ دیکھئے ملتا ہی اب کفن کہ بکھر
کہاں گئے مری بگڑی سنوارنے والے
پکار لو مجھے لالہ پکارنے والے

لکھو کہ اس اجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ — بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ — تمام عمر دل ناتواں ہے اور یہ داغ

نغان بلبل جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

اسی طرح ان کا وہ مسدس بھی جو جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ کے موقع پر کہا تھا دل ہلادینے والا ہے۔ آخر عمر میں جدید رنگ میں بھی طبع آزمائی شروع کی تھی مگر اس میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ جب کبھی اس رنگ میں کہنا چاہتے تھے وہ پرانا رنگ پھوٹ نکلتا تھا اور وہ کلام بھی غزل ہی معلوم ہونے لگتا تھا۔

علاوہ شعروشاعری کے وہ فن تنقید اور نثر نگاری میں بھی بہت ممتاز تھے۔ عرصہ تک رسالہ زمانہ میں نقاد لکھنوی کے نام سے کتابوں پر ریویو لکھتے رہے۔ معرکہ چکبست و شرر میں جو مثنوی گلزار نسیم کے متعلق چھڑ گیا تھا انھوں نے نمایاں حصہ لیا اور اُن کی رائے ہمیشہ بہت جچی تلی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتی تھی۔ جس سے ان کی ذاتی قابلیت اور شاعرانہ مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

اس بات پر نظر رکھتے ہوئے کہ وہ جدید طرق تنقید سے کماحقہ آگاہ نہ تھے اُن کے ریویو اور ادبی تنقیدیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔

مختصر یہ کہ نظر ایک اعلیٰ درجے کے غزل گو اور نقاد تھے ہرچند کہ اُن کا کلام کسی نئے پیام کا حامل نہ تھا۔ اُن کا کلام سلاست و روانی و پاکیزگی میں درگا سہائے سرور کے کلام سے بہت مشابہ ہے۔ بالفعل منشی بشیشر پرشاد نظر کے شاگردوں میں لکھنؤ میں موجود ہیں۔ افسوس کہ نظر کا کلام علاوہ اس کے جو رسالوں اور گلدستوں میں شائع ہوا جمع نہ ہوسکا۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی باہمت شخص اُن کا پورا کلام یکجا کر کے اس کو شائع کردے تو اس سے ادب اردو میں ایک مفید اور قیمتی اضافہ ہوجائے گا۔

چکبست لکھنوی

تحریک جدید کے مشہور لیڈر۔ روش تازہ کے صحیح راہبر، زمانۂ حال کی شاعری کے رُکن رکین۔ روش قدیم و جدید کے جامع۔ پنڈت برج نرائن چکبست فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اوائل عمر ہی میں اپنے وطن اصلی لکھنؤ میں آگئے جہاں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری اور ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت ایمان داری مستعدی اور سب سے زیادہ اپنی خوش اخلاقی سے وکلا کی صف اوّل میں آگئے۔ اور اُن کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوگئیں۔ مگر افسوس ہے کہ عنفوان شباب میں ایک عجب حسرت ناک طریقے سے انتقال کیا یعنی ۱۲ر جنوری ۱۹۲۶ء کو جب کہ وہ کسی مقدمہ کی پیروی میں رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ واپسی کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ایک شدید دورہ فالج کا ہوا جس سے کہ بےحس و حرکت ہوگئے اور زبان بند ہوگئی اور قریب سات بجے شام کے اسٹیشن ہی پر روح مفارقت کر گئی جب یہ وحشت ناک خبر اُن کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت مہاراج نرائن چکبست کو پہونچی تو وہ فوراً آگئے اور لاش موٹر پر لکھنؤ لے آئے۔ اس سانحۂ عظیم سے لکھنؤ بھر کو جو صدمہ اور قلق ہوا لائق بیان نہیں، عدالتیں بند کر دی گئیں۔ سر لوئی اسٹوارٹ چیف جج اور مسٹر کینڈل ڈسٹرکٹ جج لکھنؤ نے اپنے اجلاس پر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم کے قلب و دماغ کے صفات عالیہ کی بہت تعریف کی اور ان کی اس ناگہانی موت پر بے حد رنج و قلق کا اظہار کیا۔ دنیائے ادب بھی اظہار رنج و ملال میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے جن میں مختلف مذاہب کے لوگوں نے مؤثر اور دردناک تقریریں کیں بڑے بڑے شعرا اور ادبا نے دردانگیز اشعار اور مضامین سپرد قلم کئے تاریخیں کہیں جن میں سے بعض چیدہ چیدہ اشعار جو اس قعے پر کہے گئے تھے نذر ناظرین کئے جاتے

ہیں صفی صاحب فرماتے ہیں ؎

شمع بزم شعرا برج نراین چکبست
داغ فرقت سے تمھارے ادب اردو پر

شور ماتم ہی بپا حلقۂ احباب میں آج
ہائے بیتابی دل اور وہ بے تابی دل

بے وفا عمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس
دہر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس

شان اس بزم میں ہی بزم عزا کی افسوس
جب زباں بند ہوا اک نکتہ سرا کی افسوس

عزیز لکھنوی فرماتے ہیں ؎

شاعر نکتہ سرا برج نرائن چکبست
خادم قوم صفاکیش مرنجان د مرنج!

سبق آموز ہے ہر نظم مرصع اُس کی
جس کو قدرت نے دیا ذوق سخن روز الست

ساقی میکدہ نکتہ رسی جام بدست!
صاف ترشے ہوئے ہیرے ہیں کہ لفظوں کی نشست

ان کے علاوہ محشر، محروم، اور سحر ہنگامی نے بھی مؤثر نظمیں لکھیں علی الخصوص آخر الذکر کا کہا ہوا مرثیہ نہایت مؤثر اور حسرت انگیز ہی۔ مگر محشر صاحب نے کمال کیا کہ مرحوم ہی کے ایک مشہور مصرعہ سے لفظ عزا (۷۸) کا تعمیہ کر کے ایک نہی عمدہ تاریخ نکالی ؎

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہی ہمراہ عزا
موت کیا ہی انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کو شعر وشاعری کا شوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا کہا جاتا ہی کہ انھوں نے نو برس کی عمر میں غزل کہی تھی۔ طالب علمانہ زندگی میں بھی وہ اس شغل سے بے پروا نہیں رہی بلکہ کالج کے مشاعروں میں شریک ہو کر خراج تحسین کے علاوہ انعام اور تمغے بھی حاصل کرتے رہی۔ مگر شاعری کو دون مرتبہ سمجھ کر یا شہرت طلبی سے عار کرتے ہوئے کبھی انھوں نے کوئی تخلص نہیں اختیار کیا۔ ضرورت کے موقع پر صرف لفظ چکبست پر جو ان کا خاندانی نام تھا اکتفا کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں ؎

ذکر کیوں آئے گا بزم شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

شروع میں معمولی غزل کہتے تھے مگر کچھ عرصہ کے بعد قومی، سیاسی، سوشل اور نیچرل نظموں پر

آرہی جس میں انھوں نے کمال حاصل کیا۔ مُسدّس کا شوق اُن کو بہت تھا۔
تخلص کے ساتھ انھوں نے فرسودہ طریقہ استادی و شاگردی کو بھی خیرباد کہا تھا یعنی کسی کے شاگرد نہیں تھے اور صحیح معنوں میں "تلمیذ الرحمان" کہے جانے کے مستحق تھے۔ اساتذۂ قدیم مثلاً میر و غالب انیس و آتش وغیرہ کے سرچشموں سے ہوتے اور انھیں بزرگوں کے کلام کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے پیرو تھے۔
چکبست کا مطمح نظر بہت وسیع تھا۔ چنانچہ مثنوی گلزار نسیم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش ہو اور پُر تاثیر ہو...... برخلاف نثر کے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اُس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گزر جائیں" بندش الفاظ پر بہت زور دیتے تھے گویا یہ شعر آتش کا ان کے پیش نظر تھا ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام آتش مُرصّع ساز کا

بندش الفاظ کے ساتھ مناسب ہندی الفاظ بھی موقع موقع سے خوب صرف کرتے تھے اور جدید رنگ کے مضامین اور خیالات کو صاف سادہ اور سلیس طرز میں کہنے پر قدرت رکھتے تھے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں　　عروس شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

چکبست کا مطبوعہ منظوم کلام بہت مختصر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ آخر میں اپنے پیشہ کے کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے شعر کہنے کا وقت بہت کم نکال سکتے تھے۔ اُن کا مجموعۂ نظم انڈین پریس الہ آباد میں چھپ گیا ہے جس پر ادب اُردو کے دلدادہ محسن سر تیج بہادر سپرو نے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی اضافہ کیا ہے۔ اُن کی تنقیدات اور دیگر مضامین بھی اسی پریس سے شائع ہو گئے ہیں چکبست نے خود ایک ماہوار رسالہ "صبح اُمید" کے نام سے ۱۹۱۸ء میں جاری کیا تھا جو

سروینٹ آف انڈیا سوسائٹی کا پرچہ تھا اس میں وہ اکثر لکھتے رہتے تھے مگر اُن کے مضامین زیادہ تر سیاسی رنگ کے ہوتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ مضامین کتابی صورت میں اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔

بحیثیت غزل گو | بحیثیت غزل گو چکبست پُرانے رنگ سے بالکل علیحدہ رہنا چاہتے تھے۔ انھوں نے صنف غزل میں ایک خاص جدت اور ترقی کی اور قدیم طرز سے علیحدہ رہے پُرانے فرسودہ تشبیہات و استعارات اور لوازمات غزل گوئی کو یک قلم خارج کر دیا اور شیرینی اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا اور یہی چیزیں ان کے کلام کے مابہ الامتیاز جوہر ہیں۔ ان کے مجموعہ نظم میں مشکل پچاس غزلیں نکلیں گی اور ان میں بھی اکثر ناتمام معلوم ہوتی ہیں مگر انہیں میں انھوں نے اپنی سحر کاری اور جادو نگاری کا پورا کرشمہ دکھایا ہے۔ کہیں کہیں فلسفہ اور اخلاق اور نصیحت آمیز شعر بھی خوب لکھے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار دار الضرب کے سکہ شاہی ہیں اور بقاء دوام کے مستحق ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خُمار بادہ ہستی اُتر جانا

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

ابھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

دل احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغ ارم میرا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مرجانا

جہاں میں رو کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن میں

دلوں میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

ہمارے اور واعظوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے

طویل نظمیں | اُن کی طویل نظموں میں علاوہ مذکورۂ بالا خوبیوں کے مقامی رنگ اور ہندی الفاظ کا بھی بہت خوش گوار اضافہ ہے جس سے کلام کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے ان نظموں کا ملکی رنگ قدیم ملکی روایات، رسم و رواج کا شمول، نئے نئے تشبیہات و استعارات، اعلیٰ آئڈیل ان کی نظموں کو ادبی جواہر ریزے بنا دیتے ہیں چکبست کی اس قسم کی نظمیں پانچ قسموں پر تقسیم ہو سکتی ہیں (۱) مراثی جو ہندوستان کے مشہور لیڈروں کی وفات پر کہے گئے (۲) قومی و سیاسی نظمیں جو ملک کے اہم سیاسی مضامین پر لکھی گئیں جن سے اعلیٰ تخیل کے ساتھ شاعر کے سیاسی آئڈیل کا بھی پتہ چلتا ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ درحقیقت تمام تعلیم یافتہ نوجوانانِ ہند کی بلند خیالیوں کی حقیقی ترجمان ہیں (۳) سوشیل نظمیں (۴) مذہبی نظمیں (۵) نیچرل نظمیں۔

مراثی | اس صنف میں وہ پُر زور اور درد انگیز نظمیں شامل ہیں جو ملک کے جاں نثار لیڈروں اور آزادی کے علم برداروں کی وفات پر شاعر کے قلم سے نکلیں۔ یہ عموماً مسدس کی شکل میں ہیں اور جوش و تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں بلکہ فی الحقیقت یہ وہ آزادی و حریت کے خیالات ہیں جو کسی علم بردار آزادی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر شاعر کے دل میں موجزن ہوئے اور زبانِ قلم سے آنسو کی طرح ٹپک پڑے۔ چند بند یہاں بطور نمونہ دیے جاتے ہیں، گوپال کرشن گوکھلے کے متعلق ؎

اجل کے دام میں آنا ہی یوں تو عالم کو | مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو | مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سُہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بال گنگا دھر تلک کے متعلق ؎

اُٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث
قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثار ازلی شیر دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

پنڈت بشن نرائن در کی دائمی مفارقت پر

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشک محبت اکثر
جن پہ صدقے ہو زباں اور قلم کے جوہر
دو نگینے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانہ کی خبر

ظاہری حسن لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

قومی نظمیں ان میں بھی سب وہی انداز ہیں اور وہی سچے جذبات جلوہ گر ہیں جو مرثیوں میں نمایاں ہیں وہی شستگی الفاظ وہی اعلیٰ اور اچھوتے خیالات۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے طور حسن ازل عیاں ہے
اللہ ری زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی
(از خاک ہند)

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ادا ہے یہی
غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
(وطن کا راگ)
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

تو نے پودا جو لگایا تھا وہ پھل لایا ہے — آبرو قوم نے پائی ہے وہ دن آیا ہے
ہم نے بھولے ہوئے رشتہ کا نشاں پایا ہے — مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے — پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
(مسز بسنٹ کی نظر بندی پر)
کچھ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے

جب ۱۹۱۴ء میں مہاتما گاندھی ہندوستانی باشندوں کی حالت پر غور کرنے اور اُس کو سدھارنے کے لیے جنوبی افریقہ گئے تو چکبست نے ایک پُرتاثیر نظم "فریاد قوم" کے نام سے لکھی جس میں مہاتما جی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا — ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

۱۹۱۸ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس میں کچھ نفاق و شقاق پیدا ہوا تھا جس سے بعض لیڈر کانگرس سے علحدہ ہو گئے تو اُنھوں نے "نالۂ درد" کے نام سے ایک نظم تیار کی اسی طرح لکھنؤ کے جلاس کانگرس منعقدہ ۱۹۱۶ء میں ایک زوردار نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر اس وقت یاد ہے ؎

برطانیہ کا سایہ سر پہ قبول ہوگا — ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

جنگ عظیم میں شرکت کے لیے جب ہندوستانی سپاہی یہاں سے روانہ ہونے لگے تو وہ اُن سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

ہاں دلبران وطن دھاک بٹھا کر آنا — طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا

قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا ! ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے
دھار تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے

سوشیل نظمیں | سوشیل معاملات کی اصلاح میں بھی مثل سیاسی معاملات کے اُن کا مسلک میانہ روی اور اعتدال پسندی تھا۔ اُن کی نظم "پھول مالا" جو ہندستانی عورتوں کے واسطے ہے عورتوں کو بہت زیادہ آزادی اور تفریح (انگریزیت)، کی خرابیوں سے متنبہ کرتی ہے، کہتے ہیں ؎

روش خام پہ مردوں کے نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم — تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے، مگر یاد رہے — خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رُخ سے پردے کو اٹھایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز
پُوجنے کے لیے مندر جو ہے آزادی کا — اُس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

وہ ازدواج بیوہ کے بھی مؤید تھے اور ۱۹۱۷ء میں ایک نظم "برق اصلاح" کے نام سے اپنی خاص جماعت (کشمیریوں) کے واسطے اسی مبحث پر لکھی تھی۔

مذہبی نظمیں | اس صنف میں انھوں نے بڑا زور قلم دکھایا ہے۔ رامائن کا وہ منظر جہاں سری رامچندرجی بن باس سے پیشتر اپنی ماں سے رخصت ہونے جاتے ہیں نہایت مؤثر اور درد انگیز الفاظ میں دکھایا ہے۔

"کرشن کنھیا" سری کرشن جی کی پیدائش کے متعلق چھوٹی سی ایک نہایت دلکش اور مقدس نظم ہے اور سب سے زیادہ دلچسپ پُرزور اور مؤثر نظم گائے پر ہے جس کے دو بند یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

دیکھیے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار — بے پیے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار

مست کر دیتی ہی شاید تجھے قدرت کی بہار　　وہ اُترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزہ کا نکھار

ایک اک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
پی کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحب دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں　　چشمۂ فیض خدا مرد خدا کہتے ہیں
درد مندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں　　ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہی جس نے ترے دودھ سے منھ پھیرا ہی
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہی

نیچرل نظمیں｜ ان کی تعداد گو کم ہی مگر جس قدر ہیں سب اعلیٰ تخیل اور حُسن بندش سے لبریز ہیں، پُرانی تشبیہیں اور تمثیلیں ان میں مطلق نہیں، "پھُول" "کشمیر" "جلوۂ صبح" "سیر دیرہ دون" اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن میں آخرالذکر لطافت و عمدگی میں سب پر فوقیت رکھتی ہی۔

رباعیات｜ چند رباعیات بھی کہی ہیں حسب ذیل رباعی اپنے حسب حال ہی۔

بیکار تعلی سے ہی نفرت مجھ کو　　لوں داد سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی　　اک دن خود ڈھونڈھے گی شہرت مجھ کو

چکبست کی زبان｜ اُن کی زبان نہایت صاف شستہ اور شیریں ہی۔ الفاظ نہایت مناسب، روزمرّہ اور زور دار استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں لکھنؤ کا رنگ ہی مگر بہترین قسم اور اعلیٰ درجہ کا ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہی کہ مناسب ہندی الفاظ کلام میں ملا کر کلام کی شیرینی اور اثر کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

چکبست بحیثیت نقاد｜ بہ سبب اعلیٰ انگریزی دانی کے چکبست مشرقی اور مغربی دونوں قسم کی تنقیدوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی وجہ سے ان کی رائیں ادبی معاملات میں بہت جچی تلی منصفانہ اور غیر جانب دارانہ تھیں کبھی کسی کی تعریف یا تنقیص آنکھیں بند کر کے یا مبالغہ کے ساتھ نہیں کرتے تھے ذاتی حملوں سے ہمیشہ بچتے اور اشتعال طبع پر بھی اعتدال اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہیں

دیتے تھے۔ بیجا مناظرہ اور تو تو میں میں سے ہمیشہ گریز کرتے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں   وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

ان کے مضامین داغ اور سرشار اور اردو شاعری پر نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں اور بڑی واقفیت اور معلومات کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ مشہور مناظرہ جو معرکہ چکبست و شرر کے نام سے مشہور ہے ان کی اعتدال پسندی متانت اور فنی قابلیت کا شاہد عادل ہے اور اس معاملہ میں ان کی تعریف اکثر مشہور اہل فن و اہل قلم نے کی ہے۔ جو انتخابات غالب و آتش وغیرہ کے کلام کے "عطر سخن" کے نام سے رسالہ صبح امید میں چھپا کرتے تھے وہ اُن کی سخن فہمی اور نکتہ سنجی کا بین ثبوت ہیں۔

چکبست بحیثیت نثار | نثر میں بھی مثل نظم کے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ علاوہ "صبح امید" کے وہ اکثر مؤقر رسالوں میں مثلاً کشمیری درپن، خدنگ نظر، زمانہ وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے ان کی عبارت نہایت متین معنی خیز زوردار اور روشن ہوتی ہے۔ منشی سجاد حسین سابق اڈیٹر اودھ پنچ ہستم ظریف (مرزا اچھو بیگ عاشق لکھنوی) نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، بشن نرائن در، دیا شنکر کول، تربھون ناتھ ہجر وغیرہ پر جو مختصر مضامین انھوں نے لکھے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔

رامائن کے سین سے چند بند بطور نمونہ یہاں پیش کئے جاتے ہیں جن سے چکبست کی قدرت زبان اور چستی بندش کا حال بخوبی معلوم ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہوگا جیسا کہ حالات مصنف میں جو شروع میں کتاب صبح وطن میں دیئے ہوئے ہیں۔ لکھا ہو کہ "وہ انیس کے کلام کے شیدا تھے"

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام   راہ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام   دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

یہ عجیب بات ہے کہ غالب اور انیس کا اثر زمانۂ حال کی شاعری پر اس درجہ چھایا ہوا ہے کہ اس زمانے کے اکثر شعرا جب کسی چیز کو مؤثر اور درد انگیز بنانا چاہتے ہیں تو یہی صنف اختیار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے چکبست کی تقریباً دو ثلث نظمیں جو مجموعۂ صبح وطن میں چھپی ہیں اسی مسدس کی صورت میں ہیں۔ مگر انھوں نے بعض نظموں میں (مثلاً مرقع عبرت جو کسی قومی انجمن کے سالانہ جلسے کے واسطے لکھی گئی تھی) مسدس حالی کے تتبع اور اسی رنگ میں قوم کی حالت، نوجوانوں کی حالت، مذہب، دولت، آزادی و اصلاح وغیرہ کے عنوان سے آٹھ آٹھ دس دس بند کہے ہیں چنانچہ نوجوانوں کی حالت کے متعلق کہتے ہیں ؎

موجود ہے جن بازوؤں میں زور جوانی — طوفاں سے انھیں کشتی قومی ہے بچانی
پڑ ہے مۓ غفلت سے سروں میں یہ گرانی — آرام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی
پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمت مردانہ نہیں ہے

عبرت نہیں دیتا انھیں نیرنگ زمانہ — عمر ان کی فقط لہو و لعب کا ہے فسانہ
تعلیم کہاں اور کہاں صحبت دانا — بس پیش نظر رہتا ہے آئینہ و شانہ
گہ رخ پہ کبھی گیسوئے پریشاں پہ نظر ہے
اک شغل یہی ان کے لیے شام و سحر ہے

ہمت نہیں لیکن دل پر جوش پہ نازاں — بے ہوش و خرد ہیں خرد و ہوش پہ نازاں
بدشکل ہوں پر چشم و لب و گوش پہ نازاں — کم ظرف کوئی اپنے تن و توش پہ نازاں

نیرنگیٔ افلاک کا ڈر ان کو نہیں ہے
فرعون ہیں موسیٰ کی خبر ان کو نہیں ہے

مذہب کے متعلق ؎

سودائے محبت میں نہیں ان کے ہی خامی　　خود بینی سے خالی نہیں مذہب کے ہیں حامی
عرفان کی خبر لاتی ہو جو طبع گرامی　　ہی نفس کے منظور حقیقت میں غلامی
کچھ قوم کی پروا ہے نہ فکر کہ وسہ ہی
ہو جائے نجات اپنی تمنا ہی تو یہ ہی

عالم کے دکھانے کے لیے خاک نشیں ہیں　　دعویٰ ہے کہ ہم مالک فردوس بریں ہیں
دنیا کی ترقی پہ سدا چیں بہ جبیں ہیں　　گویا کہ یہی راز آلہی کے امیں ہیں
جو اور ہیں وہ معرفت حق سے جدا ہیں
بس ایک یہی بندۂ مقبول خدا ہیں

مذمت شراب کے متعلق۔ جو "آب انگور" کے نام سے لکھی گئی۔

رفیق اس کی ہی مستی عدو شعور اس کا　　وداع ہوش کا سامان ہی ظہور اس کا
خمار مرگ جو لائے وہ ہی سرور اس کا　　سیاہ قلب کو کر دے جو ہی وہ نور اس کا
لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

خیال بادہ کشی دل میں گر ہو پیدا ہو　　تمام قلب سیہ صورت سویدا ہو
زباں مزے پہ جو آب طرب کے شیدا ہو　　تو سوزِ آتش پنہاں جگر میں پیدا ہو
زباں کے واسطے گو رشک انگبیں ہی یہ
مگر جگر کے لیے آب آتشیں ہے یہ

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال زمانہ حال کے فلسفی شعرا میں ایک بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں ان کی شہرت حدود ہندوستان سے نکل کر بلاد اسلام افغانستان و ایران بلکہ یورپ و امریکہ تک پہونچی ہے وہ زمانہ موجودہ میں ایک زبردست اور نمایاں ہستی ہیں اور اُن کا نام اور کلام شعرائے حال کی صف اولیں میں بھی سب سے آگے ہے۔ سال ولادت ۱۸۷۵ء اور مقام ولادت سیالکوٹ ملک پنجاب ہے مگر بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے جیساکہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور ۔۔۔ ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر

اس باغ جانفزا کا یہ بُلبل اسیر ہے ۔۔۔ کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے ۔۔۔ ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد

تعلیم | ابتدائے عمر میں ایک مکتب میں پڑھا پھر تھوڑے عرصہ کے بعد جب انگریزی کا شوق ہوا تو سیالکوٹ کے اسکول میں داخل ہوئے جہاں اپنے ساتھ والوں میں بہت ممتاز تھے اور برابر انعام اور اسکالر شپ پاتے رہے۔ میٹریکولیشن کا امتحان پاس کرکے اسکاٹش مشن کالج سیالکوٹ میں نام لکھایا جہاں عربی و فارسی کے مشہور پروفیسر اور علوم مشرقیہ کے باکمال عالم سید میر حسن صاحب کے وزیر تعلیم و نگرانی رہے اور انھیں بزرگ کی بدولت شعر و شاعری و ادبیات کا ذوق اُن میں پیدا ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان اول درجے میں پاس کرکے گورنمنٹ کالج لاہور کے درجہ بی اے میں داخل ہوئے اور فلاسفی منجملہ مضامین مختار کے لی۔ یہیں سے نہایت نیک نامی اور عزت کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری لی جس میں زبان عربی اور انگریزی میں اسپیشل پروفیشنسی (امتیاز خصوصی) حاصل کیا۔ اس کے بعد جب ایم۔ اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔

مسٹر آرنلڈ سے تلمذ لاہور میں علی گڑھ کالج کے مشہور ہر دلعزیز پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے فخر تلمذ حاصل ہوا جس سے اقبال کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ اس کا اثر جانبین پر بہت گہرا اور دیرپا تھا، چنانچہ جب صاحب موصوف انگلستان جانے لگے تو اقبال نے ایک نہایت موثر نظم "نالۂ فراق" (آرنلڈ کی یاد میں) اس موقع پر لکھی تھی۔[1] اب لاہور ہی میں انھوں نے وطن اختیار کر لیا اور بعد فراغت تعلیم پہلے اورنٹیل کالج میں تاریخ و فلسفہ و معاشیات کے پروفیسر پھر گورنمنٹ کالج میں انگلش و فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

قیام انگلستان ستمبر ۱۹۰۸ء میں لغرض تعلیم انگلستان روانہ ہوئے جس کے تمام مصارف کے کفیل اُن کے بھائی تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو کر ڈاکٹر میک ٹیگرٹ کے زیر تعلیم مغربی فلسفہ پڑھنا شروع کیا اور کتب بینی بکثرت کی اور یہیں انگلستان کے مشہور مستشرقین پروفیسر براؤن، نکلسن اور سارلی سے استفادہ کا موقع ملا۔ اتھکس (اخلاقیات) میں ڈگری حاصل کر کے جرمنی گئے اور میونک میں کچھ عرصہ تک قیام کر کے اپنا تھیسس (مضمون) متعلق بہ فلسفہ ایران تیار کیا۔ میونک ہی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ان کو ملی اور مضمون مذکور انگلستان میں میٹافزکس آف پرشیا (فلسفہ ایران) کے نام سے شائع اور ان کے قدیم دوست مسٹر آرنلڈ (جو اب سر ٹامس آرنلڈ ہیں) کے نام سے معنون ہوا۔ جرمنی سے انگلستان واپس آکر

---

[1] یہ مختصر نظم مسدس کی صورت میں ۵ بند کی ہے پہلا بند یہ ہے ؎

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اُس کو سرزمیں
آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمت شب سے ضیائے روز فرقت کم نہیں
تا ز آغوش وداعش داغ حسرت چیدہ است
ہمچو شمع کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است

بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ جب مسٹر آرنلڈ جو لندن یونیورسٹی کے عربی پروفیسر مقرر ہو گئے تھے رخصت پر گئے تو ڈاکٹر اقبال ہی نے کچھ عرصہ تک اُن کی قائم مقامی کی تھی۔ بعد واپسی انگلستان لاہور میں اُن کا پرجوش خیر مقدم ہوا اور یہیں پر اُنھوں نے اپنی پریکٹس شروع کی اور باوقات فرصت شعر و شاعری کے مشغلے میں بھی مصروف رہے۔ اُن کی قابلیت اور شہرت کے سبب سے ایک زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز ان کو یقیناً ملے گا۔ ۱۹۲۲ء میں درجہ نائٹ ہڈ یعنی سر کے معزز لقب سے ممتاز ہوئے۔

اقبال ایک وسیع النظر شاعر ہیں اُنھوں نے فلسفہ مشرق و مغرب دونوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے وہ علاوہ ایران کے فلسفہ کے ہندوستان کے فلسفے سے بھی بخوبی واقف ہیں اور زبان و ادب فارسی میں اُن کا تبحر اُن کے فارسی کلام سے بخوبی ظاہر ہے۔

تصانیف تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) علم الاقتصاد۔ اُردو اقتصادیات پر ایک رسالہ جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس فن میں اُردو میں پہلی تصنیف ہے۔

(۲) فلسفہ ایران۔ اس کا ذکر اوپر ہوا۔

(۳) اسرار خودی۔ مثنوی فارسی جس میں فلسفہ خودی کی بحث ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے مع دیباچہ اور نوٹوں کے شائع کیا ہے اور یورپ و امریکا میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

(۴) رموز بیخودی۔ یہ بھی مثل نمبر ۳ کے فارسی میں فلسفیانہ مثنوی ہے جس کی خاص غرض مسلمانوں میں روح حیات پیدا کرنا ہے۔

(۵) پیام مشرق۔ بجواب جرمن شاعر گیٹے کے "سلام مغرب" کے۔ یہ بھی فارسی میں ہے اور بہت مقبول ہے۔

(۶) بانگ درا۔ مجموعۂ نظم اُردو مطبوعہ ۱۹۲۴ء۔ اسی طرح کا ایک دوسرا مجموعہ "کلیات اقبال" کے

نام سے مولوی محمد عبدالرزاق نے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ حیدرآباد سے شائع کیا ہے اقبال کا فارسی کلام ہماری کتاب کے مبحث سے خارج ہے لہذا اس پر خصوصاً کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی البتہ اُن کے کلام اُردو پر کی جائے گی۔

اقبال کی شاعری اقبال کو شعر کا ذوق ابتدائے عمر ہی سے تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔جب وہ سیالکوٹ اسکول میں پڑھتے تھے تب ہی سے فکر سخن کرنے لگے تھے۔لاہور کے قیام میں اس شوق نے اور بھی ترقی کی اور آخر ایک مشاعرہ میں انھوں نے اپنی ایک غزل پڑھی، جس میں اتفاقاً اردو کے مشاق شاعر اور مشہور زبان داں مرزا ارشد گورگانی بھی تھے،جنھوں نے اس شعر کی خاص طور پر بڑی تعریف کی ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اسی عرصہ میں اقبال کو ارشد سے تلمذ بھی ہو گیا مگر کچھ دنوں بعد وہ داغ کے باقاعدہ شاگرد ہوئے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اُس پہ نہیں نازاں مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں پر

مگر افسوس ہے کہ یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہ رہا۔شروع میں اقبال اپنا کلام صرف مجمع احباب اور مخصوص مشاعروں تک محدود رکھتے تھے۔پبلک میں ان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ اُن کی مؤثر اور دلکش نظم "نالۂ یتیم" انجمن حمایت الاسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس ۱۸۹۹ء کے عظیم الشان اجتماع میں پڑھ کر سنائی گئی اور اُس کے بعد ان کی دوسری نظم "ہمالہ" اسی انجمن کے کسی دوسرے سالانہ جلسے میں دوستوں کے اصرار سے پڑھی گئی جو رسالہ مخزن لاہور کے سب سے پہلے پرچے میں شائع ہوئی تھی اس کے بعد تا روانگی ولایت وہ برابر بہت شوق سے کہتے رہے اور ان کا کلام متعدد اُردو پرچوں، ادبی رسالوں اور کانفرنسوں کے اجلاسوں کی زینت سمجھا جاتا تھا اور نہایت اشتیاق اور عزت کے ہاتھوں سے لیا جاتا تھا اس زمانے میں انھوں نے بہت کچھ کہا اور بہت جلد کہنے کی مشق بہم پہونچائی۔حافظہ ایسا

زبردست پایا تھا کہ اکثر پوری پوری نظمیں بغیر کاغذ دیکھے پڑھ سکتے تھے۔ وہ تقریباً ہر سال اپنی ایک نہ ایک نظم انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں سناتے تھے جس سے اُن کی شہرت دنیائے اردو میں پھیل گئی۔ تصویر درد، فریاد اُمت، ہمارا دیس، نیا شوالہ، ترانہ اور اسی قسم کی دوسری نظمیں اسی موقع پر پڑھی گئیں اور اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے شعر گوئی ترک کر دی تھی یہاں تک کہ اس سے بالکل تائب ہو جانا چاہتے تھے مگر اپنے بعض مخصوص دوستوں مثلاً پروفیسر آرنلڈ اور خان بہادر شیخ عبدالقادر[1] کے اصرار سے اس ارادہ سے باز رہے اور زبان فارسی کو اپنے اظہار خیالات و جذبات کا ذریعہ قرار دیا۔ ہندوستان واپس آ کر فارسی اُردو دونوں میں کہنے لگے مگر اب زیادہ تر

---

[1] شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا سابق مدیر مخزن نے جو فاضلانہ دیباچہ "بانگ درا" پر لکھا ہے اس میں وہ اس خاص موقع کی نسبت یعنی جب اقبال اپنا شوق شاعری ترک کرنا چاہتے تھے مگر شیخ صاحب موصوف اور مسٹر آرنلڈ کے اصرار سے وہ باز رہے اپنے خاص دلکش انداز میں لکھتے ہیں "اس زمانے میں دو بڑے تغیر ان کے خیالات میں آئے اور ان تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے جن میں میرا بھی وہیں قیام تھا اور اکثر ملاقات کے موقعے ملتے رہتے تھے۔ ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اُسے کسی اور مفید کام میں صرف کرینگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیئے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادہ ترک شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ اُن کے لیے بھی مفید ہے اور اُن کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔ ایک تغیر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا اس کا تو یوں خاتمہ ہوا مگر دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہونچا یعنی اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اُردو زبان کی جگہ اپنا ذریعہ اظہار خیال بنا لیا۔"

اُن کا رجحان ملیت (پین اسلامزم) کی طرف ہو شکوہ، جواز شکوہ، اور اسی قسم کی پرجوش نظمیں اس زمانے کی یادگار رہیں۔

اقبال کی شاعری کے تین دور

اقبال کی شاعری کے تین دور صاف طور پر نظر آتے ہیں[1]۔ پہلا دور ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک کا یعنی جب تک کہ وہ ولایت نہیں روانہ ہوئے تھے۔ یہ دور اُن کی تیاری کا زمانہ کہا جا سکتا ہو۔ اس زمانے کے کلام میں جو زیادہ تر غزلوں کی صورت میں ہو اُن کی طباعی کی جھلک اور اُن کی سحر نگاری کی ابتدا نظر آتی ہو مگر بہ سبب ابتدا ر مشق کے الفاظ و بندش میں کسی قدر بھنڈا پن ہو اور موسیقیت و مصوری الفاظ ابھی درجہ کمال کو نہیں پہونچی مگر اس کا وجود ضرور پایا جاتا ہو اور ایک درخشاں مستقبل کا پتہ دیتا ہو۔ اقبال اس دور میں ایک ملّی شاعر نہیں، بلکہ ایک ملکی شاعر نظر آتے ہیں یعنی وہ تمام شاعر ہندوستان اور تمام مختلف المذاہب اور مختلف الخیال ہندوستانیوں کے شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں ہمالہ، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت، نیا شوالہ وغیرہ اسی زمانے کی تصنیف ہیں جنھوں نے اقبال کو تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں عزّت کی جگہ دی اور اُن کی شہرت کو تمام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچا دیا۔

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا اُن کے قیام یورپ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس زمانہ میں ان کی تصانیف کی تعداد بہت ہی کم ہو اور تین چیزیں اس دور کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک یہ کہ اقبال کو اس عرصہ میں فارسی کا بہت شوق ہو گیا اور اسی زبان کو انھوں نے اپنے اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک سخت ملّی شاعر ہو گئے اور تمام اُن خیالات اسی ایک مرکز پر جمع ہو گئے تیسرے یہ کہ اس زمانے کی اُن کی نظمیں گو کہ عمق خیال کے اعتبار سے بڑھ گئیں مگر فلسفیت ان پر غالب آگئی جو اقبال کے فلسفہ مشرق و مغرب پڑھنے کا نتیجہ تھا، ترانۂ ملّی وغیرہ

[1] اقبال کی شاعری کے یہ تین دور غالباً ان کے مطبوعہ کلام اردو (بانگ درا) کے تین حصّوں پر مبنی ہیں۔ ان حصّوں کی تقسیم اس طرح پر ہو۔ حصّہ اول ۱۹۰۵ء تک۔ حصّہ دوم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء۔ حصّہ سوم ۱۹۰۸ء سے۔

اسی انداز میں اسی دور کی نظمیں ہیں۔

تیسرا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ اقبال ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آگئے
اس میں ان کی مشق شاعری درجہ کمال کو پہونچ گئی۔ اس میں ان کا کلام پر زور اور شیریں الفاظ
کا ایک خزانہ ہے مگر یہ الفاظ زیادہ فارسی ہیں۔ ملیت کا عنصر غالب ہے مگر وطنیت کا جذبہ کم ہے
اسی سبب سے وطن کی زبان (اردو) پیش پیش نہیں ہے یعنی اس دور میں اس کو وہ مرتبہ نہیں حاصل
ہے جو دور اول میں تھا اور جس کی وہ اب بھی یقیناً مستحق ہے۔ فارسیت کا غلبہ ان کے فارسی الفاظ
اور فارسی تراکیب اور اساتذۂ عجم کے کلام کی تضمین سے ظاہر ہے۔ تمام عشاق اردو اس دن کے
منتظر ہیں کہ جب اقبال کی شاعری مثل سابق کے ایک وطنی اور خالص اردو شاعری کی حیثیت
سے پھر جلوہ نما ہوگی۔

اقبال کی اردو غزلیں اور نظمیں مثل دیگر شعراء اردو کے اقبال کی شاعری کا آغاز بھی تغزل سے ہوا
جیسا کہ اوپر لکھا گیا پہلے وہ ارشد گورگانی کے پھر داغ کے شاگرد ہوئے۔ داغ کا ذکر انھوں نے
نہایت محبت اور شکر گزاری کے ساتھ اُس مرثیہ میں کیا ہے جو اُن کی وفات پر لکھا تھا نیز اکثر مقطعوں
میں بھی اُن کی طرف اشارہ ہے مگر یہ سلسلۂ تلمذ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ اُن کی ابتدائی غزلوں میں
کوئی غیر معمولی اور خاص بات نہیں پائی جاتی مگر آئندہ ترقیوں کا پتہ ضرور چلتا ہے، کہیں کہیں بندش
بھونڈی مگر تخیل اعلیٰ ہے۔ جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا اُسی قدر کلام میں پختگی کے ساتھ حُسن بندش اور
نشست الفاظ کی خوبصورتی بھی ترقی کرتی گئی اور اسقام کم ہوتے گئے۔ غزلوں کی تعداد گو کہ
صرف ۲۷ ہے مگر متانت کلام بلندی خیال اور فلسفیت میں وہ مرزا غالب کی غزلوں سے ٹکر
کھاتی ہیں اسی وجہ سے اگر اقبال جانشین غالب کے معزز لقب سے یاد کئے جائیں تو کچھ بیجا بات نہیں
ہر چند کہ غالب کی سی نزاکت خیال اور اُن کی مخصوص ترکیبیں اقبال کے یہاں نہ سہی پھر بھی کلام کا
جذبات سے لبریز ہونا اور فلسفہ اور تصوّف کے رنگ میں شرابور ہونا ان کے کلام کو غالب کے
کلام سے بہت قریب پہونچا دیتا ہے۔ بعض جگہ فارسیت کی کثرت اور تصنّع و آورد کے معائب

کلام کی روانی، موسیقیت الفاظ، اثر، بلندی خیال اور ارتفاع نظر کے محاسن سے دور ہوجاتے ہیں
اہل دہلی و لکھنؤ چھوٹی چھوٹی لفظی لغزشوں پر نکتہ چینی کیا کریں پرانے رنگ کے اُستاد عروضی غلطیاں نکالیں
یا کہیں کہ فلاں لفظ غلط یا بے موقع ہے مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اقبال کے ہر ہر شعر پر اُن کی طباعی
اور ذہانت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے جس سے ان کا کلام بہت سی چیزوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

چھوٹی نظمیں | سہل اور صاف عبارت میں مثل حالی اور اسمعیل کی نظموں کے ہیں یہ زیادہ تر ابتدائی زمانے کی
لکھی ہوئی ہیں جبکہ اقبال پر فارسیت کا غلبہ کم تھا اکثر یہ نظمیں بچوں کی درسی کتابوں میں شامل ہیں۔
اور ان سے کوئی نہ کوئی عمدہ اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے۔ بعض نظموں کے نام یہ ہیں ہمدردی، ایک مکڑا
اور مکھی، ایک گائے اور بکری، ایک پہاڑ اور گلہری، بچے کی دعا، ماں کا خواب وغیرہ چونکہ یہ چھوٹے
بچوں کے واسطے لکھی گئیں لہذا اُن کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔

طویل نظمیں | اقبال کی شہرت کا دارومدار اُن طویل نظموں پر ہے جن میں اُن کا خاص رنگ اور تخیل پایا جاتا
ہے۔ انھیں نظموں میں انھوں نے اپنے خاص شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں اور فلسفہ و تصوف اور حب وطن
کے جذبات کے ساتھ بہترین شستہ و رفتہ زبان سلاست بیان، زور تخیل، جذب واثر، اور نئے
نئے استعارے اور تمثیلیں بھی ان میں پائی جاتی ہیں۔ "ہمالہ" "خضر راہ" "شمع و شاعر" "شکوہ"
"جواب شکوہ" اسی صنف سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو رسمی اور معمولی نظمیں نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ سچے
جذبات کا صاف و شفاف آئینہ اور طرز بیان اور بلندی خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔

"ہمالہ" میں موضوع کی بلندی کے ساتھ مضمون کی بلندی بھی داد طلب ہے۔ ہمالیہ ہندوستان کا
اصلی محافظ ہے۔ شاعر کو چونکہ اپنے وطن ہندوستان سے عشق ہے لہذا وہ اس کے محافظ کا بھی عاشق ہے
"والدہ مرحومہ کی یاد" میں اقبال نے جو مؤثر نظم لکھی ہے وہ سچے جذبات سے مملو ہے۔ "خضر راہ"
شاعر کے ملی جذبات کا نتیجہ ہے اس میں وہ جدید مغربی ترقیوں کو اپنے اہل وطن کے واسطے تنگ
دلے اعتباری کی نظر سے دیکھتا ہے۔ "شکوہ" میں ایک نہایت لطیف اور شاعرانہ پیرایہ میں اُن
تمام مصائب اور پستیوں کا ذکر ہے جو بدنصیبی سے اس زمانے کے مسلمانوں کے حصہ میں

آ گئی ہیں۔ "جواب شکوہ" میں نے انھیں سب باتوں کا معقول جواب دیا ہے اور ان کے اسباب بتائے ہیں۔ "ترقی اسلام" میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے۔ "شمع و پروانہ" نہایت اعلیٰ درجہ کی ایک خیالی نظم ہے۔

دیگر نظمیں | اقبال کی وہ چیز جس نے ان کا تخم محبت تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں بو دیا۔ ان کا جذبہ حب وطن ہے جس کا اظہار نہایت جوش اور سچائی کے ساتھ انھوں نے اپنی بعض نظموں میں کیا ہے جو فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتیں ایسی نظمیں جو کسی خاص مقصد یا غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ اتنی جاذب اور موثر ثابت نہیں ہوتیں جتنی کہ خیالی اور بے غرض نظمیں ہوا کرتی ہیں۔ جگنو، چاند، حسن و عشق وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن کو ہر شخص دل سے پسند کرتا ہے۔ "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہندوستان کا مقبول ترین گیت ہے۔ "دنیا شوالہ" ہندو مسلم اتحاد کی ایک بیش بہا نظم ہے، علی ہذا جو مختصر نظمیں داغ، غالب، سوامی رام تیرتھ، شبلی و حالی، شیکسپیر، عرفی، نانک وغیرہ پر ہیں۔ نیز وہ جو مناظر قدرت پر لکھی ہیں نہایت اعلیٰ درجے کی نظمیں ہیں۔

اقبال بحیثیت ایک ہندوستانی شاعر کے | اقبال نے شاعری کی دنیا میں ایک ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے قدم رکھا اور ان کی شاعری نے نوجوان ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیا۔ اس زمانے کی ان کی شاعری کا عنصر غالب وطن کی محبت ہے اور اسی وجہ سے ان کی پہلی نظم "ہمالہ" میں یہ عنصر تمام جذبات پر غالب ہے۔ "صدائے درد" میں یہ خیال اور بھی تقویت پکڑ گیا ہے اور اس میں وطن کے تمام مصائب اور خرابیوں کے اسباب کا ذکر نہایت پرجوش طریقے سے کیا گیا ہے۔ "سید کی لوح تربت" میں بھی جذبہ وطنی جلوہ نما ہے اور اس میں مذہبی تعصب اور فرقہ بندی کی سخت مذمت کی گئی ہے "تصویر درد" کو ہندوستان کا نہایت پر اثر اور پرجوش مرثیہ کہنا بجا ہے۔ "ہندی ترانہ" اور قومی گیت سے مادر ہند کی محبت ہمارے دلوں میں موجزن ہو جاتی ہے۔ "ترانۂ ہندی" کو بنگال کا بندے ماترم سمجھنا چاہیئے جس سے بڑھ کر ہندوستان میں شاید کوئی دوسرا قومی گیت مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں نہ ہوگا یہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مروج اور ہر شخص کی زبان پر ہے

اس جذبۂ وطنیت کا منتہائے عروج اُن کے "نیا شوالہ" میں پہونچ گیا جس میں وہ خاک وطن کے ذرہ ذرہ کو ایک دیوتا سمجھتے ہیں چونکہ یہ مختصر مگر نہایت ہی مؤثر اور جذبۂ وطنیت میں ڈوبی ہوئی نظم ہے لہذا پوری یہاں دی جاتی ہے ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا　　جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا　　واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں　　بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی　　آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ　　داماں آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے　　سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مگر یہ اُن کا جذبۂ وطنیت روانگی انگلستان کے ساتھ مدھم پڑ گیا یہاں تک کہ اُن نظموں میں جو قیام انگلستان کے زمانے میں لکھی گئیں یہ جذبہ قریب قریب معدوم ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہم کو پوری امید ہے کہ اقبال اُردو کی طرف پھر رجوع کریں گے اور ہندوستان کے قومی شاعر کا معزز لقب اُن کو پھر حاصل ہوگا۔

اقبال بحیثیت پین اسلامسٹ کے	یہ پین اسلامزم و اخوت ملی کا رنگ اقبال میں قیام یورپ کے

زمانے میں پیدا ہوا تھا جبکہ اُن کی آمد و رفت لندن کی پین اسلامک سوسائٹی کے جلسوں میں بکثرت تھی اور اس سوسائٹی کا نام بھی انہیں کے ایما سے بدل کر صرف اسلامک سوسائٹی رکھا گیا تھا

جس کے واسطے اُن کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ اسلام میں عنصر اجتماعیت پہلے سے موجود ہی لہذا لفظ "ہین" جو اجتماعیت کے معنی دیتا ہی زائد ہی اور اس کو نام سے خارج کر دینا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے اُن کے میلان طبع کا پتہ چلتا ہی۔ انھوں نے یہ خیال لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنا چاہا کہ تمام روئے زمین کے مسلمان ایک عالمگیر سوسائٹی کے رکن ہیں عام اس سے کہ وہ اس بات سے واقف ہوں یا نہ ہوں زمانۂ حال کے سیاسی معاملات نے اُن کا یہ خیال پوری طرح ثابت کر دیا۔ ڈاکٹر لطیف لکھتے ہیں :-

"نئی صدی کے آغاز سے مسلمانوں کے سیاسی نقطۂ نظر میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوا۔ اُن کا سیاسی تحفظ اور آزادی کی جد و جہد صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ رہی بلکہ جہاں جہاں اسلام کے نام لیوا تھے یعنی ٹرکی، ایران، ترکستان، مصر، طرابلس، مراکش، یہاں تک کہ دور دراز ملک چین بھی اُن کے دائرۂ عمل میں شامل ہو گیا۔ یہ عالمگیر اتحاد اسلامی کی کوشش جس کا دوسرا نام پین اسلامزم تھا سلطنت ٹرکی کے مٹ جانے سے اور زور پکڑ گئی۔ اس کی ابتدا ۱۹۱۱ء کے اطالوی حملۂ طرابلس سے ہوئی تھی جس کے بعد جنگ بلقان میں اس کی شرر افشانی اور بڑھی مگر جنگ عظیم میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے متعلق بے شمار پمفلٹ، رسالے اخباری مضامین، نظمیں، اپیلیں ہر قسم اور ہر حالت کے لوگوں کی زبان و قلم سے نکلیں جن میں اقبال، شبلی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور علی برادران بہت ممتاز ہیں۔۔۔ اس احساس کا ظہور تین مختلف طریقوں سے ہوتا تھا (۱) رنج و الم کسی اسلامی قوم یا ملک کے سلب آزادی پر عام اس سے کہ یہ گزشتہ زمانہ کا واقعہ ہو یا زمانہ موجودہ کا (۲) ایسے اسلامی ممالک کے مستقبل کی فکر جو دول یورپ کے زیر اثر ہیں (۳) شک اور بے اعتباری یورپین اقوام کے ساتھ جو بقول اُن لوگوں کے ہر مقام پر زوال اسلامی کی ذمہ دار ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کچھ عرصہ تک اس پین اسلامی اخوت کے خاص علمبردار سمجھے جاتے تھے اور انھوں نے اس سلسلے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اس زمانے کی نظموں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ کیا تھا۔

اقبال تمام دنیا کے مسلمانوں سے ملتجی ہیں کہ اگر تم کو اپنی ہستی قائم رکھنی ہی تو جزئی جزئی مذہبی اختلافات ترک کر دو اور ایک عالمگیر اتحاد و اخوت پیدا کرو۔ اُن کو بخوبی معلوم ہی کہ دنیائے اسلام چونکہ موجودہ زمانے میں منتشر اور تشتت ہی لہذا وہ مغرب کے باقاعدہ حملوں سے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے گی اور بہت جلد اُن کا شکار بن جائے گی ؎

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ! ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہی گاز

ان کی دلی خواہش ہی کہ اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ محبت و یک جہتی کی مضبوط رسی سے بندھ جائے اور مسلمان اپنے مذہب کے ضروری احکام و ارکان کے دل سے پابند ہو جائیں۔ مسلمانوں کو یہ خیال ترک کر دینا چاہیے کہ ہم ہندی ہیں یا ترک، مصری ہیں یا افغانی۔ اُن کے اپنے تئیں ایک عظیم الشان زنجیر کی کڑیاں سمجھنا چاہیے۔ قوم و ملک، قرب و بعد کے فرضی خیالات دل سے یک قلم نکال دینا چاہیے اور اپنے تئیں ایک برادری کے افراد سمجھنا چاہیے ؎

یہی مقصود فطرت ہی یہی رمز مسلمانی اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اُن کا قول ہے ؎

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو جو مشکل ہی تو اس مشکل کو مشکل کرکے چھوڑوں گا

جب اقبال یورپ جا رہے تھے تو راستے میں جہاز سے جزیرہ سسلی نظر پڑا جو ایک زمانہ میں عربوں کے اقتدار اور تہذیب و شان و شوکت کا مرکز تھا اس کو دیکھ کر عجب پُر اثر طریقے سے فریاد کرتے ہیں ؎

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونبابہ بار وہ نظر آتا ہی، تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورش قُم سے ہوا　آدمی آزاد زنجیر توہّم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے　کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یہ اسی پیام کی برکت ہے کہ اقبال کی شہرت ممالک اسلامی کے علاوہ یورپ امریکہ میں بھی پھیل گئی ہے۔

اقبال کا فلسفہ اقبال محض خوش گو شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں۔ ان کا کلام فلسفیانہ حقائق سے معمور ہے۔ اُن کا فلسفہ مختصراً دو جملوں کا ترجمان ہے (۱) اپنی ہستی پہچان (۲) اپنی ہستی ثابت کر۔ اسی ہستی سے باخبر ہونے میں قوموں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ اہل مشرق کے دلوں سے وہم و گمان جو ان کے کیرکٹر کا عنصر غالب ہے نکل جانا چاہیے اور اس کی جگہ یقین اور اعتبار کو ملنا چاہیے ؎

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے　یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اقبال مغربی مادیت کے دشمن ہیں اہل مغرب کو مخاطب کرکے کہتے ہیں ؎

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

"طلوع اسلام" میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی　یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اُن کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جن میں انسان کو خوشدلی اور خودداری کی تلقین کی گئی اور اس کو اُس کی اصلی عظمت و شان یاد دلائی گئی ہے ؎

تو راز کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا　خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو　اُخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی　تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا

اس قسم کے اشعار بکثرت ہیں لہٰذا اُن کے بحر سخن میں غوطہ مارنا اور فلسفہ کے تمام دُرِ شاہوار باہر

نکالنا اس مختصر مضمون کے مقصد سے باہر ہے۔

بعض یورپی نقادوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مضامین کے لیے بعض مغربی فلسفیوں مثلاً نیتشے اور برگساں وغیرہ کے ممنون احسان ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں مگر اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اکابر مذکور کے فلسفہ کا اثر بہت گہرا ہے۔

اقبال کا پیغام کیا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اقبال کی دلی خواہش ہے کہ ان کے برادران دینی اپنی ہستی سے واقف ہونے اور اپنے تئیں پہچاننے کا مادہ پیدا ہو جائے اور کوشش و عمل کی شدید ضرورت کا احساس ان کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ اقبال کے نزدیک عملی جدوجہد زندگی اور سستی اور بیکاری موت ہے۔ اُن کا پیغام نہایت اعلیٰ سچا اور پرجوش ہے۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو ببانگ دہل سنانا چاہتے ہیں کہ غفلت و سستی ترک کرو۔ اُن کی غرض کوئی ملکی توسیع یا سیاسی ترقی نہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سادگی، بے ریائی، شجاعت، ہمت و استقلال اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی قوت غرض کہ وہ جملہ خصائل و فضائل جو کسی زمانے میں اُن کے اسلاف میں پائے جاتے تھے ان میں بھی پیدا ہو جائیں۔ اس پر معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تو پرانے افسانوں کو یاد کرنا اور ترقی کی گھڑی کی سوئیاں اُلٹی گھمانا ہوا مگر درحقیقت یہ اعتراض سطحی اور غیر واجبی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقبال زمانہ موجودہ کی تصویر تاریک رنگوں میں اور زمانہ گزشتہ کا مرقع نہایت چمکتے ہوئے رنگوں میں کھینچتے ہیں محض اس غرض سے کہ مسلمان اُس سے ایک مفید سبق حاصل کریں اپنی غفلت شعاری چھوڑیں اور سعی و کوشش سیکھیں مختصر یہ کہ اقبال کا پیغام عمل و کوشش کا پیغام ہے ؎

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے　　جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اقبال کے کلام میں امید و مسرت اقبال محزون و مایوس شاعر نہیں اُن کے کلام میں امید و مسرت جلوہ گر ہے بلکہ یہی چیز اُن کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس تاریک فضا سے کبھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ مصائب اور ناکامیاں انسان کے کیرکٹر کو پختہ اور مضبوط کرتی ہیں جس طرح سونا گھریا کی تیز آنچ سے پاک و صاف ہو کر چمک جاتا ہے اسی طرح

قومیں بھی ناکامیوں اور نامرادیوں کی کسوٹی پر چڑھ کر قوت پکڑتی ہیں۔ وہ تاریک اور مصائب گرفتہ مشرق کے لیے ایک درخشاں مستقبل دیکھتے ہیں اور کبھی افسردہ دل نہیں ہوتے بلکہ ناکامیوں کے بادل کے پیچھے شعاع امید جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

اقبال عملی شاعر ہیں | باوجود خیالی شاعر ہونے کے اقبال بہت بڑے عملی شاعر بھی ہیں۔ وہ اشیاء کا عملی پہلو کبھی نظر انداز نہیں کرتے گو اُن کے خیالات فلک پیما ہیں مگر وہ خود مادر زمین کے ساکن ہیں۔ اُن کے انسانی کمزوریوں کا بخوبی احساس ہے۔ ان کی دنیا عملی دنیا ہے جس میں خوشی و غم اور امید و یاس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ کبھی اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔

اقبال کی نیچرل نظمیں | اس صنف میں بھی اقبال کا کلام لاجواب ہے اور اُن کی وہ نظمیں جو نیچرل چیزوں اور قدرتی مناظر پر ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتیں۔ مثلاً، جگنو، چاند، صبح کا ستارہ ایک پرندہ اور جگنو، ابر وغیرہ۔ اعلیٰ تخیل، صحت بیان اور شیرینی زبان کے واسطے یہ نظمیں لاجواب ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کے یہاں جو سادگی طفلانہ مسرت اور اصلیت کا جوش و خروش پایا جاتا ہے وہ ان کے یہاں نہیں مگر یہ چیز تو کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی پس اقبال کے یہاں جس قدر بھی ہے بہت غنیمت ہے اور اوروں سے بہت زیادہ ہے۔ شعرائے مشرق کے یہاں مناظر قدرت کا بیان اظہار جذبات کے لیے وہی کام دیتا ہے جو تصویر کے واسطے اس کا بیک گراؤنڈ یعنی بالذات اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی صرف تصویر کو ابھانے کے کام آتا ہے۔ ہمارے شاعروں کا اصلی مقصد کسی جذبہ یا تخیل کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کسی منظر کو بطور تمثیل یا تشبیہ کے ضمناً پیش کر دیتے ہیں برخلاف اس کے شعرائے مغرب کے کہ وہ حسین مناظر کے بیان میں جو اُن کے پیش نظر ہوتے ہیں محو ہو جاتے ہیں اور انھیں کا من و عن بیان اور انھیں سے لطف اندوزی ان کی مقصود بالذات ہوتی ہے۔ اقبال بمقابلہ دوسرے شعرائے اُردو کے اس معاملہ میں شعرائے مغرب سے بہت قریب تر ہیں اور انھوں نے پرانے فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نیا رستہ اختیار کیا ہے۔

اقبال کی خصوصیات شاعری (۱) پہلی خصوصیت دہی پان اسلامزم ہے جس کا ذکر اوپر ہوا (۲) اسلام کی قرون اولی کی سادگی پر جو بُرا اثر عجمی تکلف و تصنع کی تہذیب نے ڈالا تھا اس کے وہ بہت شاکی ہیں اور اسی کو وہ اسلام کے انحطاط و زوال کا اصلی سبب ٹھہراتے ہیں (۳) اُن کا پیغام نہایت سچا اور پرجوش ہے مگر چونکہ بعض باتیں بمصلحت وہ علانیہ طور پر کہنا نہیں چاہتے لہذا انہیں تشبیہ کے پردے میں اُن کو کہنا پڑتا ہے (۴) وہ حقیقی شاعر ہیں کیونکہ نہ تو وہ کسی کی فرمائش سے کہتے ہیں نہ کسی کی بے جا اور خوشامدانہ تعریف میں کہتے ہیں (۵) ان میں ایجاز و اختصار کی صفت ہے یعنی چھوٹے چھوٹے لفظوں میں معنی کے دریا بھرے ہوئے ہیں مثل غالب کے اُن پر بھی یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ ان کے الفاظ کی کیمیائی تحلیل کرلو اُس کے بعد معنی کا خالص سونا ہاتھ آئے گا (۶) اُن کے مضمون اکثر فارسی الفاظ و محاورات کے تہ میں ہوتے ہیں مگر کبھی راز سربستہ نہیں ہوتے غور کرنے سے بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں (۷) وہ بالکل زمانۂ حال کے شاعر ہیں۔ ہر طرح کے حقائق سائنٹیفک، فلسفیانہ مذہبی سب ان کے کلام میں موجود ہیں جس طرح تصوف و اخلاق کے بیش بہا مضامین بہترین اور حسین ترین الفاظ میں اُن کے کلام میں جلوہ گر ہیں اسی طرح علوم مغربی مثلاً کیمیا و طبعیات وغیرہ کے رموز بھی لطیف تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں پائے جاتے ہیں (۸) ان کی بعض تشبیہیں نہایت لطیف و نادر ہیں مثلاً "ہلال عید" "روشنی کا حباب ہے" جگنو کی نسبت کہتے ہیں ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں	یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ	یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا	غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا	ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

(۹) ان کے کلام کا خاص طرۂ امتیاز جوش سچائی اور رقت ہے۔ اُن کی نظموں میں وہی زور ہے جو بہتے ہوئے دھاروں میں ہوتا ہے یہ زور وہ قوت اور اردو شعرا کے یہاں بہت کم ہے۔

اقبال کی شہرت ہمارے خیال میں کسی اُردو شاعر کو یہ شہرت اور ہر دلعزیزی نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کو

ہوئی۔ اُن کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دُور دُور ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں وہ ایک قومی شاعر مانے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شعرا اور اہل قلم مثلاً شبلی نعمانی، اکبر، خواجہ حسن نظامی، سر ذو الفقار علی خاں وغیرہ نے اُن کو باج تحسین دیا ہے۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے ان کی کتاب "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ یورپ و امریکہ کے مشہور ناقدوں نے ان کی تصانیف پر نہایت عمدہ عمدہ ریویو لکھے۔ ہندوستان میں وہ ترجمان حقیقت کے لقب سے مشہور ہیں اسی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں "سر" کا معزز خطاب ان کو دیا گیا۔ نوبل پرائز کے مستحقین میں ایک زمانے میں اُن کا نام بھی لیا جاتا تھا۔

وہ نوجوانانِ ہند کے بہترین شاعر ہیں کیونکہ انھیں کے جذبات و احساسات کو وہ عمدہ طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ اپنی بیش بہا نظموں کی بدولت پورے ہندوستان کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور ملک کا ہر طبقہ اُن کو مادر وطن کا حقیقی شاعر مانتا تھا مگر کچھ عرصہ سے وہ اُن لوگوں میں اس قدر ہر دلعزیزی نہیں رہی جو جذبات وطن کو دیگر جذبات پر مقدم سمجھتے ہیں اور ان کی کمی شہرت کا باعث یہ بھی ہوا کہ وہ اُردو کو زبان فارسی کے ماتحت کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے اقبال کا مرتبہ زمانۂ حال کے دیگر اُردو شعرا میں بہت بلند ہے بلکہ وہ تو دنیا کے بڑے بڑے شعرا کے ہم پلہ ہیں۔

انڈکس حصۂ نثر

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں۔

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں۔

نمبروں سے صفحات مراد ہیں